دشتِ امکاں

سفرنامہ نجد و حجاز

ڈاکٹر نگار

سفرنامہ۔ نجد و حجاز

مؤلف : ڈاکٹر نگار

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

معاونینِ خصوصی: مولانا حبیب اللہ اختر، مولانا شیر الرحمٰن (الندوہ ٹرسٹ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی
والسیف والرمح و القرطاس والقلم
(المتنبی)

(اور گھوڑے اور رات اور صحرا مجھے جانتے ہیں
اور تلوار اور نیزہ اور کاغذ و قلم)

دشتِ امکان

(سفرنامۂ نجد وحجاز)

نگار سجاد ظہیر

قرطاس

قرطاس

سلسلۂ مطبوعات۔۲۴

بار اوّل : اکتوبر ۱۹۹۶ء

بار دوم : فروری ۲۰۰۳ء

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپوزنگ: اطہر ہاشمی

زیر اہتمام:
قرطاس
پوسٹ بکس نمبر 8453
کراچی یونیورسٹی: کراچی-75270
فون/فیکس: 9243966
موبائل: 0300-9245853

ISBN: 969 - 8448 - 38 - 1

انتساب

....

ثناء ظہیر

سعود ظہیر

سعدیہ ظہیر

کے نام
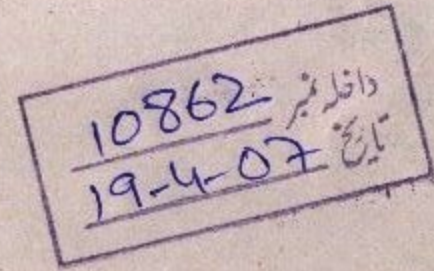
جب اندھیروں کے سبب کچھ بھی نہیں تھا روشن
دشتِ امکاں میں ہوئی مشعل کعبہ روشن

عاصی کرنالی

ترتیب

حدیث دل

سفرنامے اب اردو ادب کی باقاعدہ ایک صنف کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اس ضمن میں اردو ادب کا دامن آہستہ آہستہ رنگا رنگ سفرناموں سے بھرتا جا رہا ہے۔ ان سفرناموں میں شائد اب تک پوری دنیا کا احاطہ کیا جا چکا ہے بعض اہم سفرنامے عمرہ اور حج کے حوالے سے بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

میں نے رمضان/ مارچ ۱۹۹۲ء میں ایک عمرہ، اس کے بعد ذی الحجہ/ جون ۱۹۹۲ء میں حج، پھر اس کے بعد نومبر ۱۹۹۲ء، اور رمضان/ مارچ ۱۹۹۳ء میں دو مزید عمروں کی سعادت حاصل کی۔ ایک فرض عبادت کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ سفرہائے حج و عمرہ میرے لئے ایک بہت وقیع علمی سرمائے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ تاریخ اسلام کی طالبہ ہونے کے ناتے، ان چاروں سفر کے دوران میں نے جتنا کچھ جانا وہ اس موضوع پر متعدد کتب پڑھنے سے بڑھ کر ثابت ہوا۔

حجاز و نجد کی سرزمین کے چپے چپے پر ہماری تاریخ کا دور اول بکھرا پڑا ہے، ایک ایک اینٹ پر تاریخ کھدی ہوئی ہے۔ تاریخ کا طالب علم ایک ایک لمحے سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور ایک ایک اثر سے علمی خزانے سمیٹتا ہے، سو میں نے بھی جو کچھ جانا اسے آپ کی طرف منتقل کرنا چاہتی ہوں۔ میرے بہت سے قارئین ان تاریخی مقامات کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوں گے۔ لیکن جو واقفیت نہیں رکھتے ان کے لئے امید ہے یہ کتاب فائدہ مند ثابت ہوگی۔

حج و عمرے کے حوالے سے عموماً دو طرح کے سفرنامے سامنے آئے ہیں ایک کیفیاتی و تاثراتی طرز کے سفرنامے مثلاً ممتاز مفتی کا سفرنامہ 'لبیک'، شورش کاشمیری کا سفرنامہ 'شب جائے کہ من بودم' اور عاصی کرنالی کا سفرنامہ 'اپنی منزل کی طرف' وغیرہ' دوسری طرز کے سفرنامے وہ ہیں جو معلوماتی اور علمی نوعیت کے ہیں مثلاً محمد عاصم صاحب کا سفرنامہ 'سفرنامہ ارض القرآن'، ڈاکٹر ایچ۔ بی خان صاحب کا سفرنامہ 'کراچی سے گنبد خضرا تک' وغیرہ، ان سفرناموں میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، میری کوشش رہی

ہے کہ 'دشت امکاں' کے حوالے سے اس میں اضافہ کیا جا سکے۔ محمد عاصم صاحب کا سفرنامہ 'سفرنامہ ارض القرآن' تاریخی حوالے سے ایک مستند دستاویز ہے تاہم اس میں ۱۹۵۹ء تک کی معلومات موجود ہیں، اس کو میں نے ۱۹۹۲ء تک بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

تاریخی واقعات کے سلسلے میں میرا بنیادی ماخذ قرآن کریم رہا ہے جہاں مزید تفصیلات کی ضرورت محسوس کی گئی وہاں تاریخ کی مستند کتابوں کا سہارا لیا گیا ہے، مثلاً تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، طبقات ابن سعد، تاریخ مدینہ منورہ از محمد عبدالمعبود اور تاریخ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی کے علاوہ دائرہ معارف اسلامیہ کی متعلقہ جلدیں۔ اس ضمن میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ واقعاتی اعتبار سے کوئی غیر مستند بات کتاب میں بیان نہ کی جائے میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں، اس کا فیصلہ بہر حال صاحب علم قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

یہ کتاب میں نے اپنے تینوں بچوں کے نام منسوب کی ہے اس انتساب کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے یہ تینوں بچے، چار میں سے تین سفرہائے حج وعمرہ میں ہمارے ساتھ رہے اور اس دوران "تاریخی" سعادتمندی اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا ان کی طوفانی شرارتیں، ہنگامی دھما چوکڑی اور سیلابی تخریب کاریاں خدا جانے کہاں جا سوئی تھیں۔ تنگ کرنا تو رہا ایک طرف ان کا قابل ذکر تعاون ایسا شامل حال رہا کہ بے اختیار ان بچوں کے لئے دعائیں نکلیں، میرا خیال ہے، سفر کرنا، اس سے لطف اٹھانا اور سیکھنا صرف ہم دونوں کی نہیں بلکہ ہم پانچوں کی قدر مشترک ہے۔

میرا یہ سفرنامہ، لاہور کے ماہنامہ 'تبول' جس کی مدیرہ محترمہ سلمیٰ یاسمین نجمی صاحبہ ہیں، میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب تصاویر، نقشوں اور دیگر معلوماتی جدول کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جناب رشید عالم صدیقی صاحب (اب کینیڈا چلے گئے ہیں) ریاض (سعودی عرب) میں ان کے دم سے شعری محفلیں رونق حاصل کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے محمد عاصم صاحب کا 'سفرنامہ ارض القرآن' عنایت کیا، بلکہ مجھے یہ کتاب بخش دی جو کہ اب آؤٹ آف پرنٹ ہونے کی وجہ سے عام طور پر دستیاب نہیں ہے۔ اس کتاب نے میری بڑی راہنمائی کی، لہذا میں صدیقی صاحب کے تعاون پر ان کی شکر گذار ہوں۔

میری علمی و ادبی کاوشوں میں سجاد جس طرح دامے درمے، قدمے، سخنے مجھ سے تعاون کرتے ہیں میں اس کی معترف بھی ہوں اور شکر گذار بھی۔ چاروں سفرہائے حج وعمرہ کے دوران آثار کی زیارتیں کروانے کا بندوبست سجاد ہی نے کیا، سچ پوچھئے تو میری ساری سیاحت انہی کے دم قدم سے رہی، تاہم ابھی بہت سے تاریخی مقامات مثلاً خیبر، تبوک، مدائن صالح، مصر، عراق، شام، فلسطین، اردن، ترکی، ایران، اسپین، غرضکہ ایک دنیا پڑی ہے جہاں ہماری تاریخ کے آثار محفوظ ہیں تاہم یہ تسلی ضرور ہے کہ سب سے مقدس سرزمین تک بہر حال ہمارے گنہ گار قدم پہنچ ہی گئے :

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

۵ جون ۱۹۹۶ء

کراچی

حدیثِ دیگر

میرا سفرنامہ نجد حجاز ''دشت امکان'' اواخر ۹۶ء میں شائع ہوا اور اواخر ۹۹ء میں ختم ہو گیا اس کے بعد سے کتاب کا مستقل تقاضا رہا۔ چونکہ اس دوران ۹۷ء میں ہی ہم عمرہ پر گئے اور چند نئے مقامات مثلاً بدر، سقیفۂ بنوساعدہ، خیبر اور مدائن صالح وغیرہ دیکھے لہٰذا خیال کیا کہ ان پر بھی کچھ لکھ لیا جائے تو دوسرے ایڈیشن میں شامل کر کے کتاب شائع کی جائے۔ گوناگوں مصروفیات آڑے آتی رہیں تا آنکہ ہم نے ۲۰۰۰ء میں ایک اور سفر عمرہ کیا اور چند نئی جگہوں پر پہنچے مثلاً مرالظہران یعنی حدیبیہ، تیما اور تبوک وغیرہ۔ لہٰذا ان سب پر لکھتے لکھتے خاصا وقت گزر گیا۔ بہرحال قصہ مختصر یہ کہ ''دشت امکان'' کا دوسرا ایڈیشن دو اضافوں کے ساتھ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سابقہ ایڈیشن کے متن میں بھی مناسب ردوبدل کیا گیا ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب آپ کے اور ''دشت امکان'' کے درمیان مزید حائل ہونے کا میرے پاس کوئی بہانہ نہیں۔ سو اب آپ سفر شروع کیجئے! اللہ حافظ

نگار

۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء

(۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ)

ریاض

یہ ۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ء کی صبح کا ذکر ہے جب میں سعودی ایئرلائن کے طیارے سے، اپنے تینوں بچوں ثنا، سعود اور سعدیہ کے ساتھ، سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کی طرف محوِ سفر تھی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی رِیاض یا سعودی عرب کے کسی بھی شہر کا سفر نہیں کیا تھا، لیکن تاریخ، خصوصاً اسلامی تاریخ کی طالبہ ہونے کے ناتے، جزیرہ نمائے عرب اور اس کے مختلف علاقے خصوصاً حجاز و نجد سے گہری وابستگی رہی تھی، اور اسے میں اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھ رہی تھی کہ میں ان علاقوں کو، ان پہاڑوں کو، ان موسمی ندی نالوں کو اور ان بے آب و گیاہ صحراؤں کو بچشم خود دیکھ سکوں گی جن کو رسول اللہؐ سے اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے نسبت رہی ہے۔

فی الوقت میری منزل ریاض تھی، جہاں سجاد بوجہ ملازمت گذشتہ پانچ ماہ سے مقیم تھے اور اب ہمیں بلوالیا تھا۔ ریاض اب سعودی عرب کا دارالحکومت ہے اور نجد کے جس علاقے میں واقع ہے اسے عارض کہا جاتا ہے جو قبیلہ بنوتمیم کا قدیم مسکن رہا ہے۔ نجد وسط عرب میں ایک سرسبز و شاداب اور بلند و فراز صوبہ ہے سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار دو سو میٹر بلند ہے اور تین طرف سے بے آب و گیاہ صحراؤں سے گھرا ہوا ہے۔ نجد کے حوالے سے مجھے تاریخ کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں مثلاً یہی کہ چونکہ نجد کے تینوں اطراف میں وسیع صحرا پھیلے ہوئے تھے لہٰذا قدیم زمانے میں عموماً یہاں سیاح نہیں پہنچ پاتے تھے۔ یورپی سیاحوں نے عموماً انیسویں صدی کے اوائل میں نجد کا سفر کیا اور سفرنامے لکھے جب کہ یہاں محمد علی پاشا نجد کے وہابیوں کے ساتھ سرگرم پیکار تھا۔

نجد کے حوالے سے مہلہل کا نام ذہن میں ابھرتا ہے، جو عربی شاعری کا آدم کہلاتا ہے، اسی نجد کی خاک سے پیدا ہوا تھا۔ امراء القیس جو عرب کا ملک الشعراء تھا، اسی نجد کی حکومت کندہ کا شہزادہ تھا

جس کا قصیدہ لامیہ، مشہور سبع معلقات کا پہلا معلقہ تھا،

رکو! کہ رولیں

بیادِ جاناں

وہ گھر (عنیزہ(۱) کا) یاد کر کے

جو ریت کے اس بسیط ٹیلے پہ (اس جگہ) تھا

دخول وحومل (۲) کے درمیان تھا

وہ جس کے اطراف میں تھے

مقرات اور توضح (۳)

(اُجڑ چکا ہے)

نشانِ خاکستر (پس کارواں کو) لیکن

مٹا سکا ہے

نہ لمسِ بادِ جنوب اب تک

نہ رقصِ بادِ شمال اب تک (۴)

پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں الحارث نے نجد میں کندہ کی سلطنت قائم کی تھی جسے ملوک حیرہ کی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ یہ سلطنت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ چھٹی صدی عیسوی میں جو ظہور اسلام کا زمانہ ہے، نجد میں غطفان کا قبیلہ بستا تھا، جس کی تادیب کے لئے خود رسول اللہؐ مع صحابہ ۴ھ میں نجد تشریف لے گئے تھے۔ اس مہم کا نام اہل سیرت کے یہاں 'غزوہ ذات الرقاع' ہے۔

عہد نبوی میں اس علاقے کے تعلقات اسلام کے ساتھ آخر تک کھنچے کھنچے ہی رہے۔ ہجرت مدینہ سے قبل ایک حج کے موقع پر رسول اللہؐ نے حسب سابق جمع ہونے والے مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت دی، رسول اللہؐ مختلف قبائل کے پڑاؤ پر جاتے تھے اور انہیں توحید و رسالت و معاد کا سبق دیتے تھے، ایسے میں نجد کے بنو حنیفہ ہی سب سے زیادہ درشت اور بد اخلاق ثابت ہوئے تھے۔ اس موقع پر

(۱) عنیزہ، امراء القیس کی چچازاد اور محبوبہ تھی (۲) مقامات کے نام (۳) مقامات کے نام

(۴) امراء القیس کے قصیدہ لامیہ کا اردو ترجمہ از اکرام جمالی "رکو کہ رولیں" راولپنڈی، ۲۰۰۲ء

ثمامہ بن آثال (جو بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے اور حروب ارتداد میں شہید ہوئے) نے رسول اللہؐ سے یہاں تک سخت کلامی کی کہ (نعوذ باللہ)

"اگر تو مزید میرے سامنے آیا تو میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا"۔(۱)

ہجرت کے بعد جب اسلام آہستہ آہستہ طاقت پکڑنے لگا تب بھی رسول اللہؐ اہل نجد کی طرف سے مطمئن کبھی نہ ہوئے۔ ۴ھ میں جب ابو براء عامر بن مالک، رسول اللہؐ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو رسول اللہؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی، جو اس نے قبول تو نہ کی البتہ رسول اللہؐ سے درخواست کی

"یا محمدؐ! اگر آپؐ اپنے رفقاء میں سے کچھ لوگوں کو اہل نجد کی طرف بھیج دیں اور وہ وہاں آپؐ کا پیغام پہنچا کر انہیں اسلام کی دعوت دیں تو مجھے امید ہے کہ اہل نجد ضرور آپؐ کے پیغام پر لبیک کہیں گے"۔

"مجھے اپنے آدمیوں کے بارے میں اہل نجد سے خوف محسوس ہوتا ہے"۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا

"میں ان کا ہمسایہ رہوں گا" ابو براء نے تسلی دی "اس لئے انہیں روانہ کر دیجئے، انہیں چاہئے کہ اہل نجد کو آپؐ کے پیغام کی طرف دعوت دیں"۔

رسول اللہؐ نے بادل نخواستہ ستر منتخب اصحاب کو قبائل نجد میں تبلیغ اسلام کے لئے روانہ کر دیا۔ جب یہ جماعت بئر معونہ پہنچ کر مقیم ہوئی تو انہوں نے حرام بن ملحان کے ہاتھ رسول اللہؐ کا خط اس علاقے کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ عامر نے نخوت میں آ کر حرام کو مار ڈالا اور اپنے قبیلہ بنی عامر سے کہا کہ جا کر باقی سارے مسلمانوں کو قتل کر ڈالو۔ بنو عامر نے انکار کیا اور کہا کہ جب ابو براء نے ان کو اپنی حمایت میں لے لیا ہے تو ہم ان کو کیسے قتل کر سکتے ہیں۔

عامر بن طفیل نے اپنے پڑوسی قبیلے، بنو سلیم کو پکارا اور ان کی مدد سے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔ صرف دو اصحاب بچ سکے تھے ایک تو عمرو بن امیہؓ، جن کو عامر بن طفیل نے پکڑ لیا تھا مگر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام کو آزاد کرنے کی منت مانی تھی، دوسرے کعب بن زیدؓ

(۱) ابن ہشام: سیرۃ النبویہ۔ جلد ۱ ص ۴۳۶

کہ شدید زخمی ہو کر لاشوں کے نیچے دب گئے تھے۔

اہل نجد کے ہاتھوں مسلمانوں کے اس قتل عام پر رسول اللہؐ بے انتہا رنجیدہ رہے اور حالت اضطرار میں فرماتے" ۔۔۔۔" یہ ابو براء کا کام ہے جسے میں پہلے بھی برا سمجھ رہا تھا اور مجھے اسی کا ڈر تھا"۔

اے ام بنین (۱) کے بیٹو!

تم اہل نجد میں چوٹی کے افراد شمار ہوتے ہو

کیا پھر بھی تمہیں اس بات کا خیال نہ آیا۔

عامر بن طفیل نے ابو براء کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔

عامر کا مطلب بجز اس کے اور کیا تھا کہ وہ ابو براء سے اس کی ذمہ داری اور عہد وفا تڑوا دے اور غلطی سے جو بات ہو جاتی ہے اسے اس بات کی طرح نہیں سمجھا جاتا جو ارادتاً کی جائے۔(۲)

اہل نجد کی چیرہ دستیاں یہیں ختم نہیں ہو گئیں بئر معونہ کے واقعہ کے چند ماہ بعد نجد کے قبیلہ غطفان نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ رسول اللہؐ ان کے مقابلے کے لئے گئے یہ ۴ھ کا واقعہ ہے۔ اور تاریخ کی کتب میں غزوہ ذات الرقاع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے اتنے نزدیک آ گئے کہ رسول اللہؐ نے صلوٰۃ خوف ادا کی، گو کہ جنگ کی نوبت نہ آئی اور رسول اللہ بغیر کسی نقصان کے مدینہ واپس آ گئے۔

عہد نبوی کے اواخر میں جب اسلام اطراف نجد میں عام طور پر پھیل گیا تو ۹ھ میں نجد کے بنو حنیفہ نے بھی مدینہ منورہ ایک وفد بھیجا جس میں مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا وفد نے بظاہر اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن واپس ہوتے ہی مسیلمہ نے خود اپنی نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اس کا جاہلی عصبیت کی بنیاد پر قبائل ربیعہ نے خوب ساتھ دیا۔ ان کا کہنا تھا ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمدؐ سچے ہیں۔

لیکن ربیعہ کا جھوٹا نبی، ہم کو مضر کے سچے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔(۳)

اسی نجد کے ایک شہر ریاض کی طرف ہمارا جہاز اڑا جا رہا تھا۔

---

(۱) ام بنین، جس کا نام لیلیٰ بنت عمرو تھا، ابو براء کی ماں تھی۔ (۲) بئر معونہ کے المیے پر حسان بن ثابت کے اشعار

(۳) مسیلمہ کا تعلق بنو حنیفہ سے تھا جو کہ قبائل ربیعہ کی شاخ تھی اور رسول اللہ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا جو کہ مضر کی شاخ تھی۔

اس سفر میں ڈاکٹر آصف قریشی اور ان کی فیملی ہم سفر تھی۔ آصف قریشی صاحب جامعہ کراچی کے شعبہ ریاضی میں درس و تدریس سے منسلک تھے، چند سالوں سے ریاض کی جامعہ ملک سعود، سے وابستہ ہیں۔ ان کی بیگم طیبہ بھابی سے اس سے پہلے بھی میری ایک دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ چند گھنٹے قبل، کراچی ائر پورٹ پر بھی ان کا ساتھ رہا البتہ جہاز میں مجھے بالکل ابتدائی اور آصف بھائی کو کافی پچھلی نشستیں ملیں، جس کی وجہ سے تعلقات کچھ دیر کے لئے منقطع رہے۔

کراچی سے ریاض کی ڈائریکٹ فلائیٹ تقریباً دو گھنٹے چالیس منٹ کی ہے جو کھانا کھانے، مشروبات سے شغل کرنے، اخبار پڑھنے یا فارم بھرنے میں تمام ہو جاتی ہے۔ بچے سفر سے پورا پورا لطف لے رہے تھے، اپنے ابو سے ملنے کی خوشی شائد سب سے زیادہ سعود کو تھی۔ سعدیہ کا یہ پہلا ہوائی سفر تھا لہٰذا جب جہاز کو اڑے ہوئے نصف گھنٹے کے قریب ہو گئے تو اس نے ذرا بیزاری سے پوچھا

"امی ڈرائیور انکل کیوں نہیں آتے، جہاز کیوں نہیں چلاتے"۔

پھر میرے دس منٹ اس کو یہ سمجھانے میں صرف ہو گئے کہ جہاز تو گذشتہ نصف گھنٹے سے بلا رکے مسلسل اڑ رہا ہے۔

سفر بخیریت تمام ہوا۔ ریاض کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ پر ہمارا جہاز رک چکا تھا، ہم ایک ایک کر کے جہاز سے نکلے اور ٹنل میں سے ہوتے ہوئے براہ راست ایرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ریاض ایرپرٹ جدید طرز کا بنا ہوا بہت خوبصورت اور پُرسکون ایرپورٹ ہے۔ لائن میں ہمارا نمبر دوسرا ہی تھا لہٰذا کسٹم وغیرہ کے جھمیلوں سے ہم جلد ہی فارغ ہو کر باہر نکلے، تو سجاد کو اپنا منتظر پایا۔ آصف بھائی کو لینے کے لئے ان کے بہنوئی محمود بھائی آئے ہوئے تھے۔ لیکن سامان کی زیادتی کی وجہ سے ان کی گاڑی میں آصف بھائی کی جگہ نہ نکل سکی تو وہ ہمارے ساتھ آ گئے کیوں کہ ہمارے پاس اس وقت ضرورت سے زیادہ بڑی گاڑی تھی یعنی سجاد کے آفس کی اسٹیشن ویگن۔

بہر حال آصف بھائی کو ڈراپ کرنے پہلے ہم جامعہ ملک السعود کی طرف چلے۔ کشادہ اور دوہری سڑکیں، گرم موسم، صحرائی پیش منظر، تیز رفتار بڑی بڑی گاڑیاں، عرب اور ان کے سروں پر لپٹے سرخ و سفید چارخانے والے رومال، سڑکوں پر عورتیں ندارد، لیفٹ ہینڈ ڈرائیو، عربی میں لکھے ہوئے نیون سائن، بے حد و حساب صفائی، چم چم کرتی ہوئی دیواروں والی عمارتیں، اور برق رفتار زوں ۔۔۔ زوں

گذرنے والی بیش قیمت چمچماتی لشکارے مارتی گاڑیاں۔ یہ سب کچھ کراچی سے بہت مختلف تھا۔ اور جب ہم کنگ سعود یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو مجھے اپنی جامعہ کراچی یاد آ گئی۔ جہاں کل دوپہر ساڑھے تین بجے تک میں اپنا کام سمیٹتی رہی تھی۔ جامعہ کراچی کے دونوں بڑے گیٹوں پر رینجرز تعینات ہیں بلکہ اب تو یہ ان کا مستقل ہیڈ کوارٹر بن گیا ہے جامعہ کی انتظامیہ اور اساتذہ، جامعہ کے اندر امن وامان کی فضا کو قائم رکھنے میں بدترین طریقے سے ناکام ہو چکے تھے اس کا سبب انتظامیہ کی نالائقی اور اساتذہ کی اکثریت کا کسی نہ کسی طلبہ تنظیم کی طرف ناروا جھکاؤ ہے۔ کئی نوجوان طلبا کے ٹھکانے لگنے اور جوان لاشوں کے اٹھنے کے بعد چانسلر نے بالاخر جامعہ این ۔ای ۔ڈی اور جامعہ کراچی میں رینجرز تعینات کیے جن کی وجہ سے کم از کم جامعہ کے حدود میں وقتی امن قائم ہوا اور تدریس کے عمل کو جاری رکھنا ممکن ہو سکا۔ جامعہ میں حصول علم کے لئے جانے والے طلباء وطالبات کو تلاشی کے عمل سے گذرنا پڑتا ہے، صرف طلباء ہی نہیں اساتذہ کو بھی اسی عمل سے گذرنا ہوتا ہے شروع شروع میں ایسا لگتا تھا کہ یا جیل میں جا رہے ہیں یا جیل سے نکل رہے ہیں۔ جامعہ کراچی اس حال کو کیوں پہنچی۔ اس کا جواب ہمارے ملک کے سیاستدانوں کے پاس ہو گا، ہر بڑی سیاسی پارٹی کا ایک یوتھ ونگ ہے جس کی وجہ سے علمی مراکز میں سیاست گھس آئی جس نے نہ صرف مادر علمی کے تقدس کو پامال کیا بلکہ اسے پڑھے لکھے جاہلوں کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔

جامعہ ملک السعود کے داخلے کے عام راستے پر بہت بڑی سی کتاب بنی ہوئی ہے جس پر سورۃ علق کی ابتدائی آیات نہایت فنکارانہ مہارت سے لکھی ہوئی ہیں۔ اساتذہ کے لئے رہائشی علاقہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وسیع وعریض رقبے پر بنے ہوئے سیکڑوں فلیٹ اور سیکڑوں ولاز' یونیورسٹی اپنے اساتذہ کو فرنشڈ فلیٹ دیتی ہے ان کے بچوں کا ریاض کے بہترین اسکول میں تعلیم کا خرچ برداشت کرتی ہے۔ ان سہولیات کے ساتھ یہاں کی تنخواہیں۔ شہر کا امن سکون وچین، مجھے ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی سمجھ میں آنے لگا کہ یہاں آنے کے بعد لوگ واپس جانا کیوں نہیں چاہتے۔ جامعہ الملک السعود (King Saud University) سعودی عرب کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اور ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء میں قائم کی گئی تھی۔

آصف بھائی کو ڈراپ کرنے کے بعد ہم اپنے گھر کی طرف چلے۔ سجاد ہمیں شہر کی اہم شاہراہوں اور عمارتوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے تھے۔ آفس کا ڈرائیور جو کہ سیاہ فام حبشی تھا

بہت آرام سے گاڑی چلا رہا تھا، سعدیہ، سجاد کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

''ڈرائیور انکل کو اردو نہیں آتی'' سعدیہ اپنے ابو سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں، انہیں صرف عربی آتی ہے''۔

''اچھا تو میں انہیں آیت الکرسی سناتی ہوں'' سعدیہ جس کے لئے چپ رہنا عذاب تھا ڈرائیور کو مخاطب کر کے آیۃ لکرسی سنانے لگی، ہم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر میں گاڑی سلمانیہ کے علاقہ میں بہت کشادہ سڑک پر ایک خوبصورت کمپاؤنڈ میں آ رکی۔ اسی کمپاؤنڈ میں گراونڈ فلور پر نو نمبر کا فلیٹ ہمارا گھر تھا۔ جدید طرز کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا فلیٹ جس میں دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ، ڈائننگ اور ایک ٹی وی لاونج کے ساتھ دو جدید طرز کے باتھ رومز اور ایک کشادہ کچن شامل تھا مجھے پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا، یہ اور بات ہے کہ اس کا کرایہ بھی بہت اچھا تھا یعنی سولہ ہزار ریال سالانہ۔

برابر کا دس نمبر کا فلیٹ شمیم صاحب کا تھا، پورے کمپاؤنڈ میں صرف یہی ایک پاکستانی فیملی تھی۔ شمیم صاحب اور ان کی بیگم فرحت کا تعلق پشاور سے تھا، دوپہر کا کھانا انہی لوگوں کی طرف تھا۔ بلکہ رات کا کھانا بھی انہی نے کھلایا بڑا مہمان نواز اور پرخلوص پڑوس نصیب ہوا تھا۔ ہمیں شہر ریاض کی ابتدائی سیریں بھی شمیم بھائی اور فرحت نے ہی کرائی تھیں کیونکہ ہمارے پاس اس وقت ذاتی گاڑی نہیں تھی ۔۔۔۔ سعودی عرب کے شہروں کے بارے میں عموماً ہمارے ذہنوں میں ایک روائتی سا تصور تھا، قدیم شہروں کا تصور ۔۔۔۔ ۱۸۱۸ء سے قبل ریاض عارض کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک معمولی قصبہ ہی تھا لیکن درعیہ کی تباہی کے بعد جب آل سعود نے اسے اپنا پایہ تخت بنالیا تو اسے پورے نجد میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک یہی آل سعود کا پایہ تخت چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ ۱۸۹۶ء میں حائل کے امراء آل رشید نے اس پر قبضہ کر کے وقتی طور پر آل سعود کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اس کے چند ہی سال بعد ۱۹۰۲ء میں موجودہ سعودی فرمانروا کے دادا عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یہ شہر شروع سے اپنی سرسبزی وشادابی، پانی کی کثرت اور باغات کی وجہ سے مشہور رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام ریاض (جمع : روضہ) ہے۔

دور کیوں جایئے مولانا مودودی کے ہم سفر محمد عاصم صاحب اپنے سفر نامہ ارض القران میں

۱۹۴۹ء کے ریاض کو یوں بیان کرتے ہیں۔

'۴۹ء میں جب میں مولانا مسعود عاصم ندوی مرحوم کے ساتھ پہلی مرتبہ ریاض آیا تھا تو یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، ہمارے یہاں کے دیہات سے بھی گیا گذرا۔ نہ یہاں کوئی بازار تھا اور نہ کوئی پختہ سڑک (سوائے ایک سڑک کے جو شہر سے ہوائی اڈے تک جاتی تھی۔) بجلی تھی' لیکن بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد تک محدود، تنگ و تاریک قسم کی گلیوں میں معمولی قسم کی دکانیں تھیں، اور ان ہی کو بازار کہا جاتا تھا یہاں نہ کوئی ہوٹل تھا اور نہ کرائے کی کوئی سواری مل سکتی تھی، تمام مکانات حتیٰ کہ بادشاہ اور امراء کے محلات بھی کچے تھے۔ البتہ نئی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کی ابتداء شاہی خاندان کے محلات کی تعمیر سے ہو رہی تھی'۔ (محمد عاصم : سفر نامہ ارض القران : ص ۸۵)

انہی محمد عاصم صاحب نے ۵۹ء کے ریاض کے بارے میں لکھا ہے

'راستے میں ریاض کی بہت سی سڑکوں اور بازاروں سے ہمارا گذر ہوا جو نہایت شاندار اور جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان پر بجلی کی روشنی کا عمدہ انتظام تھا۔ دکانیں اگرچہ بند تھیں لیکن اندازہ ہوا کہ گذشتہ چند سال کے اندر ریاض بہت ہی وسیع اور جدید طرز کا شہر بن چکا ہے'۔ (سفر نامہ ارض القران : ص ۸۵)

اور اب تو خیر ریاض کے کہنے ہی کیا۔

ریاض میں میرا قیام دس ماہ رہا۔ جس میں ہم نے بہت سفر کیا اور سجاد نے کم و بیش نو شہر مجھے گھما دیئے۔ دو عمروں کا سفر اور ایک حج کا سفر بھی اسی میں شامل تھا۔ ۱۹ ستمبر ۹۱ء سے جون ۹۲ء کے دوران ہم نے ریاض کے علاوہ مکہ، مدینہ، جدہ، طائف، خرج، دمام، الجبیل، الخبر اور دہران کے شہر گھومے۔ ان تمام شہروں میں جدہ اور ریاض بڑے شہر ہیں۔ ریاض کی صفائی بہت متاثر کن ہے۔ آپ میلوں ڈرائیو کر جائیں نہ آپ کو سڑکیں ٹوٹی ہوئی ملیں گی، نہ سڑکوں کے کنارے غلاظت کا ڈھیر نظر آئے گا اور نہ ہی کالی، بدصورت، چڑیلوں کی مانند پولی تھین کی تھیلیاں پھڑ پھڑاتی نظر آئیں گی، روشنی کا انتہائی معیاری انتظام ہے، رات کو دو بجے بھی آپ سڑک پر گری ہوئی سوئی تلاش کر لیں۔ اسی طرح یہاں کے گھروں میں نہ چوہوں کے مشاعرے ہوتے ہیں نہ کاکروچوں کے دنگل، نہ مکھیوں کا دل نظر آتا ہے نہ مچھروں کی فوج۔

تعمیراتی نکتہ نظر سے جدہ بھی ریاض کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ریاض کی سب ویز، اوور ہیڈ،

سپر مارکٹیں، محلات' سرکاری عمارتیں خصوصاً وزارت داخلہ کی کشتی نما عمارت، انتہائی لاجواب ہیں۔ یہ تاثر بھی غلط ہے کہ یہاں سبزہ نہیں ہوتا، ریاض بہت سرسبز شہر ہے، سعودی عرب کا دارالحکومت بننے سے قبل آخر یہ ایک نخلستان ہی تھا، بے قاعدہ مستطیل شکل کا تین میل لمبا اور ایک میل چوڑا نخلستان، جو اب ایک انتہائی جدید شہر کی شکل میں موجود ہے۔

سجاد ریاض میں چھ ماہ سے مقیم تھے اور انہوں نے اس مختصر سے عرصے میں بہت سے احباب بنا لئے تھے، ہمارے ابتدائی بہت سے دن انہی دعوتوں اور ضیافتوں میں گذر گئے اور یا پھر ہم ریاض شہر کی سیر کے لئے لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ جب ان دعوتوں ضیافتوں سے فراغت ہوئی تو سجاد نے ہمیں درعیہ کی سیر کرائی۔
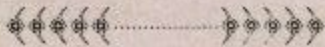
درعیہ

سجاد نے جس طرح مجھے درعیہ کے بارے میں بتایا تھا اس سے اس شہر کی تاریخی حیثیت پر ذرہ برابر روشنی نہیں پڑتی تھی۔ میں یہی سمجھی کہ یہ چند عمارتیں ہوں گی جو آل سعود کے محلات کے طور پر استعمال ہوتی ہوں گی اور بس۔ لہٰذا میں اور بچے سجاد کے ساتھ ایسے ہی سرسری سیر کے لئے درعیہ روانہ ہو گئے۔ وہ ۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کا ٹھیک ٹھاک گرم جمعہ تھا، جمعہ کی نماز پڑھ کر ہم روانہ ہوئے، اس سفر میں جاوید ہمارے ساتھ تھے۔ یہ سجاد کے دوست تھے اور چند دنوں قبل ہی ریاض میں دریافت ہوئے تھے، جاوید کو ریاض آئے چند ماہ ہوئے تھے ایک دن گرین ہاؤس سپر مارکیٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے اچانک ہی سجاد کی ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دیار غیر میں کوئی شناسا مل جائے تو فریقین کی خوشی قابل دید ہوا کرتی ہے۔ یہی دونوں دوستوں کا حال تھا، جاوید بھی سلیمانیہ میں مقیم تھے وہ اسی وقت آ کر ہمارا گھر دیکھ گئے تھے اور اس کے بعد سے ان کے اکثر جمعے ہمارے یہاں ہی گذرنے لگے کیونکہ جاوید کے بیوی بچے کراچی میں تھے اور وہ تنہا سخت اداسی اور بوریت محسوس کرتے تھے، ثناء، سعود، سعدیہ بھی جاوید انکل کا انتظار کیا کرتے تھے۔ وہ بھی چھٹی کا دن تھا لہٰذا جاوید کو بھی ہم نے درعیہ کی سیر کی دعوت دی جو بغیر کسی تردد کے قبول کر لی گئی اور ہم عازم درعیہ ہوئے۔

صاف شفاف، چمچماتی، کشادہ سڑکوں پر ہماری گاڑی دوڑتی رہی، کنگ سعود یونیورسٹی بھی پیچھے رہ گئی ایک جگہ سڑک نے پورا تین سو ساٹھ (۳۶۰) درجہ کا زاویہ بنایا اور گہرائیوں میں اترتی چلی گئی، آبادی اب پیچھے رہ گئی تھی کچھ مزید فاصلہ طے ہوا تو دائیں بائیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ جیسے سعودی عرب کے نخلستانوں میں عموماً نظر آتے ہیں ان جھنڈوں کے درمیان میں مٹی کے بنے ہوئے مکانات مجھے ہمیشہ سے ہانٹ کیا کرتے، ایسی ہی آبادی کے آثار شروع ہو چکے تھے جب ایک قدرے کشادہ پارکنگ لاٹ پر سجاد نے گاڑی پارک کر دی۔ یہاں کئی گاڑیاں اور بھی پارک تھیں۔

''آج چھٹی ہے اس لئے لوگ آئے ہوئے ہیں'' سجاد نے گاڑیوں کی تعداد سے سیاحوں کا اندازہ کیا۔ اس دوران میں متجسسانہ نظروں سے اردگرد کو دیکھ رہی تھی۔ میرے چاروں طرف ایک قدیم مٹی گارے کا بنا ہوا نیم شکستہ شہر بکھرا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے۔'' میری حیرت بجا تھی۔

''یہ درعیہ ہے''۔

''یہ تو پورا شہر ہے''۔

''ہاں تو یہ آل سعود کا شہر ہی تھا۔ آل سعود نے یہیں سے اپنی حکومت کی ابتداء کی۔ یہ شہر ۱۸۱۸ء میں مصری فوجوں کے ہاتھوں تباہ ہوا اور اب آثار قدیمہ کے طور پر تمہارے سامنے ہے''۔ سجاد نے درعیہ کی تاریخ بیان کی ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے کم از کم میرے اوپر انکشافات کے دروازے کھلتے چلے جا رہے تھے مجھے اس بات کی قطعی توقع نہیں تھی کہ ہم ایسے کسی شہر بے مثال کو دیکھنے جا رہے ہیں۔

'بھلا اتنا بڑا اور تاریخی شہر ظہر سے عصر کے درمیان گھوما جا سکتا ہے۔' میں سجاد پر ناراض ہوئی 'میں یہاں پھر آؤں گی'۔

''بیگم صاحبہ آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں، آپ دس دفعہ کہیں گی میں دس دفعہ آپ کو یہاں لاؤں گا تھوڑا بہت آج گھوم لو تھوڑا بہت پھر سہی''۔

درعیہ کسی زمانے میں وسیع اور گنجان نخلستان تھا اب بھی یہ بہت ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور اس میں کھجور کے متعدد باغات پائے جاتے ہیں جو سب کے سب کنوؤں کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کا رقبہ شمالاً جنوباً تقریباً چار میل تھا آج کل دارالحکومت ریاض سے اس کا فاصلہ بیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے اور یہ علاقہ اب ریاض کی حدود میں آ گیا ہے جب کہ انیسویں صدی تک یہ ریاض کا پڑوسی قصبہ یا شہر تھا۔ کسی زمانے میں اس نخلستان کو حنیفہ نامی ندی جو اب خشک ہو چکی ہے سیراب کرتی تھی اسی وجہ سے اس وادی کا نام بھی وادی حنیفہ پڑ گیا۔ ہو سکتا ہے اس وادی کا یہ نام قبیلہ بنو حنیفہ کی نسبت سے ہو۔ یہ ایک وسیع و عریض وادی ہے جو مسیلمہ کذاب کے قبیلہ بنو حنیفہ کا مسکن رہی ہے درعیہ سے تقریباً ۳۰ میل (اور ریاض سے تقریباً ۴۵ میل) کے فاصلے پر عقربا نامی ایک جگہ ہے جہاں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں خالد بن ولیدؓ اور مسیلمہ کذاب کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس خونریز جنگ میں جو صحابہ کرام شہید

ہم اسی طرح آگے چلتے چلتے ایک سہ راہے پر آرکے۔ ہماری داہنی جانب ایک بورڈ پر لکھا تھا EASTERN PALACES یعنی مشرقی محلات ہم اسی شاہراہ پر مڑ گئے جلد ہی ہم نے اپنے آپ کو شاندار محلات کے کھنڈرات کے درمیان پایا۔ کھنڈر ہو جانے کے باوجود بیشتر محلات کے قریب ہی بورڈ لگا ہوا ہے جس پر قصر کے مالک کا نام لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس طرح کے کئی بورڈ نظر آئے 'قصر سلوی' ۔۔۔ 'قصر الامام محمد بن سعود بن مقرن' ۔۔۔ 'قصر الامام عبدالعزیز بن محمد بن سعود' ۔۔۔ 'قصر الامام سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود' وغیرہ ان میں سب سے زیادہ پُر شکوہ اور ابھی تک باقی قصر 'سعد بن سعود' کا ہے۔ ہو سکتا ہے دوسرے قصر جب سلامت رہے ہوں تو اس سے بھی پُر شکوہ ہوں مگر اب جب کہ ہر طرف کھنڈرات ہی کھنڈرات ہیں سعد بن سعود کا قصر بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑا ہے۔

''تمہیں یہ قصر دیکھا بھالا سا نہیں لگ رہا''؟ سجاد مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

''لگ تو رہا ہے'' ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت یا یہ منظر پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔

''سعودی ریال کے نوٹ کے ایک طرف اس قصر کی تصویر بنی ہے''۔ سجاد نے معمہ حل کیا۔

مجھے یاد آ گیا واقعی ایسا ہی تھا۔

وقت ختم ہو رہا تھا۔ عصر کی اذان ہوئے دیر ہو چکی تھی، تھوڑی دیر میں مغرب ہو جانی تھی۔ یقیناً یہاں روشنی کا انتظام نہیں ہوگا یہ سوچ کر ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ آئندہ جب یہاں آؤں گی تو سینڈل کی جگہ نارتھ اسٹار کے جوتے یا جوگرز پہن کر آؤں گی، ہر بچے کے ہاتھ میں پانی کی بوتل بھی ہونی چاہئے، پھر یہ کہ کیمرہ ساتھ ہونا چاہئے تاکہ ان تاریخی مقامات کو تصویروں میں محفوظ کیا جا سکے۔ بہر حال۔ پہلا ٹرپ خاصا ادھورا رہا تھا۔ ہم انہی راستوں سے چل کر 'الطریف' سے باہر نکلے۔ سامنے پل تھا، پل کے اس طرف مسجد شیخ محمد بن عبدالوہاب تھی سجاد اور جاوید نے وہاں عصر کی نماز خاصی تاخیر سے پڑھی اور ہم گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔

درعیہ کے لئے ہمارا دوسرا سفر دسمبر ۱۹۹۱ء میں ہوا۔ اس بار ہماری ہم سفر طیبہ بھابی اور ان کے بچے تھے۔ آصف بھائی اپنی مصروفیات کے سبب ہمارے ساتھ نہیں آ سکے تھے طیبہ بھابی نے اپنی شاندار گرہستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پزہ اور ڈھیر سارے چپس بنا کر رکھ لئے تھے، کولڈ ڈرنک اور پھل ہم نے لے لئے تھے یوں یہ ایک تفریحی ٹور بھی بن گیا۔ اس دفعہ بھی ہمارے علاوہ کئی غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیاں نظر

آئیں۔ ایک برطانوی اسکالر مسلسل سر گھما گھما کر درعیہ کے نقش و نگار نگاہوں میں جذب کر رہا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری اور ایک ہاتھ میں قلم تھا وہ بار بار اپنی ڈائری میں رک کر کچھ نوٹ کر لیا کرتا تھا۔

''ہم اتنے سالوں سے ریاض میں رہ رہے ہیں مگر درعیہ آج پہلی بار آئے'' طیبہ بھابی حیرت اور تعجب سے اس شہر کے آثار دیکھ رہی تھیں جو یقیناً کبھی بستیوں کی بستی رہی ہوگی۔ جس نے متعدد ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور آج کھنڈر ہو جانے کے باوجود سیاحوں کے لئے باعث کشش ہے۔

مجھے تاریخ کھوجنے سے پتہ چلا کہ یہ نخلستان عہد رسالت میں بھی تھا اور نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا، جگہ جگہ نخلستان تھے انہی میں سے ایک درعیہ بھی تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسے 'حمی' قرار دے دیا تھا، 'حمی' دراصل سرکاری چراہ گاہ کو کہتے تھے جہاں سرکاری اونٹوں اور گھوڑوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس وقت یہ چھ عربی میل قطر کا علاقہ تھا جہاں اندازاً تین سو گھوڑے اور ہزاروں اونٹ چرنے کی گنجائش تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس چراگاہ کا رقبہ بڑھا کر ۱۰ میل قطر کر دیا تھا، اس کے بعد اموی عہد میں اس کی یہی حیثیت برقرار رہی، عباسیوں نے نجد کی قطعاً پرواہ نہ کی اس پورے عہد میں نجد خصوصاً ایک ایسا دور افتادہ علاقہ تھا جس کی ترقی یا خوشحالی کے لئے کچھ نہیں کیا گیا، چنانچہ درعیہ بھی تاریخ کے دھندلکوں میں چھپ گیا۔

پندرہویں صدی عیسوی میں درعیہ ہمیں ایک ذاتی جاگیر کے طور پر نظر آتا ہے۔ ریاض کے امیر ابن درع نے اپنی یہ جاگیر اپنے ایک رشتہ دار مانی بن ربیعہ المریدی کو ۱۴۴۶ء میں عطا کر دی، مانی بن ربیعہ المریدی آل سعود کے اجداد تھے۔ اس طرح یہ علاقہ آل سعود کے پاس آ گیا، اس وقت اس طرح کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں نجد میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ریاست کے لفظ سے دھوکا نہ کھائیے، یوں سمجھ لیں کہ صحرائے نجد میں جتنے نخلستان تھے اتنی ہی ریاستیں تھیں، ہر ریاست میں جو غالب قبیلہ آباد تھا اسی کی حکمرانی ہوتی تھی، یہ ساری ریاستیں باہم دست بگریباں رہا کرتی تھیں، ان ریاستوں میں حساء، عیینہ، درعیہ، منفوحہ، حرمیلا، ریاض، حائل، قصیم اور مجمعہ وغیرہ تھیں، یہ سارے علاقے آج بھی انہی ناموں سے موجود ہیں۔

درعیہ کو بین الاقوامی شہرت اس وقت نصیب ہوئی جب شیخ محمد بن عبدالوہاب یہاں آئے۔

شیخ کی پیدائش عیینہ کی تھی (یہ وہی شہر ہے جہاں مسیلمہ کذاب پیدا ہوا تھا) مگر جوانی میں چند سال حریملاء میں گذارے۔ یہیں سے انہوں نے اپنی دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا، ان کی دعوت خالص توحید، اتباع سنت اور ترک بدعات کے لئے تھی۔ ۔ ۔ یہ بھی تاریخ کا کرشمہ ہے کہ جس شہر نے ایک کاذب کو جنم دیا اسی شہر سے پھر ایک موحد بھی اٹھا۔

ترک اسلام اور قبول بدعات میں نجد کا اپنا ایک مقام رہا ہے۔ اہل نجد سب سے آخر میں اسلام قبول کرنے والے تھے۔ پھر جس شخص نے عہد رسالت میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا یعنی مسیلمہ کذاب اس کا تعلق بھی نجد کے بنو حنیفہ سے ہی تھا۔ گو کہ بعد میں یہاں سے ارتداد کا فتنہ ختم کر دیا گیا لیکن مرور زمانے سے نجدیوں کے اعتقادات میں کمزوریاں در آئیں اور طرح طرح کی بدعتوں میں یہ لوگ پھنس گئے تھے۔ درعیہ میں ایک مقدس درخت تھا 'طرفیہ' یہاں کے لوگ اس درخت کا طواف کرتے اور اس سے اپنی مرادیں مانگتے خصوصاً بے اولاد عورتیں اس درخت سے لپٹ کر اولاد کے لئے دعا مانگتیں۔ یہیں ایک غار کے نزدیک ایک قبر پر، جو کہ ''بنت الامیر'' کی قبر کے نام سے مشہور تھی، لوگ عبادت کے لئے آتے تھے۔ پھر اہل درعیہ میں سے بہت سے لوگ ایک نام نہاد ولی 'تاج' کے مرید تھے، یہ بوڑھا، نابینا شخص تھا جو الخرج میں رہتا تھا اور وہاں سے بغیر کسی مددگار کے درعیہ آیا کرتا تھا (درعیہ اور الخرج کا درمیانی فاصلہ تقریباً اسی کلومیٹر ہے اور یہ سارا راستہ صحرائی ہے) اہل درعیہ اس کو بھاری نذرانے اور چڑھاوے دیا کرتے تھے۔

بہر حال شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی دعوت حریملاء سے شروع کی پھر وہ عیینہ پہنچے اور وہاں بھی بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا، مگر وہاں کا امیر جلد ہی آپ کا مخالف ہو گیا تو آپ کو عیینہ چھوڑنا پڑا اور آپ درعیہ آ گئے یہ ۱۷۴۴ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں درعیہ کا امیر محمد بن سعود المقرن تھا۔ (جو موجودہ سعودی بادشاہ فہد بن عبدالعزیز کے پردادا کا پردادا تھا) درعیہ میں شیخ کا کھلے دل سے استقبال کیا گیا اور امیر درعیہ نے بھی اپنی حمایت اور اطاعت کا یقین دلایا۔ شیخ یہاں عبادت اور درس وتدریس میں لگ گئے، ان کے حلقہ درس میں صرف درعیہ کے لوگ ہی نہیں شریک ہوتے تھے بلکہ نجد کی دیگر ریاستوں سے بھی لوگ یہاں آتے تھے جن کی تعداد سیکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور درعیہ کی علمی رونقیں بھی عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ درعیہ آہستہ آہستہ نجد کی ایک اہم ریاست بنتا چلا گیا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب سمجھتے تھے کہ کسی

امیر (حاکم) کی تائید حاصل کئے بغیر ان کا تحریکی کام تسلی بخش طریقے سے نہیں چل سکے گا چنانچہ انہوں نے اپنی آمد کے پہلے ہی سال امیر درعیہ محمد بن سعود سے یہ معاہدہ کر لیا کہ پورے عرب میں اسلام کو اس کی اصل صورت میں پھیلانے کے لئے مل کر کام کریں گے۔ یوں شیخ محمد کی روحانی قوت اور میر محمد بن سعود کی عسکری قوت کے ملنے سے جزیرہ نمائے عرب کی تاریخ بدل گئی آہستہ آہستہ گردونواح کے علاقے امیر درعیہ کے زیر اثر آنے لگے اور نصف صدی کے اندر اندر پورے عرب پر امیر درعیہ کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ محمد بن سعود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالعزیز درعیہ کا امیر بنا، اس کے اڑتیس سالہ دور میں وہابی تحریک کو ایک نئی قوت ملی اور امیر درعیہ کی عملداری جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی قائم ہو گئی، اور ان کے قدم عراق میں کربلا تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد عبدالعزیز کو مسجد طریف میں قتل کر دیا گیا جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکی ہوں۔

ہم لوگ تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے، مشرقی محلات کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہوئے 'الطریف' کے عقب میں آ پہنچے۔ اپنے پہلے سفر میں ہم یہاں تک نہیں پہنچ سکے تھے جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا طریف بلند ٹیکرے پر واقع ہے۔ اس وقت ہم ٹیکرے کے اختتام پر کھڑے تھے جس کے بعد گہری کھائی سی تھی جہاں درختوں کے جھنڈوں نے پراسراریت سی پیدا کر دی تھی کھائی کے اس طرف قدرے بلندی پر دیوار درعیہ تھی، جسے درعیہ کی فصیل بھی کہا جا سکتا ہے۔

ہم سے چند قدم کے فاصلے پر وہ برطانوی اسکالر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑے غور سے دیوار درعیہ کو دیکھ رہا تھا، اب وہ بالکل لال بھبوکا ہو رہا تھا، صحرائی تمازت برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، تاہم میں اس وقت کوئی اور ہی چیز دیکھ رہی تھی اور وہ تھی اس انگریز کے بغل میں دبی ہوئی پانی کی آسمانی بوتل جو پوری کی پوری بھری ہوئی تھی جب کہ ہماری ساری بوتلیں خالی ہو چکی تھیں اور سعدیہ سخت پیاسی تھی لہٰذا سجاد سعدیہ کو لے کر اس سے ایک گلاس پانی لینے چل پڑے۔ اس انگریز نے نہ صرف خوش دلی سے پانی دیا بلکہ سجاد سے بات چیت شروع کر دی وہ بار بار دیوار درعیہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

میں بھی دیوار درعیہ میں الجھ گئی

''یہ کس قدر زبردست قدرتی دفاع ہے'' میں نے طیبہ بھابی کو مخاطب کیا۔ ''پھر نیچے یہ وسیع و کشادہ خندق جیسی کھائی ہے اور کھائی کے ادھر فصیل ہے، جس میں جا بجا واچ ٹاور بنے ہوئے ہیں''۔

"اسی بات پر وہ انگریز بھی حیران ہو رہا ہے"۔ سجاد واپس آ چکے تھے۔ میری خواہش پر انہوں نے دیوار درعیہ کی کئی تصاویر اتاریں۔ قرن وسطیٰ کے بیشتر شہروں کی طرح درعیہ کے چاروں طرف بھی فصیل ہے جس کی لمبائی تقریباً پندرہ کلومیٹر ہے۔ تعمیراتی اعتبار سے اس دیوار کا جواب نہیں کشادہ، اونچی، مضبوط، خاکی اور منقش دیوار درعیہ جو اب بھی درعیہ کے کھنڈرات کی حفاظت میں سر اٹھائے کھڑی تھی گو کہ اب اس کے واچ ٹاورز خاموش ہو چکے تھے۔

عقبی سمت سے گھومتے گھومتے ہم مغربی محلات کی سمت مڑ گئے ہمارے قدموں کے نیچے سرخی مائل خاکی سنگریزے شور مچا رہے تھے۔ ایک بات جو خصوصیت سے میں نے نوٹ کی وہ یہ کہ جو محلات عقبی سمت میں تھے ان میں سے ہر محل پر اونچے اونچے ٹاور بنے ہوئے تھے جو یقیناً دفاعی اعتبار سے بنائے گئے تھے جب کہ وسطی اور اندرونی سمت میں بنے ہوئے محلات میں اتنے بلند واچ ٹاورز نہیں تھے۔ محلات میں داخلے کے لئے بڑے بڑے چوبی دروازے تھے جن میں سے بیشتر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔

"کیا خوبصورت شہر تھا، ٹھنڈا میٹھا، مگر کس بیدردی سے تباہ کر دیا گیا" میں بڑبڑائی اب ہم واپسی کے سفر میں تھے!

درعیہ میں ایک کے بعد ایک امیر آتا گیا، اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب کے انتقال کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین بنتی رہی۔ آل سعود اور آل شیخ کی مشترکہ طاقت نے درعیہ کو پورے عرب کا مرکز بنا دیا تھا۔ یہ صورت حال عثمانیوں کے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی خصوصاً اس صورت میں کہ حجاز پر بھی وہابیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور مکہ و مدینہ کے مقدس شہر بھی عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے لہٰذا عثمانی خلیفہ نے مصر کے محمد علی پاشا کو اس ہدایت کے ساتھ حجاز کا گورنر بنا دیا کہ وہ درعیہ کی مرکزیت کو ختم کرے اور وہابیت کو جزیرہ نمائے عرب سے اکھاڑ پھینکے۔

سات سال تک محمد علی پاشا اور امیر درعیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت رہی تاہم اس کشمکش میں محمد علی کا پلہ بالآخر بھاری ہو گیا، اس نے حجاز پر قبضہ کر کے مکہ اور مدینہ وہابیوں سے چھین لیا۔ محمد علی کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم پاشا اس مشن پر مامور ہوا۔ ۱۸۱۶ء میں وہ حجاز سے چلا اور یکے بعد دیگرے فتوحات کرتا ہوا ۱۸۱۸ء میں فصیل درعیہ کے عقب میں نمودار ہوا اس وقت درعیہ کا امیر عبداللہ ابن سعود تھا۔ مصری فوجوں نے درعیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل درعیہ نے چھ ماہ تک اس محاصرے کا مقابلہ کیا مگر بالآخر ابراہیم کی

فوجیں درعیہ پر قابض ہو گئیں اور درعیہ کو بے دردی سے تباہ کر دیا گیا۔ آل سعود اور آل شیخ کے افراد بے دریغ قتل کئے گئے اور جو بچ رہے انہیں گرفتار کر کے قاہرہ پہنچا دیا گیا۔

امیر عبداللہ کو بھی پہلے قاہرہ اور پھر قسطنطنیہ پہنچایا گیا، جہاں عثمانی خلیفہ کے حکم پر امیر عبداللہ کو مسجد ایا صوفیا کے سامنے قتل کر دیا گیا، اس کے مردہ دھڑ کو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیا گیا جب کہ اس کا سر کاٹ کر ایک ہفتے تک مشتہر کیا گیا۔

اس المیے کے دو سال بعد ہی آل سعود میں سے ایک فرد مشاری بن سعود نے پھر درعیہ کی حکومت سنبھال لی، مصری فوجیں ایک نئے کمانڈر حسین بے کی سرکردگی میں پھر درعیہ پر چڑھ دوڑیں اور اس بار تو درعیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، یہ ۱۸۲۱ء کا واقعہ ہے اپنے وقت کا عروس البلاد جب دوسری بار خاک و خون میں نہلایا گیا تو پھر نہ بس سکا۔

چار سال بعد آل سعود میں سے ایک فرد ترکی بن عبداللہ نے پھر قوت حاصل کی مگر اب اس نے درعیہ سے نہیں بلکہ ریاض کو مصری فوجوں سے چھڑا کر وہاں سے اپنی حکومت شروع کی اس کے بعد آج تک ریاض ہی آل سعود کا دارالحکومت ہے اور درعیہ اب ایک اجڑی ہوئی بستی ہے جس کے کھنڈرات میں صدیوں کی علمی اور سیاسی تاریخ خاموش پڑی ہے۔ اس شہر کی رونقیں دیکھنے کے لئے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں بڑے بڑے سیاح یہاں آئے مگر ۱۸۶۵ء میں جب خلیج فارس کا انگریز گورنر کرنل Pelly ریاض جاتے ہوئے درعیہ سے گذرا تو اسے یہ جگہ بالکل ویران اور بے چراغ نظر آئی۔ ۱۹۵۹ء میں محمد عاصم صاحب درعیہ پہنچے تو اس کے بارے میں لکھا 'دور سے ساری بستی کھنڈروں اور مٹی کے بڑے بڑے ڈھیروں کا مجموعہ نظر آ رہی تھی ---- ساری بستی میں صرف چند بکھرے ہوئے گھر آباد ہیں، باقی ساری بستی ویران پڑی ہے، امراء آل سعود کے محلات کی دیواریں اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سمیت اب تک قائم ہیں اور ان میں بعض کافی بلند ہیں۔ (سفرنامہ ارض القرآن ص ۱۱۴)

شام اترنے لگی تھی اور ہم بھی طریف کی سیر مکمل کر کے واپس آ چکے تھے۔ طریف کے علاوہ بھی درعیہ میں چھوٹی چھوٹی کئی آبادیاں تھیں جن میں سے ایک تو بجیری کہلاتی تھی جہاں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے بعد ان کی اولاد رہتی بستی رہی یہ علاقہ الطریف کے مقابل، نشیب میں ہے جو گھنے درختوں کے جھنڈوں کے درمیان بنے ہوئے ایک اور دو منزلہ مکانات پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ بھی عام

آبادی کے محلے تھے جہاں مزدور، کسان، ہنرمند اور دیگر پیشہ ور افراد اپنے خاندانوں کے ساتھ رہتے تھے، عام آبادی کے یہ علاقے طریف کی شان و شوکت اور عظمت و جبروت کا مقابلہ تو ہرگز نہیں کر سکتے تھے مگر پھر بھی یہ بستیاں خوبصورت رہی ہوں گی گارے اور مٹی کے بنے ہوئے یہ گھر گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہتے ہوں گے۔ ان آبادیوں میں پانی کے حصول کے لئے ہمیں کنوئیں بھی نظر آئے مویشیوں کے لئے بڑے بڑے اصطبل، اور بازار۔۔۔۔۔ اگر آپ قرون اولی یا وسطی کی نجدی تہذیب و تمدن طرز رہائش اور طرز تعمیر کو قریب سے دیکھنا چاہیں تو درعیہ کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اٹھارویں صدی تک یہاں کی طرز معاشرت اور طرز تعمیر زیادہ نہیں بدلا کیونکہ ایک تو نجد دیگر علاقوں سے الگ تھلگ ہے اور دوسرے یہ کہ ان صدیوں میں ترقی کی رفتار کم تھی۔ البتہ جو ترقی بیسویں صدی میں آئی اس نے عرب مدنیت کی کایا پلٹ دی۔ آج ریاض یا جدہ میں آل سعود کے محلات دیکھئے اور پونے دو سو سال قبل درعیہ میں ان کے محلات دیکھئے آپ کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ ان محلات میں نہ بجلی کے بلب تھے نہ پنکھے، نہ ٹیلی فون تھے نہ ٹیلی ویژن، نہ ڈش تھی نہ ائرکنڈیشن، نہ فریج تھے نہ مائیکرو ویو اوون، نہ کمپیوٹر تھے نہ ای میل نہ وال ٹو وال کارپٹ تھی نہ دیگر آسائشیں یہ ساری ترقی رواں صدی کی ترقی ہے۔

مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ درعیہ شائد قرن وسطی کی نجدی طرز معاشرت اور طرز تعمیر کی آخری نشانی ہے جو جلد ہی مٹ جائے گی کیونکہ ایک طرف تو سعودی حکومت ان آثار کو محفوظ کرنے میں دلچسپی نہیں لیتی، دوسرے 'جدید درعیہ' کے نام سے ایک انتہائی خوبصورت اور جدید بستی درعیہ کے قریب بسائی جا رہی ہے، نیز خلیج جنگ (Gulf War) کے بعد امریکیوں کے لئے ریاض میں جو نئی بستی بسائی گئی ہے وہ بالکل فصیل درعیہ کے ساتھ ہے اگر شہر ریاض اسی رفتار سے بڑھتا اور پھیلتا رہا تو اس دلربا بستی کے آثار ایک دن بلڈوزروں کے نیچے ہوں گے۔

☆☆☆☆☆
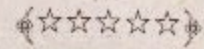
سوئے حرم

ریاض میں ہمارے قیام کا چھٹا مہینہ چل رہا تھا، رمضان شروع ہو چکا تھا اور اسی مبارک مہینے میں عمرہ کے لئے جانے کا پروگرام تھا میں شب قدر یعنی ستائیسویں کی شب عمرہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ میری شدید خواہش تھی کہ میری زندگی کا پہلا عمرہ شب قدر میں ہو، شائد ان دنوں میری اس سے بڑی کوئی خواہش نہیں تھی۔

رمضان کے مہینے میں پورے سعودی عرب سے لوگ عمرہ کے لئے جاتے ہیں۔ ان دنوں اہل سعودی عرب کی اس سے بڑی غالباً اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔ ہمارے جاننے والے بیشتر خاندان رمضان کے ابتدائی دنوں میں یا تو عمرہ کرنے جا چکے تھے اور یا عمرہ کر کے واپس آ چکے تھے، ہر خاندان نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر ہم اپنا پروگرام اس لئے مؤخر کر رہے تھے کہ میں شب قدر حرم میں گزارنا چاہتی تھی، جب میری یہ خواہش کسی قدر ضد میں بدل گئی تو سجاد نے اسی اعتبار سے چھٹیوں کے لئے درخواست دی۔

ہم نے لوگوں سے سنا ہوا تھا کہ آخری عشرے میں حرم کا رش حج کے رش سے بس ذرا ہی کم ہوتا ہے۔ اتنے رش میں کیا عبادت کا مزا آئے گا۔ مجھے شک ہی تھا۔ بہر حال وہ دن بھی آ گیا کہ ہم سوئے مدینہ روانہ ہوئے، اس دن تیئسواں روزہ تھا، جمعرات کا دن اور مارچ کی ۲۶ تاریخ تھی۔ تحیۃ السفر پڑھ کر ہم گھر سے نکلے۔ سفر کرنا مجھے ہمیشہ سے پسند رہا ہے خواہ وہ ریل کا سفر ہو، ہوائی جہاز کا، موٹر بوٹ کا یا کار کا۔ اور پھر اگر منزل حرم ہو تو سفر کے کیا کہنے۔ نصف گھنٹے میں ہی ریاض کا خوبصورت رہائشی علاقہ پیچھے رہ گیا اور ہم ہائی وے پر آ گئے جو ایکسپریس کہلاتی ہے اور مدینے تک جاتی ہے۔ سعودی عرب میں آپ کہیں بھی جانا چاہیں بغیر کسی سے پتہ معلوم کیے، صرف سڑک پر لگے ہوئے نیلے بورڈوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہائی وے پر ہر چند کلو میٹر کے فاصلے سے لگے ہوئے نیلے بورڈ آپ کی

رہنمائی کرتے ہیں کہ فلاں شہر آنے میں کتنے کلومیٹر رہ گئے ہیں یا یہ کہ مطلوبہ شہر کتنے کلومیٹر دور ہے بلکہ یہاں تک کہ دو کلومیٹر کے بعد فلاں شہر کے لئے Exit ہے تیار ہو جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

دن چڑھنے کے ساتھ ہی گرمی شروع ہو گئی تھی، چونکہ ہمارا پہلا اتنا طویل سفر تھا لہٰذا ہم سے چند غلطیاں ہوئیں مثلاً پہلی غلطی تو یہی تھی کہ ہم دن کے وقت سفر کر رہے تھے۔ ریاض سے مدینہ کا فاصلہ ۸۴۸ کلومیٹر ہے اور یہ راستہ تقریباً دس گھنٹے کا ہے۔ سعودی عرب میں پڑنے والی قیامت خیز گرمیوں کے پیش نظر لوگ عموماً لمبے سفرات میں کرتے ہیں۔ کیونکہ دن میں اس طرح کے طویل اور مسلسل سفر کے نتیجے میں بعض اوقات گاڑی کے ٹائر پھٹ جاتے ہیں۔ مگر ہم یہ غلطی کرنے پر مجبور تھے کہ میں دن کی روشنی میں راستے کی تمام جزئیات کو دیکھنا اور ذہن میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ رات میں بھلا کیا نظر آتا۔ پھر رات میں صحرائی سفر کی کچھ ایسی ہیبت دل پر بیٹھی ہوئی تھی کہ ان تمام خطرات اور اپنے بہی خواہوں کے پُرخلوص مشوروں کے باوجود ہم نے دن میں ہی سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا۔ ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ گرمی بڑھنے لگی لیکن گاڑی کا اے۔ سی بہت اچھا کام کر رہا تھا۔ سجاد نے Cooling بڑھا دی جس کی وجہ سے گاڑی میں اچھی خاصی ٹھنڈ ہو گئی۔ یہ خیر سے ہماری دوسری غلطی تھی جس کا خمیازہ ہمیں ریاض واپس آنے کے بعد بھگتنا پڑا۔ وہاں لوگ عموماً ہائی۔ وے پر سفر کے دوران یا تو اے۔ سی نہیں چلاتے اور اگر چلاتے ہیں تو بہت وقفے وقفے سے تاکہ انجن پر لوڈ کم رہے۔ ہم نے مسلسل اور متواتر اے۔ سی چلایا اس کی وجہ سے سفر تو بہت اچھا گزرا مگر اس کے نتیجے میں ریاض واپس آنے کے بعد گاڑی ہفتہ بھر ورکشاپ میں رہی۔

اب ہائی وے کے دونوں اطراف صحراؤں کے وسیع سلسلے شروع ہو چکے تھے۔ اور صحراؤں میں کچھ بھی تو نہیں ہوتا، سوائے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی پیلی ریت کے میدان یا پیلی ریت کے ٹیلے۔ زیادہ سے زیادہ اونٹوں کی قطاریں اور یا پھر تیز ہوا کی وجہ سے کہیں کہیں ناچتے ہوئے ریت کے بگولے جنہیں عرب اپنی زبان میں 'غبار شیطان' (Dust Devil) کہتے ہیں۔

ریاض اور قصیم کے درمیان 'المجمعة' کی ایک خوبصورت بستی نظر آئی۔ یہ بہت بڑا نخلستان تھا جہاں کثرت سے کھجور کے درختوں نے بستی کو گھیرا ہوا تھا یہاں جدید اور قدیم کا انتہائی دلچسپ امتزاج دیکھنے میں آیا۔ چند جدید تعمیرات کے علاوہ قدیم طرز کے کچے مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ بعض کچے

مکانوں کے سامنے جدید ویگنیں کھڑی نظر آئیں حالانکہ قاعدے سے یہاں اونٹ کھڑے ہونے چاہیے تھے۔ سچ پوچھیئے تو اس نخلستانی پس منظر میں کھڑی جدید گاڑیاں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ کاش اونٹ یا گھوڑے کھڑے ہوتے تو منظر مکمل ہو جاتا۔ بستی کے باہر ایک صاف ستھری پیلی چٹان پر سفید چونے سے 'المجمعة' لکھا ہوا تھا۔ یہ ننھی منی خوبصورت بستی ریاض اور قصیم کے درمیان ہے۔ یہاں سے قصیم ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

قصیم نجد کا قدیم شہر ہے تاریخ کی کتابوں میں اس شہر کا تذکرہ ملتا ہے۔ سعودی عرب میں قصیم کی وہی حیثیت ہے جو پاکستان میں رائے ونڈ کی ہے، میں سعودی عرب کے اس 'رائے ونڈ' کو بغور دیکھنا چاہتی تھی مگر ہوا یہ کہ قصیم کا شہر آیا اور نکل گیا ہمارا خیال تھا کہ ہم راستے میں پڑنے والے شہروں کے درمیان میں سے گزریں گے لیکن المجمعة کی طرح القصیم بھی ہائی وے سے کئی کلومیٹر اندر ہونے کی وجہ سے دیکھنے سے رہ گیا البتہ ہائی وے پر لگے ہوئے نیلے بورڈ نے بتایا کہ ہمارے داہنی جانب چند کلومیٹر اندر قصیم کا شہر ہے۔

'اب بریدہ آئے گا' سجاد نے اگلے شہر کا نام بتایا۔

'وہ بھی ہائی وے سے اندر کہیں دور ہوگا' میں نے گذشتہ تجربے کی بناء پر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ لیکن ہوا یہ کہ ایکسپریس روڈ بریدہ پہنچ کر ختم ہو گئی اور ہم بریدہ شہر میں داخل ہو گئے۔ یہاں رک کر ہم نے گاڑی میں پٹرول ڈلوایا۔ بلکہ ٹنکی بھروائی گاڑی نے اسّی (۸۰) لیٹر پٹرول ہضم کیا جس پر مبلغ ۴۲ ریال لگے (اس وقت ایک ریال سات روپے کے برابر تھا) اسی لئے کہتے ہیں کہ سعودی عرب میں پانی مہنگا ہے اور پٹرول سستا!

پورے سعودی عرب میں آپ ایک مخصوص 'پٹرول پمپ کلچر' دیکھیں گے۔ سعودی عرب میں، خصوصاً ہائی وے پر پٹرول پمپ کا مطلب، صرف پٹرول پمپ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہوتی ہے، اس بستی میں آپ کو پٹرول پمپ کے ساتھ ایک ریسٹورینٹ یا ہوٹل، خواتین اور مردوں کے الگ الگ بیت الخلاء، مسجد، ورکشاپ اور ایک بقالہ (چھوٹی سپر مارکیٹ) ضرور ملے گا۔ لہٰذا میں نے بچوں کو باتھ روم سے فارغ کرایا، وضو کیا، ظہر کی قصر نماز پڑھی، سپر مارکیٹ سے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں جب میں واپس آئی تو سجاد اس لڑکے سے باتوں میں مصروف تھے جس نے گاڑی میں پٹرول ڈالا تھا بعد

میں سجاد نے مجھے بتایا کہ اس لڑکے کا تعلق حیدرآباد (بھارت) سے تھا۔ وہ بریدہ کے اس پٹرول پمپ پر بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ جس کے عوض اسے سات سو ریال ماہانہ ملتے ہیں۔ سال میں تین ہفتے کی چھٹی پر گھر جاتا ہے اور بس۔

مجھے اس کی محنت اور تنہا زندگی پر دکھ سا ہوا۔

ہماری گاڑی اب بریدہ کے اندر سے گزر رہی تھی یہ پورا علاقہ انتہائی سرسبز و شاداب ہے۔ بڑے بڑے زرعی فارموں پر جدید مشینی طریقے سے آبپاشی کی جا رہی تھی۔ ریاض سے قصیم تک تو سعودی عرب کا روایتی تصور قائم رہتا ہے، مہیب صحراؤں کے طویل سلسلے، اس میں کہیں ریتیلے، کہیں سنگلاخ، بنجر پہاڑ، ریت کے بگولے، خال خال نخلستان، سفید، کتھئی اور سیاہ اونٹ اور بس لیکن بریدہ اور اس کے گردو نواح کے علاقے اس روایتی تصور کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور یہاں نجد کی روایتی سرسبزی عروج پر نظر آتی ہے۔

میں نے بچوں کو گھر کے بنائے ہوئے سینڈوچ، پھل اور جوس کے کین پکڑا دیئے، یہ ان کا دوپہر کا کھانا تھا، ہمیں روزہ کی مشقت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ابتدائی صدیوں میں صحرا کا سفر انتہائی جان لیوا ہوتا تھا۔ سینکڑوں لوگ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی یا راستہ بھٹک کر یا پیاس کی شدت سے مر جایا کرتے تھے، اب سائنس کی ترقی کا عالم ہی اور ہے انہی صحراؤں کے درمیان میں سے سیاہ اسفالٹ کی چوڑی، شفاف سڑک نکلی چلی جا رہی تھی جس پر ہماری گاڑی ایک سو ساٹھ، ایک سو ستر کلومیٹر کی رفتار سے مدینہ کی طرف گویا اڑی جا رہی تھی۔ صحرائی سفر کی کوئی بھی صعوبت تو درپیش نہیں تھی نہ گرم لو کے تھپیڑے، نہ پانی کی کمیابی کا خوف، نہ راستہ بھول جانے کا دھڑکا، اگر فکر تھی تو بس اتنی کہ رات ہونے سے پہلے مدینہ پہنچ جائیں کیونکہ اعصاب پر رات میں صحرا کے سفر کا خوف سوار تھا اور دوسری فکر یہ تھی کہ سجاد کو نیند نہ آ جائے۔ بچے ایک ایک کر کے سو چکے تھے، مجھے بھی غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سچ پوچھیے تو ہم سجاد کی غنودگی تو رہی ایک طرف ہلکی سی جھپکی بھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے ہائی وے پر گاڑیوں کی رفتار ویسے بھی بہت زیادہ رکھنی پڑتی ہے اس میں اگر ڈرائیور اونگھ جائے تو بدترین حادثات ہوتے ہیں اور ان ہائی ویز پر ہونے والے حادثات کا مطلب ہوتا ہے ٹوٹل لاس۔

چار بجے کے قریب ہمیں عصر کی نماز کی فکر ہونے لگی لیکن ابھی دونوں اطراف میں ویران اور

بے آب و گیاہ علاقے تھے جہاں رکنا بے کار تھا۔ ویسے تو ہمارے پاس پانی وافر مقدار میں تھا کہیں بھی وضو کر کے نماز پڑھ سکتے تھے لیکن ہم کسی پٹرول پمپ یا بستی کی آس میں رکے بغیر اڑے جا رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ہمیں آبادی کے آثار نظر آئے، جہاں ایک انتہائی رنگا رنگ عمارت اور ایک مسجد کا گنبد بھی دور سے نظر آ گیا۔ ہم نے گاڑی وہیں روک لی۔ مسجد، جس کا گنبد دور سے نظر آ رہا تھا، ٹریفک پولیس کے ہیڈ کوارٹر کے اندر تھی اور غالباً بند تھی۔ البتہ رنگا رنگ عمارت ایک طرح کا مسافر خانہ نکلی، جہاں خواتین اور مردوں کے لئے الگ الگ غسل خانے اور ٹوائلٹ تھے، نلکوں میں پانی بھی تھا، باہر نہایت خوبصورت سنگی میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور سامنے ہی بچوں کے کھیلنے کے لئے وسیع اور خوبصورت پارک تھا جس میں انواع و اقسام کے جھولے لگے ہوئے تھے یہ اہل بستی کا مقامی پارک بھی ہو سکتا ہوگا جہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا، بہر حال ہم نے ان سہولیات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، بچے پارک میں کھیل کود میں لگ گئے ہم نے عصر کی نماز پڑھی، وضو کرنے سے غنودگی بھی بھاگ گئی اور ہم پھر سے فریش ہو کر سفر کے قابل ہو گئے، چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں ہم پھر سے بے آب و گیاہ، چٹیل صحراؤں کا جزو بن چکے تھے۔ ہائی وے پر ہمارے علاوہ کافی گاڑیاں تھیں جن میں بیشتر میں ملکی اور غیر ملکی مسلم خاندان عمرہ کی غرض سے سفر کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بائیں طرف منجم الصخرات (Gold mines) کا بورڈ نظر آیا، بورڈ سے پتہ چلا کہ سونے کی کانیں، ہائی وے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں، سعودی عرب کے صحراؤں میں اس طرح کی سونے کی کانیں بہت ہیں۔ ایسے صحراؤں میں جہاں سونا موجود ہو زمین کی اوپری سطح قدرے سیاہی مائل ہوتی ہے۔ یہ سیاہی مائل صحرائی علاقہ ہمارے بائیں جانب میلوں پھیلا ہوا تھا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سعودی عرب سیال سونے کے علاوہ ٹھوس سونے کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل اس دولت سے امریکہ کے زیادہ وارے نیارے ہو رہے ہیں۔

شام ہونے لگی تھی۔ سعدیہ ایک مزید نیند لے کر اٹھ چکی تھی۔

'امی ہم کہاں جا رہے ہیں'۔

'رسول اللہ ﷺ کے پاس'۔

'رسول اللہ ﷺ اتنی دور کیوں رہتے ہیں؟ میں تو تھک گئی ہوں''۔

'بس بیٹے اب ہم پہنچنے والے ہیں تھوڑا صبر کرو، بہت ثواب ملے گا'۔ میں نے سعدیہ کو تسلی دی۔

'سب سے زیادہ ثواب مجھے ملے گا'۔ سجاد نے سعدیہ کو چھیڑا 'اور سب سے کم سعدیہ کو ملے گا'۔

سعدیہ احتجاجاً پچھلی سیٹ پر اچھل کر کھڑی ہوگئی اور سجاد کا گلا دبوچ لیا۔

'ارے بیٹے، مجھے چھوڑ دو، نہیں تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے کے بجائے ہم سیدھے اللہ میاں کے پہنچ جائیں گے'۔

سجاد کی اس بات پر ہمیں ہنسنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اونٹ سڑک پار کر رہے تھے سجاد نے گاڑی بہت آہستہ کردی۔ یہ بہت رسکی معاملہ ہوتا ہے۔ کئی دفعہ ان اونٹوں کی وجہ سے بڑے خطرناک حادثے ہوئے ہیں۔ حکومت نے ہائی وے پر دونوں جانب تقریباً پانچ فٹ اونچی لوہے کے تاروں کی باڑ لگائی ہوئی ہے تاکہ اونٹ جو صحرا میں پھر رہے ہوں سڑک پر نہ آجائیں۔ مگر کہیں کہیں جہاں باڑھ ٹوٹ گئی ہے اونٹ سڑک پر آجاتے ہیں جو بعض اوقات اچانک بدک کر بھاگنے کی وجہ سے بہت سے حادثات کا باعث بن جاتے ہیں۔ بہر حال جب اونٹ سڑک پار کر گئے تو سجاد نے پھر رفتار بڑھادی۔ افطار کا وقت قریب آرہا تھا۔ ویسے تو میرے پاس روزہ افطار کرنے کا سارا سامان موجود تھا مگر اچھا تھا کہ کوئی شہر یا پیٹرول پمپ آجاتا۔

مغرب کا وقت ہونے ہی والا تھا، میں صحرا میں ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہی تھی کہ ہمارے بائیں جانب ایک چھوٹا سا شہر 'الشقران' آیا۔ ہم یہیں رک گئے، مسجد اور ہوٹل کے پیچھے باتھ روم بھی بنے ہوئے تھے بچے گاڑی سے اتر کر کھیل کود میں لگ گئے، ہمارے علاوہ بھی چار پانچ گاڑیاں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے میدان میں ادھر ادھر پارک تھیں، یہ سب ہی روزہ افطار کرنے کے لئے یہاں رک گئے تھے۔ میں وضو کر کے واپس گاڑی میں آبیٹھی جب ہی مغرب کی اذان ہوئی۔ ہم نے کھجوروں سے روزہ افطار کیا، پھر سجاد نماز پڑھنے کے لئے مسجد چلے گئے، میں نے بچوں کے خیال سے وہیں گاڑی کی اوٹ میں نماز پڑھ لی، پھر ہوٹل سے گرما گرم چائے منگوا کر پی اور پھر وہی ہم اور مدینے کا سفر!

اندھیرا اترنے لگا تھا۔ مدینہ اب بھی ڈیڑھ، دو سو کلومیٹر دور تھا گویا اب بھی دو گھنٹے باقی تھے۔

مدینہ سے چند کلومیٹر قبل پھر ایک 'پٹرول پمپ بستی' نظر آئی۔

''چائے پیو گی''۔ سجاد نے پوچھا

''دل تو چاہ رہا ہے مگر اور دیر ہو جائے گی''

''کوئی بات نہیں، اب تو دیر ہو ہی چکی ہے'' سجاد نے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی۔ حسب سابق بچے گاڑی سے اتر کر بھاگ دوڑ میں لگ گئے، سجاد ہوٹل کے اندر ہی ہوٹل والے سے گپ شپ میں لگے ہوئے تھے۔ میری چائے گاڑی میں ہی آگئی، میں نے دو کپ چائے پی اور خاصی فریش ہوگئی۔

اس کے بعد پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔

'ہوٹل محمد افضل کا ہے'۔ سجاد ہوٹل والے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگے 'سرائے عالمگیر کا رہنے والا ہے، کہنے لگا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں لہٰذا چائے کے پیسے بھی نہیں لئے'۔

'' یہ تو زیادتی ہے''۔

''ابو مدینہ کیوں نہیں آرہا''۔ ثناء تھک کر بولی

''بس بیٹے ایک گھنٹے کی ڈرائیو اور ہے''

مدینہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر پہلے ایک چیک پوسٹ ہے۔ یہاں سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ صرف مسلمان ہی مدینہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لئے بغلی سڑک سے مدینہ کے باہر سے رستہ دوسری طرف مڑ جاتا ہے۔

چیک پوسٹ گذر گیا اور اب سفر اختتام کے قریب تھا رات کے نو بج رہے تھے، غالباً نہیں بلکہ یقیناً مسجد نبوی میں عشاء کی نماز ختم ہو چکی ہوگی اور اب تراویح چل رہی ہوگی۔ گاڑی اسی رفتار سے بھاگ رہی تھی سڑک پر رش کم تھا، البتہ ہائی وے پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے رات تاریک تھی۔ ہمارے دونوں جانب مہیب پہاڑوں کے سلسلے تھے شائد دن میں یہ پہاڑ اتنے ڈراؤنے نہ لگتے لیکن اس وقت تو یہ اونچے ڈراؤنے سیاہ بھوتوں جیسے پہاڑ اعصاب کو تھکا دینے کے لئے کافی تھے۔ سجاد کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں، وہ گذشتہ دس گھنٹے سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ شائد میں بھی اچھی ڈرائیور ہوں مگر اس سلسلہ میں ان کی کوئی مدد اس لئے نہیں کر سکتی تھی کہ یہ سعودی عرب تھا جہاں خواتین گاڑیاں نہیں چلا سکتیں۔ مجھے سعودی عرب کے اس قانون کے پیچھے خاص عرب ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ عرب اپنی عورتوں کے بارے میں ہمیشہ سے انتہائی غیرت مند رہے ہیں۔ خواہ عہد جاہلیت ہو، صدر اسلام ہو یا بیسویں صدی۔ ان کی اسی بے جا غیرت نے بیٹیوں کو زندہ زمین میں گڑوا دیا۔ اور یہی شدید غیرت عورتوں کو جائز حد تک آزادی دینے کی بھی روادار نہیں۔ ورنہ پاکستان میں میں نے بہت سی باپردہ خواتین کو شہروں میں گاڑی دوڑاتے دیکھا ہے

جو مکمل پردے میں ہوتی ہیں اور صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی ہوتی ہیں۔

خلیج کی جنگ کے بعد سعودی عرب میں امریکی عمل دخل بڑھا اور ان کی بعض عورتیں گاڑیاں چلاتی دیکھی گئیں۔ سعودی خواتین نے بھی اپنے لئے یہ حق حاصل کرنا چاہا خصوصاً کام کرنے والی عورتوں (Working Women) نے اس سلسلے میں الجزیرہ سوپر مارکیٹ، جو ہمارے گھر سے نزدیک ہی ہے، کے آگے مظاہرہ کیا، وہ خواتین باپردہ تھیں، اور اپنے لئے ڈرائیونگ کا حق مانگ رہی تھیں۔ اگلے دن ان سب خواتین کے دفاتر میں ان کی برطرفی کے احکامات (Termination Letters) پہنچ گئے جس پر فوری عمل درآمد کرتے ہوئے ان سب خواتین کو نکال دیا گیا حالانکہ وہ سب بڑی بااثر خواتین تھیں، بیشتر ڈاکٹر تھیں جن کی ملک کو شدید ضرورت تھی، اور آج بھی وہ اپنی لیڈی ڈاکٹروں کی ضرورت کو دوسرے ممالک سے پوری کرتے ہیں۔

'ایک دفعہ ٹھہر کر ہاتھ منہ دھولو، تمہاری آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں، کہیں نیند نہ آ جائے'۔ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

'نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں'۔

'بچو! اب جو روشنی آئے گی وہ شہر مدینہ کی ہوگی'۔ سجاد نے اعلان کیا۔

'شہر مدینہ' !!

ایک نہایت خوشگوار احساس جاگا، مدینہ جہاں کے چپے چپے پر اور اینٹ اینٹ پر اسلامی تاریخ کھدی پڑی تھی، یہی وہ پیارا شہر تھا جو ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کو خواب میں بطور ان کی ہجرت گاہ کے دکھایا گیا تھا۔ یہی وہ خوبصورت شہر تھا جس نے حیرت انگیز سرعت سے اسلام قبول کیا۔ یہیں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑی، یہیں اسلام کو حقیقی شان و شوکت نصیب ہوئی۔ دین کے تمام تفصیلی احکامات یہیں نازل ہوئے اور دین اسلام اپنے کمال کو پہنچ گیا، کافروں اور یہودیوں سے ساری جنگیں آپ ﷺ نے یہیں سے لڑیں۔ باوجود اس کے کہ مکہ فتح ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ وہاں رہنے کے بجائے مدینہ واپس آئے، یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ یہیں آپ ﷺ کا روضہ اور آپ ﷺ کی مسجد ہے جو اس وقت ہماری منزل تھی۔

'کیا یہ مدینہ کی روشنیاں ہیں'۔ بہت دور اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کو دیکھ کر میں نے سجاد سے

پوچھا۔

'نہیں ایسا تو نہیں لگتا'۔ سجاد نے روشنیوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ 'مدینہ تو بڑا شہر ہے، شائد یہ کوئی چھوٹا نواحی قصبہ ہو'۔

روشنیاں نزدیک آ رہی تھیں اور پھر وہ واقعی کوئی چھوٹا سا نواحی قصبہ ہی نکلا۔

'چائے تو نہیں پینا'۔

'نہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو پی تھی، البتہ اگر تمہیں فریش ہونے کے لئے ------'

'نہیں نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں'۔

واقعی ہم سب ہی بالکل ٹھیک تھے اور بس مدینہ کا انتظار تھا۔

....

مدینہ کو عہد رسالت ﷺ میں جو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ سیدنا عثمانؓ کے دور تک رہی۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے یہیں سے مرتد قبائل کا استیصال کیا، سیدنا عمرؓ نے یہیں سے اپنی فوجیں عراق، ایران اور شام و مصر کی طرف روانہ کیں۔ سیدنا عثمانؓ یہیں عربی فتنے کا شکار ہو کر بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، یہ پہلا بھیانک واقعہ تھا جو مدینہ میں پیش آیا اس کے بعد مدینہ کو کئی بار مبتلائے آزمائش ہونا پڑا۔ سیدنا علیؓ کی خلافت کے دوران مرکزیت کوفہ کو حاصل رہی، اور جب ان کی شہادت کے بعد سیدنا حسن ابن علیؓ نے امیر معاویہؓ سے مصالحت کر لی تو مرکز خلافت دمشق منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد مدینہ کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی ہو کر رہ گئی اگرچہ اس کی علمی اور دینی مرکزیت بہر حال اب بھی باقی تھی، یہ حرم تھا جہاں صحابہ کرام کی خاصی تعداد موجود تھی۔ چنانچہ اسلامی فتوے اور احکامات مدینہ ہی سے سارے ممالک میں جاتے تھے۔

حضرت امیر معاویہ نے بنی ہاشم اور انصار کو راضی رکھنے کی کوشش کی اور حسن سلوک اور تحمل سے اہل مدینہ کو خوش یا کم از کم خاموش رکھا لیکن ان کا بیٹا یزید بن معاویہ ان کی اس سیاست کو نہ نبھا سکا۔ یزید ہی کے زمانے میں سانحہ کربلا پیش آیا جس کی وجہ سے اہل مدینہ جنھوں نے یزید کی خلافت خوشدلی سے قبول نہیں کی تھی، اموی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلاب کو کچلنے کے لئے یزید نے مسلم بن عقبہ المعری کو دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ اہل مدینہ نے بڑی جرات و پامردی سے مقابلہ کیا

لیکن آخر شکست کھائی یہ اگست ۶۸۳ء کا واقعہ ہے۔ شامی فوجیں، جن میں شامی عیسائیوں کی بھی بڑی تعداد تھی تین دن تک مدینۃ النبی کو لوٹتی رہیں۔ سینکڑوں افراد جن میں اچھی خاصی تعداد صحابہ کرام کی تھی، واقعہ حرہ کے دوران قتل ہو گئے جس شہر میں ۳۴ھ کے آخری دنوں میں ایک خلیفہ رسولؐ کو مظلومانہ شہید کیا گیا تھا، وہی مدینہ محض تیس سال بعد خاک و خون میں نہا گیا نہ کسی کا جان و مال محفوظ رہا نہ عزت و آبرو۔

یزید کی موت کے بعد اہل مدینہ پھر عبداللہ ابن زبیرؓ کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن ان کی شکست کے بعد حجاز پر دوبارہ اموی اقتدار قائم ہو گیا اس سانحہ کے بعد بہت سے اعیان و عمائدین مدینہ یہاں سے ہجرت کر گئے تاہم بیشتر اموی خلفاء کا رویہ اہل مدینہ کے ساتھ اچھا رہا۔ اسلامی فتوحات کے بعد حجاز میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ رہا۔ بنوامیہ کے آخری زمانے میں قوم کے بعض طبقے عیش و عشرت میں ڈوب کر غنا اور موسیقی کی طرف مائل ہو گئے۔ حکومت وقت کا منشا بھی یہی تھا کہ قریشی امراء لہو لعب میں منہمک ہو کر سیاسی مشاغل سے دست بردار ہو جائیں۔ چنانچہ حجازی امراء کو گرانقدر وظائف سے نوازا جاتا تھا۔ اس عیش کوشی سے مکہ اور مدینہ دونوں ہی شہروں میں غنا اور موسیقی کی خوب ترقی ہوئی۔ قسم قسم کی راگنیاں، تانیں اور سر ایجاد ہوئے اور گانے والی باندیوں کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام ہونے لگا تاہم مدینہ کی علمی حیثیت بہر حال مقدم رہی۔

اس ضمن میں امام مالکؒ کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے وہ بھی اپنے لڑکپن میں مدینہ کے گانے والوں کے پیچھے لگ گئے، شکلاً اتنے وجیہہ نہیں تھے، ان کی والدہ ان کی یہ لت چھڑانا چاہتی تھیں لہذا انہیں سمجھایا کرتیں۔

'بیٹے گانے والا اگر خوش شکل نہ ہو تو لوگ اس کی طرف التفات نہیں کرتے، جبکہ علم و فضل ایسی چیز ہے جہاں شکل و صورت نہیں دیکھی جاتی۔

اس بات کا امام مالکؒ پر اثر پڑا اور وہ مدینے کے گانے والوں کا پیچھا چھوڑ کر مسجد نبوی کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگے اور پھر جس مقام تک پہنچے وہ آج سب کو پتہ ہے۔

....

میں نے گھڑی دیکھی، پھر گاڑی کے بند شیشوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی تاریکی میں بھلا کیا نظر آتا۔ اچانک بہت دور جگمگاتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دور دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں۔ یقیناً یہ

کوئی بڑا شہر تھا، کوئی چھوٹا نواحی قصبہ نہیں ہو سکتا۔

'کیا یہ مدینہ ہے'۔ میں نے سجاد سے پوچھا

'ہاں میرا خیال ہے ہم پہنچ رہے ہیں۔

'مدینہ آ گیا'۔ ہمارے دل اچھل پڑے، عجیب غیر یقینی کی سی کیفیت تھی۔

'پہلے مسجد نبوی چلیں گے' سجاد کہہ رہے تھے 'تم تھکی تو نہیں ہو'۔

'نہیں بالکل نہیں'۔ ہم سب کی تھکن غائب ہو چکی تھی 'مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے گاڑی روک لینا سجاد، میں وضو کروں گی۔' رسول اللہ ﷺ کا شہر آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا شہر آ گیا'۔ بچوں نے نعرہ بازی شروع کر دی تھی۔

کچھ آگے جا کر سجاد نے کچے میں اتار کر گاڑی روک دی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا، خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جسم سے ٹکرا گیا۔

یہ مدینہ کی ہوا تھی!

انتہائی لطیف اور انتہائی خوشگوار

ہم سب نے وضو کیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

چند منٹ کے بعد ہم مدینہ میں داخل ہو چکے تھے۔

مدینۃ النبی ﷺ

ریاض کے مقابلے میں مدینہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ نہ اس کی سڑکیں زیادہ چوڑی ہیں اور نہ ہی ریاض کی طرح جدید اور خوبصورت عمارتیں، اور ہیڈ برج اور انڈر گراونڈ راستے ہیں لیکن پھر بھی یہ شہر انمول ہے اور شہروں کا شہر ہے ہر شہر کا نعم البدل ہو سکتا ہے مدینہ کا نہیں۔

مرکزی شاہراہ پر لگے ہوئے نیلے بورڈ اب ہماری توجہ کے مرکز تھے جو مسجد نبوی کی طرف ہماری راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ہم لحہ بہ لحہ مسجد نبوی سے قریب ہو رہے تھے۔ میرے چاروں طرف شہر مدینہ بکھرا پڑا تھا اس مدینے سے یکسر مختلف جو عہد رسالت کا مدینہ تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک عروج پر تھا قرن اولی کے مدینہ کی سڑکیں، کچی اور سنگریزوں کی گزرگاہیں ہوا کرتی تھیں جن پر اونٹ اور گھوڑے چلا کرتے تھے، میرے سامنے سیاہ اسفالٹ کی چمچماتی، شفاف سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا جس پر کاریں، بسیں، ویگنیں اور ٹیکسیاں بھاگتی پھر رہی تھیں، ٹریفک سگنل راہنمائی کر رہے تھے اور سڑک پر روشنی کا بہترین انتظام تھا، رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا راتوں کو گلیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا تھا الا یہ کہ دس سے بیس تاریخوں کا چاند نکلا ہوا ہو۔ مگر اس اندھیرے کے باوجود وہ اندھیری راہوں کے مسافر نہ تھے۔

اور تمام تر روشنیوں کے باوجود ہم اندھیری راہوں کے مسافر ہیں۔

اچانک میری نظر بلند بالا عمارتوں سے پرے ٹھنڈی سفید روشنی میں نہائے مسجد نبوی کے میناروں پر پڑی اور میں دم بخود رہ گئی مجھے میناروں کا صرف اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔ جن سے ایک عجیب سی سبز اور سفید آسودہ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مسجد نبوی کے امام صاحب کی آواز اب سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔ نماز تراویح ہو رہی تھی۔ مگر مسجد کے پاس ہمیں کہیں پارکنگ نہیں ملی۔ ایک پارکنگ لاٹ میں ہم اپنی وسیع وعریض کیڈیلاک سمیت گھس تو گئے مگر اچھی طرح پھنس گئے۔ بمشکل تمام گاڑی وہاں سے نکلی۔

"اپنی شیراڈ ہی اچھی ہے"۔ میں نے اپنی کراچی والی چھوٹی گاڑی یاد کی "جہاں مرضی ہے پارک کر لو اور تنگ سے تنگ جگہ میں پوری گاڑی گھما لو"۔

"جی میڈم بہت صحیح کہا آپ نے، لیکن اس شیراڈ میں آپ دس گھنٹے مسلسل سفر کر کے ریاض سے مدینہ آ سکتی ہیں"۔ سجاد نے جل کر جواب دیا۔

آہستہ آہستہ گاڑی، پارکنگ کی تلاش میں مسجد نبوی سے دور ہوتی جا رہی تھی بالآخر ایک میدان میں جگہ مل گئی۔ ہم سارا سامان گاڑی میں ہی چھوڑ کر مسجد کی طرف چل پڑے مدینہ میں ٹھنڈ تھی میں نے چلتے چلتے ثناء کو اپنی شال اوڑھا دی تھی راستے میں سجاد نے ہدائتیں دینی شروع کر دیں۔

"میں سعود کو اپنے ساتھ رکھوں گا تم ثناء اور سعدیہ کے ساتھ مسجد میں چلی جانا اور نماز پڑھ کر باب رحمت کے سامنے میرا انتظار کرنا"۔

"باب رحمت کہاں ہے"۔ میں پریشان ہو گئی۔

"گنبد خضرا کے ساتھ"

"اور یہ گنبد خضرا کہاں ہے"۔ میں مزید بوکھلا گئی۔ سجاد تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئے خاصا گمبھیر مسئلہ تھا نیا شہر، رش کا بے پناہ عالم، نہ شمال کا پتہ نہ جنوب کا، اگر ہم بچھڑ گئے تو کیا ہوگا، ان دونوں بچیوں کو لے کر میں کہاں جاؤں گی۔

لوگ ابھی تک نماز تراویح میں شرکت کے لئے مسجد کی طرف رواں دواں تھے فٹ پاتھ پر بہنے والے اس انسانی سیلاب میں ہم بھی بہہ رہے تھے۔ بالآخر مسجد نبوی آ گئی نرمی، آسودگی، ٹھنڈک اور راحت عطا کرنے والی سوہنی سجل مسجد نبوی۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہم اس مسجد میں داخل نہ ہو سکے۔ رش کا یہ عالم تھا کہ لوگ مسجد کے باہر صفیں باندھے ہوئے تھے۔ باب النساء کے قریب خواتین کی صفیں پھیلتے پھیلتے سڑک کے کنارے تک آ گئی تھیں۔

"تم یہاں نماز پڑھو اور یہیں رہنا، میں نماز پڑھ کر ادریس کو تلاش کرنے جاؤں گا اور پھر یہیں سے تمہیں لوں گا۔ یہاں سے ہلنا نہیں"۔ سجاد ہدایات دے کر سعود کو لے کر چلے گئے۔

یہ سڑک کا کنارا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا بہت رش تھا، جس سے بچنے کے لئے لوگ فٹ پاتھ پر چڑھ آتے تھے۔ جہاں عورتوں نے صفیں باندھی ہوئی تھیں۔ یہ صورت حال مجھے کچھ اچھی نہ لگی لہذا میں

سرکتے سرکتے دیوار سے جا لگی۔ میرے پاس جاء نماز بھی نہیں تھی لہٰذا ثناء سے شال مانگی۔ شال بچھا کر ایک طرف سعدیہ کو بٹھا دیا اور میں نے اور ثناء نے نماز کی نیت باندھ لی، سعدیہ تھکی ہوئی تھی، شال پر ہی لیٹ گئی ٹریفک کا شور، آنے جانے والوں کے مکالمے میری توجہ خراب کر رہے تھے۔ میں نماز میں مشغول تھی کہ اچانک سعدیہ شال پر سے اٹھی اور تیر کی طرح سڑک کی طرف بھاگ گئی، یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی، کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحہ سجاد کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو میری جان میں جان آئی اور میں سمجھ گئی کہ سعدیہ اپنے ابو کو دیکھ کر بھاگی تھی۔ چنانچہ باقی نماز توجہ سے ادا کرنے کے بعد جب میں نے سلام پھیرا تو فٹ پاتھ پر سجاد اور ادریس بھائی کو کھڑے دیکھا۔ ادریس، سجاد کے خالہ زاد بھائی ہیں اور اپنی ملازمت کے سلسلے میں مدینہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے مسجد کے ٹیلی فون بوتھ کے آگے ملنے کا وقت دیا تھا۔ جہاں وہ حسب وعدہ مل گئے تھے۔ مدینہ میں ہمیں مختار بھائی کے فلیٹ میں ٹھہرنا تھا، مختار بھائی سجاد کے ماموں زاد بھائی ہیں جن کی بیوی شاہین، ادریس بھائی کی بڑی بہن ہیں۔ مسجد میں حاضری دینے کے بعد اب ہمیں گھر ہی جانا تھا۔

''گھر نزدیک ہی ہے'' سلام دعا کے بعد ادریس بھائی نے ہمیں اطلاع دی۔ ''گاڑی وہیں چھوڑ دیں، صبح لے آئیں گے، اب گھر چلتے ہیں''۔

سڑک عبور کر کے ہم مدینہ کے بازار میں داخل ہو گئے یہاں رات میں دن کا سماں تھا۔ دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی جگ مگ کرتی دکانیں اور گلیوں میں خریداروں اور آنے جانے والوں کا رش۔ صفائی کے عملے کی مصروفیات، سعودی عرب کے مختلف شہروں میں آپ کو صفائی کا عملہ جگہ جگہ نظر آئے گا۔ خصوصا حرمین شریفین میں، مدینہ کا بازار دوسرے بازاروں سے مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڑی حویلی کے صحن میں پھر رہے ہیں۔ جہاں دوکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ پختہ اور شفاف گلیوں سے گزرتے، بازار کی رونقیں دیکھتے ہم موڑ پر موڑ کاٹ رہے تھے۔ اچانک سعدیہ ٹھنک کر رک گئی۔ وہ بہت دیر سے تھکن کا اظہار کر رہی تھی اور اب شائد اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔

''بس بیٹا، اب تو گھر تھوڑی دور ہے''۔ میں نے سعدیہ کو بہلایا کہ اسے گود میں اٹھانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''آپ اتنی دیر سے کہہ رہی ہیں کہ گھر آنے والا ہے۔ آنے والا ہے کہاں ہے گھر''۔ وہ بگڑ گئی بلکہ اینٹھ گئی اور آگے چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ ادریس بھائی نے سعدیہ کو فوراً گود میں اٹھا لیا، اور

سعدیہ کہ گویا اسی انتظار میں تھی جلدی سے گود میں چڑھ، ادریس بھائی کے کندھے پر سر ڈال دیا۔

سعود بڑی بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا، ابھی تک اس نے ایک دفعہ بھی تھکن کا اظہار نہیں کیا تھا البتہ ثناء نے سعدیہ کو گود میں چڑھے دیکھ کر بڑی حسرت سے کہا ''امی اگر میں بھی سعدیہ کے برابر ہوتی تو ابو کی گود میں چڑھ جاتی''۔

گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں پندرہ منٹ لگ گئے۔ مختار بھائی ان دنوں جس فلیٹ میں تھے وہ چھٹی منزل پر تھا۔ لفٹ کے ذریعہ اوپر پہنچے اور ایک کشادہ اور صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ گھر والوں سے ملاقات رہی۔ پھر ہم بچوں کے کمرے میں آ گئے جہاں ہمارے بستر لگے ہوئے تھے۔ اگلے دن چوبیسواں روزہ تھا سحری کے لئے اٹھنا تھا لہٰذا ہم جلدی ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔

مختار بھائی نے سحری کے وقت دروازہ کھٹکھٹایا تو ہماری آنکھ فوراً کھل گئی، رات مجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آئی تھی، یہ ایک عجیب سا احساس جاگتا رہا تھا کہ ہم شہر مدینہ میں ہیں۔ کچھ یقین اور کچھ غیر یقینی کی سی کیفیت، کچھ ناقابل بیان سے احساسات نے رات ٹھیک طرح سے سونے نہیں دیا تھا، بہر حال چونکہ وقت کم رہ گیا تھا لہٰذا ہم جلدی سے اٹھ بیٹھے۔ شاہین باجی باورچی خانے میں مصروف تھیں، سحری لگانے میں ان کے ساتھ مدد کی ابھی سحری کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اذان کی آواز آئی چائے کے آخری گھونٹوں کے ساتھ ہم نے پیالیاں رکھ دیں۔ میں برتن سمیٹنے لگی تو مختار بھائی نے شور مچایا۔

''بھئی اگر آپ لوگوں کو مسجد نبوی میں نماز پڑھنی ہے تو فوراً نکلیں، میں آپ لوگوں کو تھوڑی دور تک چھوڑ دیتا ہوں، یہ برتن شاہین اٹھا لیں گی، آپ لوگوں کی نماز نکل جائے گی''۔

میں برتن چھوڑ کر وضو کرنے چلی گئی۔

مختار بھائی کی گاڑی میں میں، سجاد اور مختار بھائی کا بیٹا فواد نماز فجر کے لئے چلے۔ وہ عجیب ہی سماں تھا، دھند لکے کے سمے میں، مدینہ کی گلیوں میں گھروں کے دروازے کھل رہے تھے، لوگ نکل رہے تھے، رش کا یہ عالم تھا کہ سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ گاڑی چلانا دشوار تھا، گاڑی کی رفتار دیکھتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم پیدل اس سے زیادہ تیزی سے مسجد پہنچ جائیں گے۔ مختار بھائی نے جلد ہی ایک جگہ ہمیں گاڑی سے اتار دیا۔ فواد ہمارے ساتھ تھا تاکہ ہم لوگ واپسی میں کہیں گھر کا راستہ نہ بھول جائیں۔

ہم تیزی سے مسجد نبوی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ فجر کا وقت یونہی بہت سہانا ہوتا ہے:

کہ مدینہ کی گلیاں ہوں اور اس شہر مقدس کی انتہائی خوشگوار ہوائیں۔ جلد ہی مسجد نبوی کے ٹھنڈے مینار اور ان سے پھوٹنے والی دلربا سبز روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ مسجد کے اندر جگہ مل جائے لیکن جب ہم باب النساء پر پہنچے تو ہم نے مسجد کے باہر خواتین کی صفیں دیکھیں۔ مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔

''میرا خیال ہے تمہیں اندر جگہ نہیں ملے گی' سجاد نے کہا 'انہی خواتین کے ساتھ باہر ہی نماز پڑھ لو پھر باب النساء کے نیچے ملنا''۔

باب النساء کے آگے ایک بہت بڑا سبز روشنی والا بورڈ لگا ہوا تھا ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہمیشہ ہی یہاں ملیں گے۔ اس دفعہ میں جائے نماز لیتی آئی تھی لہٰذا مسجد کے باہر بہت ساری خواتین کے درمیان میں بھی اپنی جاء نماز پر کھڑی ہوگئی۔ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی، پھر امام صاحب کے ساتھ دو رکعت فرض، پھر میں سنتوں کی ادائیگی میں تھی کہ خواتین نے واپس جانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے ایک بدنظمی سی پیدا ہوگئی، نماز کی ادائیگی دشوار ہوگئی، سجدہ کرنے سے قبل کتنی ہی دیر بیٹھی رہتی کہ سامنے والیاں گزر جائیں تو سجدہ کروں، مگر گزرنے والیوں کا کوئی رش تھا۔ اگر گزرنے والیوں سے بے پرواہ ہو کر سجدہ کرتی تو کسی صحت مند خاتون کے قدموں تلے آ کر روندے جانے کا احتمال تھا۔ بہر حال اس دن یہ سبق ملا کہ یہاں صرف فرض کی ادائیگی کرنی چاہیے اور سنتیں گھر جا کر پڑھنی چاہیں اِلاّ یہ کہ کوئی اچھی جگہ مسجد کے اندر مل جائے اور جہاں روندے جانے کا خطرہ نہ ہو۔

بمشکل تمام دو سنتیں ادا کر کے جاء نماز کو تہہ لگاتے ہوئے میں باب النساء کے بورڈ کے نیچے آ کھڑی ہوئی۔ سجاد سڑک پر کھڑے آتی جاتی خواتین میں 'مطلوبہ خاتون' کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کر رہے تھے میں نے سجاد کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ سجاد نے بھی جب مجھے دیکھ لیا تو ہاتھ ہلایا۔ ہاتھ یوں ہلایا کہ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے باقی رہ گیا معاملہ ایک دوسرے کے پاس پہنچنے کا تو وہ اس اژدھام میں جب ممکن ہوگا پہنچ جائیں گے۔

میں آہستہ آہستہ راستہ بناتی ہوئی سڑک کی طرف بڑھتی رہی بالآخر چند منٹ کے بعد میں ان لوگوں تک پہنچ گئی۔

'آؤ اب جنت البقیع چلیں' سجاد نے میرے قریب پہنچنے پر کہا 'داہنی جانب دیکھنا جب سبز

گنبد نظر آئے تو رسول اللہ ﷺ کو سلام کرنا'۔

میں ایک دم ہی مؤدب ہوگئی اور گردن مسلسل داہنی جانب مڑ کر رہ گئی۔ تھوڑی ہی دور چلیں ہوں گے کہ اچانک سبز گنبد نظروں کے سامنے تھا ''السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' میں نے منہ ہی منہ میں رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ ایک لمحہ رکی، گنبد خضریٰ کو نظر بھر کر دیکھا اور پھر آگے بڑھ جانا پڑا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم قدرے بلند جگہ پر آ گئے۔ یہاں بائیں جانب ایک وسیع احاطہ تھا۔ یہ جنت البقیع تھا جسے بقیع الغرقد بھی کہتے ہیں اگر آپ جنت البقیع کی طرف منہ کریں تو آپ کی پشت پر چند سو گز کے فاصلے پر گنبد خضرا ہے۔

گنبد خضریٰ ترکوں کی تعمیر ہے۔ مسجد نبوی کے دالانوں کے اندر وہ سبز گنبد والا روضہ اقدس جس کی زمین کی فضیلت بقول مشہور محدث قاضی عیاض مالکی، روئے زمین سے بڑھ کر ہے۔ روضہ مبارک کی عمارت تیس، پینتیس فٹ لمبی اور اس سے کچھ کم چوڑی ہے۔ جہاں آج گنبد خضرا ہے وہاں کبھی حجرہ عائشہ صدیقہؓ تھا، رسول اللہ ﷺ کو وہیں دفن کیا گیا تھا جہاں ان کی وفات ہوئی تھی۔ حجرہ عائشہؓ کچا تھا بعد میں اسے پختہ کر دیا گیا۔ اس کے گرد سیسہ بھری ہوئی گہری بنیادوں کے اوپر ایک پختہ چار دیواری ہے جو حجرہ عائشہ صدیقہؓ کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ روضہ کے چاروں طرف لوہے اور پیتل کی جالیاں اور جنگلے ہیں۔ اس کے ارد گرد ہر طرف کافی کھلا اور پختہ راستہ چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ مسجد میں آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ اسی گنبد خضریٰ کے اندر رسول اللہ ﷺ کے علاوہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ بھی محو استراحت ہیں۔

جنت البقیع

گنبد خضریٰ کے بالکل مدمقابل چند سو گز کے فاصلے پر جنت البقیع ہے، عہد رسالت میں یہ قبرستان مدینہ سے باہر تھا۔ آج دیکھئے تو وسط مدینہ میں ہے۔ یہ اہل مدینہ کا قدیمی قبرستان ہے جو عہد جاہلیت سے چلا آ رہا ہے اس میں بہت سے صحابہ کرام، ازواج مطہرات، تابعین عظام، آئمہ کبار اور بے شمار شہداء وصلحاء کے مزار ہیں قبرستان کو ایک چار دیواری سے گھیرا گیا ہے سیمنٹ کی چار دیواری کے اوپر لوہے کے جنگلے لگائے گئے ہیں تاکہ زیارت کرنے والے زیارت کر سکیں اور فاتحہ پڑھ لیں

''تم یہاں سے فاتحہ پڑھ لو''۔ سجاد مجھ سے کہہ رہے تھے ''ہم اندر سے ہو کر آتے ہیں''۔ فواد کو لے کر سجاد جنت البقیع کے دروازے کی طرف بڑھ گئے اور ہجوم میں نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں نے دل لگا کر جنت البقیع کی ہزاروں سعادت مند روحوں کے لئے دعا کی اور اس کے بعد قبرستان کی جزئیات کو نظروں ہی نظروں میں سمیٹنا شروع کیا۔ یہ قطعۂ زمین مدینہ میں شائد چند ہی مقامات میں سے ایک مقام ہے جو اپنی اصل حالت پر قائم ہے، جو جدید تعمیرات سے بے نیاز جوں کا توں ہے۔

کاش پورا مدینہ ہی جوں کا توں ہوتا مگر شائد یہ ممکن نہ تھا۔

ایک دعا پڑھانے والا میرے قریب ہی جمع ہونے والی زائر خواتین کو دعا پڑھا رہا تھا۔ قابل زیارت مقامات پر اس طرح سے دعا پڑھانے والے آپ کو اکثر ملیں گے۔ یہ زائرین کو موقع کی دعائیں پڑھاتے ہیں جس کے عوض زائرین انہیں چند ریال دے دیتے ہیں۔ خشخشی داڑھی، گہرے سانولے رنگ، اور ادھیڑ عمر کا وہ شخص جو دعائیں پڑھا رہا تھا۔ میرے خیالات کو مجتمع ہونے نہیں دے رہا تھا سو میں چند قدم آگے بڑھ گئی۔

تاریخ کے صفحے پلٹنے شروع ہو گئے تھے!

جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہے جنت البقیع میں دفن ہونے والے سب سے پہلے صحابی حضرت عثمان ابن مظعونؓ تھے۔ ان کا وصال ہو جانے پر صحابہ کرام نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ

نقشہ جنت البقیع
دیوار فعلی بقیع
درب بستہ
شارع ستین
حضرت ابوسعید خدری
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت فاطمہ بنت اسد
رضی اللہ تعالیٰ عنہا والدہ محترمہ
حضرت علی المرتضیٰ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
دیوار قبلی بقیع جمع
امیر المؤمنین
حضرت عثمان غنی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت بی بی
حلیمہ سعدیہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہا
حدود اولیہ بقیع
شہدائے احد
حضرت سیدنا ابراھیم
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم
درب بستہ
حضرت امام نافع
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت امام مالک
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
ازواج مطہرات
امہات المؤمنین
حضرت سودہ
حضرت جویریہ
حضرت عائشہ
حضرت حفصہ
حضرت ام حبیبہ
حضرت ام سلمہ
حضرت صفیہ
حضرت زینب
رضی اللہ تعالیٰ عنہن
درب بستہ
حضرت عبد اللہ بن
جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(حضرت علی کے بھتیجے)
حضرت عقیل بن ابیطالب
رضی اللہ تعالیٰ عنہ (حضرت علی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی)
حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
درب ورودی
شمال
دختران رسول صلی اللہ علیہ وسلم
۱- حضرت زینب
رضی اللہ تعالیٰ عنہا
۲- حضرت ام کلثوم
رضی اللہ تعالیٰ عنہا
۳- حضرت رقیہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہا
پھوپھی جان
نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم
سیدنا
حضرت عباس
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت فاطمۃ الزھرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا
صاحبزادی رسول صلی اللہ علیہ وسلم
ام البنین مادر حضرت ابوالفضل
شارع اباذر
نگہبانی

113/2105

ان کی تدفین کہاں کی جائے تو آپ ؐ نے انہیں بقیع میں دفن کرنے کی ہدایت کی۔ رسول اللہؐ کی چاروں صاحب زادیاں بھی یہیں مدفون ہیں۔ بیویوں میں حضرت خدیجہ اور حضرت میمونہ کے سوا ساری ازواج مطہرات یہیں دفن ہیں۔ اب تو حضرت عثمان کی قبر بھی بقیع کے احاطہ میں آ گئی ہے ورنہ بلوائیوں کے خوف سے آپ کو 'حش کوکب' میں دفن کیا گیا تھا یہ بقیع سے متصل آبان بن عثمان کا باغ تھا۔ بعد میں بقیع کی توسیع کی وجہ سے حضرت عثمان کی قبر بقیع کے اندر آ گئی تھی اور موجودہ سعودی توسیع کے باعث آپ کی قبر تقریباً وسط میں پائی جاتی ہے۔

میں نے ایک نظر قبرستان کے اندر ڈالی بعض قبروں کے پاس بہت رش تھا، بعض قبروں کے پاس کوئی بھی نہیں تھا اور بعض قبروں پر چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ کس طرف کس کی قبر ہے کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے، قبروں کی تفصیلات سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں سجاد اور فواد واپس آ چکے تھے۔

''وہ دیکھو'' سجاد نے اس طرف اشارہ کیا جہاں خاصا رش تھا ''وہاں حضرت فاطمہ کی قبر ہے''۔

''اور وہ'' انہوں نے دوسری طرف اشارہ کیا وہاں بھی بہت رش تھا ''وہاں رسول اللہؐ کی ازواج کی قبریں ہیں اور اس طرف'' سجاد نے بائیں جانب قدرے دور اشارہ کیا جہاں رش لگا ہوا تھا ''وہاں حضرت عثمان دفن ہیں''۔

''تمہیں کیسے پتہ''؟

''اندر مقامی لوگ ہیں جو زائرین کو اطلاعات فراہم کر رہے ہیں''۔

اور میں سوچتی رہی خداوندا کیسی کیسی عظیم ہستیاں آسودہ خاک ہیں کنز العمال میں رسول اللہؐ کا یہ فرمان ملتا ہے 'قیامت کے دن جنت البقیع سے ستر ہزار افراد اٹھیں گے جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے اور وہ خوش نصیب بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے'۔

میں نے دل ہی دل میں متعدد بار یہ دعا کی کہ خدا کرے میری تدفین بھی جنت البقیع میں ممکن ہو سکے۔ (آمین۔ ثم آمین)

گنبد خضریٰ کے دامن کی ہوا مانگی ہے
ہم نے مرنے کی مدینہ میں دعا مانگی ہے

جنت البقیع میں آج بھی تدفین ہوتی ہے اس کے عقبی حصے میں ایک وسیع احاطہ ایسا ہے جہاں مدینہ میں وفات پانے والوں کو جگہ دی جاتی ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات میرے ہاں رسول اللہ آرام فرما رہے تھے کہ اچانک آپ اٹھے اور باہر تشریف لے گئے۔ میں بھی دبے پاؤں آپ کے پیچھے چل دی میں نے گمان کیا کہ آپ کسی دوسری بیوی کے ہاں جانا چاہتے ہیں لیکن آپ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ وہاں دیر تک کھڑے رہے، آپ نے تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر اہل بقیع کے لئے دعا کی اور پھر واپس ہوئے۔ میں بھی جلدی میں پلٹی اور آپ سے پہلے گھر پہنچ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ رہی۔ جب آپ تشریف لائے تو میرے جسم میں اضطراب کے آثار محسوس کر کے پوچھا ''عائشہ کیا بات ہے''۔

میں نے سارا واقعہ سنایا۔

آپ فرمانے لگے 'وہ سیاہی جسے میں نے اپنے سامنے محسوس کیا تھا تم ہی تھیں۔

میں نے عرض کیا 'ایسا ہی تھا'۔

اس پر آپؐ نے اپنا دست شفقت میرے سینے پر رکھتے ہوئے فرمایا 'کیا تم نے گمان کیا کہ خدا اور اس کا رسولؐ تمہارے ساتھ ناانصافی کریں گے؟

میں نے عرض کیا 'خدائے قدوس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے بات تو ایسی ہی تھی اور یہ سب بشری تقاضے سے ہوا ہے'۔

اس پر رسول اللہ نے فرمایا جبرئیل امین آئے تھے باہر سے آواز دی اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ آپ بقیع کی زیارت کو جائیں اور ان کے لئے دعا استغفار کریں، میں نے سمجھا کہ تم سو رہی ہو، لہٰذا خاموشی سے چلا گیا۔ (مسلم ونسائی)

اگر آج آپ جنت البقیع کے سامنے کھڑے ہوں تو گنبد خضریٰ (یعنی حجرہ عائشہؓ) سامنے نظر آتا ہے عہد رسالت ﷺ میں یہ صورت حال نہیں تھی، اس وقت یہی جنت البقیع، مدینہ سے باہر تھا، جہاں تنگ تنگ گلیوں سے ہو کر ہی پہنچا جاتا تھا۔ آج جنت البقیع اور روضہ رسولؐ کے درمیاں کوئی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ ساری گلیاں اور سارے راستے بلڈوزروں کے نیچے کچلے گئے۔

۵۹ء میں جب مولانا مودودی نے ان علاقوں کا سفر کیا تھا تو جنت البقیع تک کے راستے کی جو

صورت حال تھی وہ محمد عاصم صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔

''اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان ہم مدینہ منورہ کے قبرستان البقیع کی زیارت کے لئے گئے جو مسجد نبوی سے مشرق کی طرف واقع ہے اور معمولی رفتار سے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ پہلے بقیع جانے کو بہت سی گلیوں سے گذرنا پڑتا تھا مگر اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی کھلی اور پختہ سڑک بنادی ہے۔ جس سے بقیع آنا جانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ (سفرنامہ ارض القرآن ص ۲۳۷)

دس سال کے بعد ۱۹۶۹ء میں جناب شورش کاشمیری مرحوم جب ان راستوں سے گذرے تو صورت حال یہ تھی

''جنت البقیع، حرم نبوی کے مشرق کی جانب دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ باب عثمان سے سیدھی سڑک پر ایک چوک ہے اس کے دائیں طرف تھوڑے سے فاصلے پر جنت البقیع ہے۔ دوسرا راستہ باب جبرئیل اور باب النساء کے سامنے کی ایک کھدار گلی سے نکلتا ہے۔ یہ گلی قدیم الایام سے ہے گمان ہوتا ہے کہ رسول اللہ اسی راستہ سے آتے جاتے ہوں گے''۔ (شب جائے کہ من بودم ص ۱۶۱)

ان بیانات کی روشنی میں یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ خاصی بہادر خاتون تھیں، جو رسول اللہ ﷺ کو بستر میں نہ پا کر باہر نکل گئیں، جہاں مدینے کی گلیاں گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں وہ گلیوں سے ہوتی ہوئی، دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے حدود مدینہ سے باہر بقیع الغرقد جا پہنچیں جہاں رسول اللہ کو دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی، اور پھر واپس بھی ان کے ہمراہ نہ آئیں بلکہ ان سے پہلے پہلے واپس آ کر چپ چاپ لیٹ گئیں۔

'چلو اب چل کے گاڑی لے آتے ہیں'۔ سجاد کہہ رہے تھے۔

ہم جنت البقیع سے واپس ہوئے اور سڑک پر آنے کے بعد اس میدان کی طرف چل پڑے جہاں کل گاڑی پارک کی تھی۔ صبح کا تڑکا، شہر مدینہ کی رحمت و ٹھنڈک، صبح کی خوشگوار ہوا میں وہ چہل قدمی شائد مجھے کبھی نہ بھولے۔ جب ہم اس پارکنگ لاٹ میں پہنچے جہاں کل رات تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہاں اب چار پانچ گاڑیاں دور دور کھڑی تھیں انہی میں ایک ہماری سیاہ کیڈی لاک بھی تھی۔

''ہاں بھئی فواد صاحب آپ کو مسجد قبا کا راستہ پتہ ہے؟'' سجاد نے فواد سے پوچھا۔

''جی ہاں پتہ ہے۔'' فواد نے اعتماد سے جواب دیا اور ہم کم عمر فواد کی راہبری میں مسجد قبا کی طرف چل پڑے۔

مسجد قبا

قبا کی بستی مدینہ منورہ سے جنوب مغربی جانب کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، رسول اللہؐ کے زمانے میں یہ بستی مدینہ سے باہر تصور کی جاتی تھی آج کل قبا مدینہ کے اندر ہے، سعودی حکومت نے شاندار سڑکوں کا جو جال بچھایا ہوا ہے اس کی وجہ سے دس پندرہ منٹ میں مسجد نبوی سے مسجد قبا پہنچا جا سکتا ہے۔ صبح کے وقت سڑکوں پر ٹریفک کا رش بہت کم تھا ہم فواد کی راہبری میں مسجد قبا کی طرف بڑھ رہے تھے ایک جگہ راستے میں چند بہت ہی گھنے کھجور کے باغات نظر آئے۔

''یہ حضرت سلمان فارسی کا باغ ہے نگار''۔ سجاد نے مجھے اطلاع فراہم کی۔

''حضرت سلمان فارسی کا باغ''۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔

''ہاں مقامی لوگوں کا یہی کہنا ہے، پچھلی دفعہ جب میں مدینہ آیا تھا تو مجھے پتہ چلا تھا''۔

باغ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا، اس طرح کے باغات مدینہ میں کئی ہیں، ان باغات کے درمیان ہی صاحب باغ کا مکان بنا ہوتا تھا، پتہ نہیں اب بھی یہی طرز ہے یا نہیں، باغ اس قدر گھنا تھا کہ اندر کا بھید کھلتا نہیں تھا، مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ حضرت سلمان فارسی ایک آزاد کردہ غلام تھے جنہیں رسول اللہؐ نے مکاتبت کی رقم ادا کر کے آزاد کرایا تھا۔ اگر باغ کی ملکیت کی خبر صحیح تھی تو پھر یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں حضرت سلمان کی معاشی حالت خاصی بہتر ہوگئی ہوگی۔ صدر اسلام میں یہ باغات ہی اہل مدینہ کی روزی کا ذریعہ ہوا کرتے تھے اہل مکہ کے برخلاف اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے۔

جلد ہی ہم مسجد قبا پہنچ گئے وہ بستی، اور اہل بستی کی وہ مسجد جس کی تعریف قرآن میں یوں آئی ہے

'البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد روز اول سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی
وہ زیادہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں
وہاں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں

اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(سورۃ توبہ ۱۰۸)

میں نے سر اٹھا کر اور نظر بھر کر مسجد قبا کو دیکھا، عہد رسالت کی یہ پہلی مسجد مربع شکل کی ہے جس کے چاروں کونوں پر مینار بنے ہوئے ہیں۔ متعدد ادوار میں تعمیر و توسیع کے متعدد مراحل سے گذرنے کے بعد آج جو مسجد قبا نظروں کے سامنے تھی وہ جدید طرز تعمیر کا نمونہ ہونے کے باوجود انتہائی سادگی کا تاثر لئے ہوئے تھی۔

رسول اللہؐ ۸۔ ربیع الاول ۱۳ نبوی بمطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء قبا میں تشریف لائے، اس وقت یہ بستی مدینہ سے باہر تھی اور یہاں انصار کے کئی خاندان آباد تھے، ان میں سب سے بااثر خاندان بنی عمرو بن عوف کا تھا۔ رسول اللہؐ چودہ دن تک بنی عمرو بن عوف کے سردار کلثوم بن الہدم کے گھر مہمان رہے، انہی صاحب کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں خشک کی جاتی تھیں، اسی زمین پر مسجد قبا کی تعمیر شروع کی گئی۔ اس تعمیر میں رسول اللہ بھی عام مزدور کی طرح از اول تا آخر شامل رہے۔ شاعر اسلام سیدنا عبداللہؓ ابن رواحہ بھی اس تعمیر میں شریک تھے۔ جس طرح مزدور لوگ تھکن مٹانے اور حوصلہ جوان رکھنے کے لئے دوران مزدوری کچھ گنگنایا کرتے ہیں اسی طرح تعمیر مسجد کے دوران عبداللہ ابن رواحہ بھی اشعار پڑھا کرتے:

''مسجد تعمیر کرنے والا کامیاب ہے
جو اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے
اور رات عبادت میں جاگ کر گذارتا ہے

لطف کی بات یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے تھے۔ جو مسجد تیار ہوئی وہ ایک چھوٹی سی، اور انتہائی سادہ مسجد تھی، جس کا طول اور عرض تقریباً سو فٹ اور بلندی تقریباً ۲۸ فٹ تھی، جب کہ صحن مسجد تقریباً ۱۵۷ فٹ لمبا اور ۲۶ فٹ چوڑا تھا۔ اور جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں فرش مسجد کچا تھا۔۔۔۔ اس کے مقابلے میں جو مسجد آج میری نگاہوں کے سامنے تھی وہ انتہائی وسیع و عریض، کشادہ اور پرشکوہ تھی۔ ظاہر ہے چودہ سو سالوں میں اس کی متواتر توسیع ہوتی رہی ہے۔

سب سے پہلے سیدنا عثمانؓ کے عہد خلافت میں عمارت کی تجدید و توسیع ہوئی۔ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے گورنر ہوئے تو انہوں نے نئی عمارت

تعمیر کی۔ عثمانی سلطان محمود خان نے ۱۸۳۱ء (۱۲۴۶ھ) میں اس کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔ جدید توسیع جو خادم حرمین شریفین کے احکام سے کی گئی ہے کھلے صحن کو شامل کر کے ۴۶۵ ۷ مربع میٹر ہے۔ جس میں دس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔ ساری مسجد مرکزی طور پر ائرکنڈیشنڈ ہے۔ رات میں میناروں پر روشنیاں ملکوتی حسن بکھیرتی ہیں۔

پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کر کے اب ہم مسجد میں داخل ہونے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

''تم عورتوں والے حصے میں چلی جانا، نماز پڑھ کے یہیں ملنا''۔ مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سجاد کی ہدایات شروع ہوگئیں۔

اس مسجد میں ادائیگی نماز کا بہت اجر بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ کا یہ معمول تھا کہ ہر ہفتے کے دن مدینہ سے قبا آیا کرتے تھے کبھی پیدل اور کبھی سواری پر اور مسجد قبا میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ ابن ماجہ اور سنن ترمذی میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے

'مسجد قبا میں نفل نماز پڑھنا عمرہ کے ثواب کے برابر ہے'۔

قرآن میں مسجد قبا کی جو فضیلت بیان ہوئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے سیدنا عمرؓ کہا کرتے تھے

''اگر مسجد قبا زمین کے کسی انتہائی دور مقام پر واقع ہوتی تب بھی ہم اس کی زیارت کے لیے سفر کرتے اور اونٹوں کے جگر فنا کر دیتے''۔

کیا جذبہ تھا!

آج کل تو سفر اتنا آسان اور برق رفتار ہو گیا ہے کہ نہ اونٹوں کے جگر فنا کرنے پڑتے ہیں نہ مہینوں کی مسافتیں طے کرنی ہوتی ہیں۔ اب تو مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لمبی چوڑی شاندار، اے۔ سی کار یا کوچ میں بیٹھیے، چمچماتی اسفالٹ کی سڑکوں پر فرانے بھرتی آپ کی گاڑی یا کوچ دس منٹ میں آپ کو مدینہ سے لا کر مسجد قبا میں پارکنگ لاٹ پر لا دھرے گی۔

چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم مسجد کے بیرونی صحن میں داخل ہوئے، یہاں کئی سیاہ فام عورتیں چادریں بچھائے چھوٹی موٹی چیزیں بیچتی نظر آئیں۔ سر کے رومال، کانوں کے بندے ہار، چوڑیاں، کڑے، اٹنج کی چپلیں، رومال، تسبیح، مسواک اور اسی طرح کی بہت سی دوسری چیزیں۔ ان پر ایک
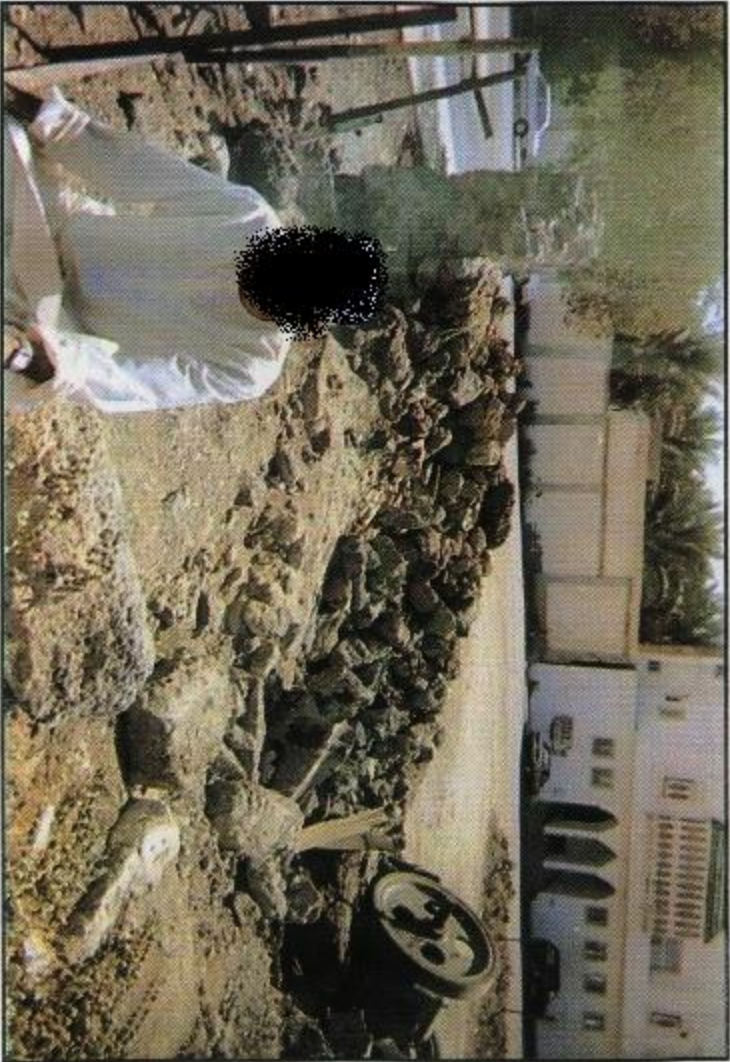
مسجد قبا کے باہر وہ جگہ جہاں منافقوں نے مسجد ضرار بنائی تھی، قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

طائرانہ نظر ڈالتی میں 'مصلی النساء' کی طرف بڑھ گئی۔ خواتین کا حصہ اوپر تھا، سیڑھیاں چڑھ کر جب میں اوپر کے کشادہ حصے میں داخل ہوئی تو چند عورتیں عبادت میں مصروف نظر آئیں۔ میں بھی تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد نفل نمازوں میں مصروف ہوگئی اس خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا جس نے مجھ ایسی گنہ گار کو اس قدر بابرکت مقام پر بلایا۔ یہ جگہ اتنی پُر سکون تھی کہ واپس جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہم شاہین باجی کو بتا کر نہیں آئے تھے، انہیں فواد کی فکر ہو سکتی تھی لہٰذا ہم جلدی واپس جانا چاہتے تھے میں نے اٹھنے سے قبل پھر خدا سے دعا کی کہ مجھے یہاں پھر بھی آنا نصیب ہو۔ قبولیت کا وقت تھا یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ میں چند مہینوں کے بعد پھر مدینہ میں تھی اور ایک بار پھر مسجد قبا میں محو عبادت ہوگئی۔

جب میں واپس آئی تو مقررہ جگہ پر سجاد اور فواد کو اپنا منتظر پایا۔

''تمہیں مسجد بنی سالم بھی دکھا دوں جہاں رسول اللہؐ نے پہلا جمعہ پڑھا تھا''۔ سجاد نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

'کہیں ہم راستہ نہ بھول جائیں' میں نے خدشہ کا اظہار کیا۔

''آپ فکر نہ کریں چچی جان، ہم راستہ نہیں بھولیں گے، یہ مسجد رستے میں ہی آتی ہے''۔ فواد نے کمال اطمینان سے مجھے تسلی دی۔

مسجد قبا سے مدینہ منورہ کی طرف واپس آتے ہوئے تقریباً ایک میل کے بعد سڑک داہنی طرف مڑتی ہے، اسی سڑک پر داہنی جانب یہ مسجد واقع ہے جسے 'مسجد جمعہ' بھی کہتے ہیں۔

چودہ دن قبا میں قیام کرنے کے بعد جمعہ کے دن جب کہ کافی دن نکل چکا تھا آپؐ عازم مدینہ ہوئے۔ وہ مہاجرین جو مکے سے ہجرت کر کے قبا میں قیام پذیر تھے، اور جن میں سے اکثر کی میزبانی کلثوم بن الہدم ہی نے کی، وہ سب بھی رسول اللہؐ کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے جب آپ بنو سالم بن عوف کے محلے میں پہنچے تو نماز کا وقت ہو چکا تھا چنانچہ آپ نے اپنے سو ہم سفروں کی معیت میں وہیں جمعہ کی نماز ادا کی۔ بنی سالم کے محلے میں پہلے سے ہی ایک چھوٹی سی مسجد، نصف قد آدم تک پتھروں سے بنی موجود تھی۔ اس کا نام نجیب تھا۔ وہیں رسول اللہ نے پہلا جمعہ پڑھا تو یہ مسجد 'مسجد جمعہ' کے نام سے مشہور ہوگئی۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ آج بھی جمعہ ہی تھا اور ہم مسجد جمعہ کی زیارت جمعہ والے دن ہی کر رہے تھے۔

''یہ ہے مسجد جمعہ''۔ سجاد نے داہنی جانب اشارہ کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار بالکل کم کر دی
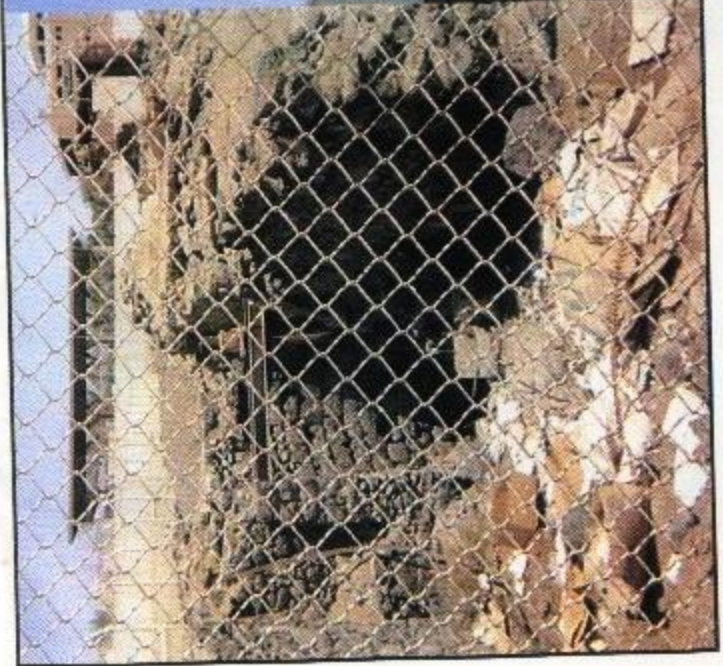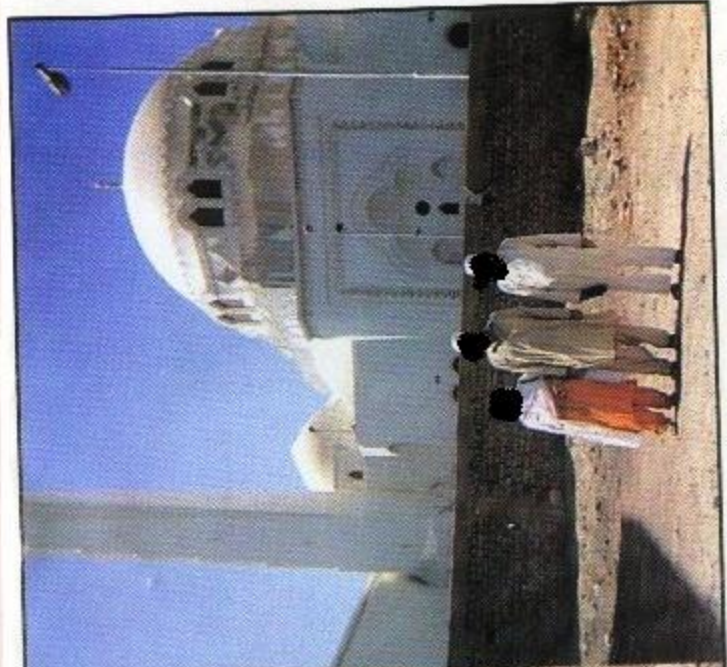
مسجد جمعہ کے قریب وہ جگہ جہاں انصاری بچیوں نے دف بجا کر رسول کریم ﷺ کا استقبال کیا تھا
(عبدالوہاب سلیم اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ)

باغ سلمان فارسی میں ان کے کنویں کے آثار ابھی تک موجود ہیں

یہ ایک چوکور مگر چھوٹی مسجد تھی جس کے درمیان میں گنبد بنا ہوا ہے، پہلے شائد یہ مسجد سنسان جگہ پر رہی ہو، جیسا کہ بعض سفرناموں سے اندازہ ہوتا ہے محمد عاصم صاحب نے سفرنامہ ارض القرآن میں مسجد جمعہ کی جو تصویر دی ہے اس میں مسجد کے گرد دوہرا احاطہ دکھایا گیا ہے، اور اردگرد کھجور کے باغات ہیں، جگہ خاصی ویران سی ہے یہ تصویر یقیناً ۱۹۶۹ء کی ہے، بیس بائیس سال بعد اب جو مسجد جمعہ میرے سامنے تھی اس کے اردگرد جدید تعمیرات ہو چکی ہیں اور مسجد عین محلے کی آبادی کے درمیان میں آ گئی ہے، دوہرا احاطہ بھی ختم ہو چکا ہے اور گرداگرد کھجور کے باغات بھی۔

مسجد بالکل سفید رنگ کی تھی جس سے پاکیزگی اور نفاست جھلک رہی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اس مسجد میں بھی کچھ سجدے ادا کیے جاتے مگر وہی گھر جلدی جانے کی فکر نے ہمیں رکنے نہیں دیا۔ جلد ہی ہم مدینہ میں داخل ہو گئے۔ مختار بھائی نے فی الوقت جو فلیٹ لیا ہوا تھا وہ مسجد اجابہ کے پاس تھا۔ کل ادریس بھائی یہ سبق پڑھا چکے تھے کہ اگر آپ لوگ گھر کا راستہ بھول جائیں تو کسی سے بھی مسجد اجابہ کا پتہ معلوم کر لیں جہاں سے گھر بالکل نزدیک تھا۔ کل بھی گھر جاتے ہوئے مسجد اجابہ پر ایک نظر ڈالی تھی مگر وہ نظر طائرانہ اور تھکی ہوئی تھی۔ لہٰذا آج مسجد اجابہ پہنچ کر میں نے بھرپور انداز میں اسے دیکھا، کل رش بھی بہت تھا آج سناٹا تھا۔ اگر آپ مسجد اجابہ سے مسجد نبوی جائیں تو تقریباً بارہ منٹ لگتے ہیں بشرطیکہ چال میں قدرے تیزی ہو عہد رسالت ﷺ میں یہ ایک انصاری خاندان، بنو معاویہ بن مالک بن عوف کا محلہ تھا ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم عوالی کی طرف تشریف لے گئے اور جب بنو معاویہ کی مسجد پہنچے تو یہاں دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد دیر تک دعا میں مشغول رہے، اس موقع پر رسول اللہؐ نے اللہ تعالی سے اپنی امت کے لئے تین دعائیں مانگیں جن میں سے دو دعائیں قبول ہوئیں ایک قبول نہیں ہوئی، رسول اللہؐ نے پہلی دعا یہ فرمائی کہ اے اللہ میری امت پر کفار کو غلبہ نہ دینا۔ دوسری دعا یہ تھی کہ میری امت کو قحط کے ذریعہ ہلاک نہ کرنا، اور تیسری دعا جو قبول نہیں کی گئی یہ تھی کہ میری امت آپس میں جنگ وجدل اور قتل وقتال نہ کرے (موطاء امام مالک، کتاب سیرۃ النبی، باب دعاء النبی) البتہ مسلم میں پہلی دعا مختلف ہے مسلم کی حدیث کے مطابق رسول اللہ کی پہلی درخواست یہ تھی کہ میری امت کو اجتماعی قحط سالی میں مبتلا نہ کیا جائے دوسری دعا یہ تھی کہ انہیں غرق عام سے ہلاک نہ کیا جائے، یہ دونوں درخواستیں قبول ہو گئیں۔ تیسری درخواست جو قبول نہیں کی گئی یہ تھی کہ میری امت میں باہمی اختلافات اور خانہ جنگی نہ ہو۔

رسول اللہ کی دو دعاؤں کی قبولیت کی وجہ سے اس مسجد کا نام 'مسجد اجابہ' مشہور ہو گیا تاہم اسے مسجد بنی معاویہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کی چھت گنبد نما ہے۔ ہم مسجد اجابہ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکے تھے، تاہم میرے دل میں ملال تھا 'خدا جانے رسول اللہ کی تیسری دعا قبول کیوں نہ ہوئی۔

''یہ دعا تو قبول ہو ہی نہیں سکتی تھی'' میں نے سوچا جیسے بچوں کی اکثر کہانیوں میں ہوتا ہے کہ آخرکار شہزادے کی شہزادی سے شادی ہو جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے ہیں۔ اور پھر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی کہانی تو ابھی شروع ہوئی تھی، اگر یہ دعا قبول ہو جاتی اور مسلمان باہمی اتفاق ومحبت کی وجہ سے ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے تو کہانی نہ ختم ہو جاتی! ابھی تو کہانی کار نے اس کہانی کو ہزاروں موڑ عطا کرنے تھے، چنانچہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہونے کے فقط پچیس سال بعد مسلمانوں میں اس فتنے نے جنم لیا جس نے تیسرے خلیفہ راشد، سیدنا عثمانؓ ابن عفان کو شہید کر دیا، عراق میں پھوٹنے والے اس پہلے عربی فتنے نے جب مدینہ کی راہ لی تو ہوا یوں کہ یہ مدینہ جو حرم بھی تھا، یہیں حرام مہینے میں ایک انتہائی محترم جان تیسرے خلیفہ راشد، رسول اللہ کی دو بیٹیوں کے شوہر، ذوالنورین (دو نور والے) کو شہید کیا گیا جس کے نتیجے میں فقط ڈھائی برس کے عرصے میں پچاس ہزار سے زائد مسلمان جنگ جمل اور جنگ صفین میں ہلاک ہوئے۔ اور اس کے بعد آپس کے جدال وقتال اور خانہ جنگی کا یہ سلسلہ بلا رکے متواتر جاری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
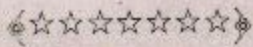
مسجد نبوی

وہ جمعہ کا دن تھا، مسجد قبا کی زیارت کے بعد جب ہم گھر آئے تو سب سوئے ہوئے تھے لہٰذا ہمیں بھی اپنی سابقہ تھکن اتارنے کا موقع مل گیا لہٰذا بستروں پر گر کر لمبی تان کر سو گئے۔

پونے گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو فوراً جمعۃ الوداع کا خیال آیا، نماز کے لئے اگر بہت پہلے سے نہیں چلے گئے تو پھر وہی سڑک پر جگہ ملے گی جب کہ اب میں ہر قیمت پر مسجد نبوی کے اندر نماز پڑھنا چاہتی تھی لہٰذا تاخیر کیئے بغیر بستر چھوڑ دیا، بچوں کو اٹھایا، برق رفتاری سے تیاری کی جس کے نتیجے میں ساڑھے گیارہ بجے تک مسجد پہنچ گئے۔ ساتھ میں شاہین باجی بھی تھیں، سعود اپنے ابو کے ساتھ تھا جب کہ ثناء اور سعدیہ ہمارے ساتھ تھیں۔ جلدی جانے کا ایک سب سے اچھا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں مسجد کے اندر بہت کھلی جگہ مل گئی۔

میں مسجد نبوی کو پہلی دفعہ اندر سے دیکھ رہی تھی اس قدر وسیع و عریض مسجد کہ ہزاروں افراد کو اپنے اندر سمیٹنے کے باوجود جگہ ہی جگہ اور راستے ہی راستے تھے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لئے وسیع و عریض دروازے، طول و طویل راہداریاں، مضبوط ستونوں پر جمی ہوئی انتہائی مرصع چھت، نازک اور خوبصورت فانوسوں کی قطار، فرش مسجد پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھی ہوئی سرخ و سنہری قالینیں، راہداریوں میں رکھے ہوئے اورنج کولروں کی قطار، ان میں بھرا ہوا آب زم زم، سنہری جالی دار الماریوں میں رکھے ہوئے قرآن پاک کے ان گنت نسخے۔

یہ سب کچھ بہت اچھا تھا، بہت ہی اچھا مگر کتنا مختلف تھا، کس قدر مختلف!!

میرا دماغ پھر چودہ سو سال پیچھے چلا گیا۔

جب رسول اللہ قبا سے روانہ ہو کر جمعۃ المبارک کے دن ۲۲ ربیع الاول (یعنی ۴/۱ اکتوبر ۶۲۲ء) کو شہر مدینہ میں داخل ہوئے، اہل مدینہ دورویہ آپ کے استقبال کے لئے کھڑے تھے اور بنو نجار کی معصوم

لڑکیاں گا رہی تھیں:

کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
چودہویں کا چاند طلوع ہو گیا
ہم پر خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے
جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

مدینہ کا ہر قبیلہ شرف میزبانی حاصل کرنے کے لئے اپنی بے قراری کا اظہار کر رہا تھا لیکن جب ناقہ رسول حضرت ابوایوبؓ انصاری کے گھر کے سامنے آ رکا تو گویا میزبان کا بھی فیصلہ ہو گیا اور پہلی مسجد مدینہ کی جگہ کا بھی تعین ہو گیا۔

رسول اللہ کی اونٹنی جس جگہ بیٹھی تھی اور جس کے جنوب کی سمت حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا۔ یہ اسعد ابن زرارہ کے زیر کفالت دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، اس افتادہ زمین میں کچھ قبریں تھیں، کھجور کے درخت تھے، شمالاً جنوباً بہنے والا ایک برساتی نالہ تھا۔

تاہم رسول اللہ کی مدینہ آمد سے قبل اسی زمین پر اسعد ابن زرارہ اور دیگر مسلمانان مدینہ نماز پڑھا کرتے تھے گویا رسول اللہ کی آمد سے قبل بھی یہ جگہ بطور سجدہ گاہ کے استعمال ہوتی تھی لہٰذا رسول اللہؐ نے اسی جگہ کو مستقلاً مسجد کے طور پر پسند فرمایا۔ سہل اور سہیل سے درخواست کی یہ زمین انہیں بیچ دیں، دونوں یتیم مسلمان بچوں نے قیمت لینے سے انکار کرتے ہوئے ویسے ہی یہ زمین رسول اللہ کو دے دی، لیکن رسول اللہؐ نے یتیم بچوں کی زمین کو بلا قیمت لینا گوارا نہ کیا اور بہ اصرار اس کی قیمت ادا کی، تقریباً ۱۰۵ مربع فٹ کی یہ زمین دس دینار میں مول لی گئی، یہ دس دینار سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے ادا کئے۔

اس کے بعد اس افتادہ زمین کو ہموار کیا گیا، برساتی نالے کو پاٹ دیا گیا اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کی تاریخ ۴ ربیع الثانی (یعنی ۱۶/۱ اکتوبر ۶۲۲ء) بتائی جاتی ہے۔ تعمیر مسجد کے لئے کچی اینٹیں بنانے کا انتظام جنت البقیع کے مشرق میں بیرِ ایوب کے قریب کیا گیا تھا۔ صحابہؓ رسول اللہؐ وہاں سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے رسول اللہ بھی عام مزدوروں کی طرح یہ کام کر رہے تھے، اور گانے والے گا رہے تھے:

جو آدمی اٹھتے بیٹھتے تعمیر مسجد میں مصروف ہے
اور جو شخص اپنے کپڑوں کو مٹی اور غبار سے بچاتا ہے
دونوں کب برابر ہو سکتے ہیں؟

مسجد کی بنیادیں پتھروں سے اٹھائی گئیں، دیواریں کچی اینٹوں سے بنیں، مسجد کے تین دروازے رکھے گئے ایک جنوب میں دوسرا مغرب کی طرف باب عاتکہ، جسے باب الرحمت بھی کہا جاتا تھا، اور تیسرا مشرق کی جانب باب عثمانؓ جہاں سے آپ عموماً مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے۔

پھر جب بیت المقدس کی جگہ بیت اللہ، قبلہ مقرر کیا گیا تو آپؐ نے جنوبی دروازہ بند کر کے اس کے مدمقابل شمال کی طرف دروازہ بنا دیا جب کہ دوسرے دونوں دروازے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ مسجد کی مشرقی جانب اسی تعمیراتی مسالے سے دو جھونپڑیاں، رسول اللہؐ کی ازواج، حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور حضرت عائشہؓ بنت ابوبکر کے لئے بنائی گئیں، ان کے دروازے صحن کی جانب کھلتے تھے اور ان میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مسجد مربع شکل کی تھی جس کا طول و عرض ۱۰۵ فٹ تھا دیواروں کی بلندی قد آدم سے کچھ زیادہ تھی۔ مسجد کا فرش کچا تھا اور چھت نہیں تھی، بعد میں جب صحابہ کرامؓ گرمی کی شدت سے دو چار ہوئے تو آپؐ سے مسجد کی چھت بنانے کی اجازت چاہی، اجازت ملنے پر صحابہؓ نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھجور کے ستون کھڑے کئے اور ان کے اوپر کھجور کی لکڑی، شاخیں اور اذخر، گھاس وغیرہ ڈال دی۔

پھر کھجور کی شاخیں غائب ہو گئیں
اذخر اور گھاس کی چھت اڑ گئی
کچا فرش کہیں دب گیا
کھجور کے تنے کھو گئے
کچی اینٹیں، پختہ دیواروں میں ڈھل گئیں
اور
صحن مسجد کی کنکریاں سنگ مرمر بن گئیں

میں چودہ سو سال کے سفر سے واپس آچکی تھی، خدایا یہ سب کچھ کتنا مختلف تھا۔

"تحیۃ المسجد پڑھ کے نوافل ادا کرلیں، ابھی تو خاصا وقت ہے" شاہین باجی مجھے ہدایت دے کر نماز میں مشغول ہو گئیں، ثناء نے بھی نیت باندھ لی البتہ سعدیہ دوسری بچیوں کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھی، گھر کا سا سماں تھا کچھ خواتین جماعت کھڑی ہونے کے انتظار میں وہیں قالینوں پر سو گئی تھیں کچھ تلاوت میں مصروف تھیں، کچھ نمازوں میں اور کچھ باتوں میں، میں نے تحیۃ المسجد پڑھ کے نوافل کی ادائیگی شروع کر دی۔

مسجد نبوی میں نماز کی بے حد فضیلت آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد خاصا مشہور ہے:

'میری اس مسجد میں ایک نماز، دوسری مساجد میں پڑھی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل و بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے' (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

کنز العمال میں یہی بات اور تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:

'میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مساجد کی نسبت ہزار درجہ فضیلت رکھتی ہے، سوائے مسجد حرام کے اور میری مسجد میں ایک جمعہ دوسری مساجد کے ہزار جمعہ سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور میری اس مسجد میں ایک رمضان دوسری مساجد میں ایک ہزار رمضان سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔

یہ میری انتہائی درجہ کی خوش نصیبی تھی کہ میں رمضان المبارک کے مہینے میں جمعۃ الوداع کی نماز رسول اللہ کی اسی سہانی سجل مسجد میں ادا کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اذان ہو گئی۔ موذن کی آواز انتہائی دلنشین ہے، سوئی ہوئی خواتین جاگ اٹھیں، خطبہ ہوا اور پھر جماعت کھڑی ہو گئی، یہ احساس ایک لمحہ کے لئے دل سے نہ نکلا کہ ہم رسول اللہ کی مسجد میں ہیں، گویا ان کے مہمان ہیں، یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر رسول اللہ محو استراحت ہیں، کوئی خلاف ادب بات نہ ہونے پائے۔

نماز سے فارغ ہو کر شاہین باجی ثناء اور سعدیہ کو لے کر گھر واپس چلی گئیں میرا ارادہ روضہ رسول ﷺ کی زیارت کا تھا لہٰذا میں مسجد میں رک گئی، ظہر سے عصر کے درمیان کسی وقت ایک گھنٹے کے لئے خواتین کو روضہ رسول ﷺ کی زیارت کا موقع دیا جاتا تھا، اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی کیا پتہ ریاض الجنت میں نماز ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل ہو جائے حالانکہ مجھے اس کی زیادہ توقع نہیں تھی کیونکہ زائر خواتین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

مسجد قبا کی قدیم تصویر
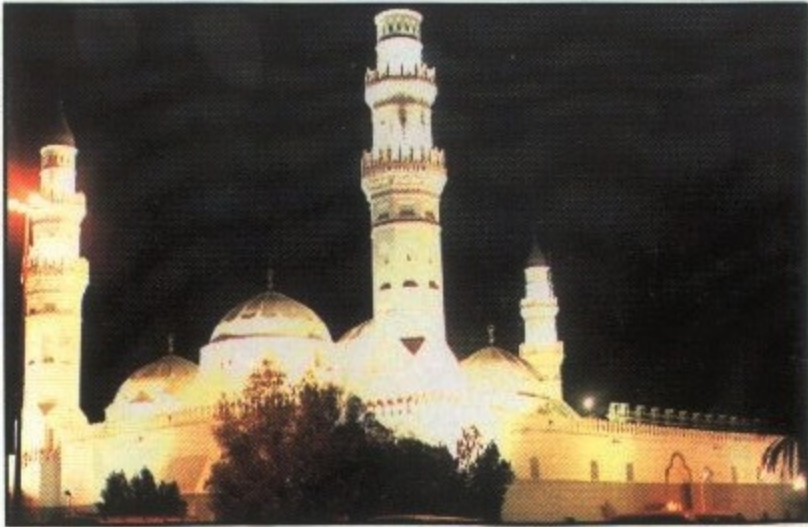
جدید مسجد قبا کا روح پرور منظر

نماز کی ادائیگی کے بعد، بہت سی خواتین گھروں کو واپس چلی گئی تھیں میرے پاس بہت اچھا موقع تھا کہ میں کچھ دیر اور عبادت کرلوں لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر میرا عہد رسالت کا سفر شروع ہو جاتا اور پھر مجھے واپس آنے کے لئے خاصی جدو جہد کرنی پڑتی جب میں سجدہ کرتی تو سرخ قالین نرمی سے میری گنہ گار پیشانی کو سہلاتا، نہ ناک خاک آلودہ ہوتی، نہ پیشانی پر کیچڑ لگتا، نہ گھٹنے زمین کی سختی سے زخمی ہوتے اور نہ ٹخنوں پر سنگریزوں کے قابل نشان ابھرتے، یہ سب کس قدر مختلف تھا!

حالانکہ یہی مسجد جب پہلے پہل بن کر تیار ہوئی تھی تو اس کا فرش کچا تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی ناک اور پیشانیاں خاک آلود ہو جایا کرتی تھیں۔ گرمیوں کے موسم میں جب زمین تنور کی طرح جلنے لگتی تو صحابہ کرامؓ سجدہ کی جگہ پر اپنی قمیض کا دامن بچھالیا کرتے تھے یا اپنے عمامہ پر سجدہ کرلیا کرتے تھے۔ گو کہ مسجد پر چھپر پڑا ہوا تھا مگر اس سے بارش کا پانی نہیں رک سکتا تھا چنانچہ جب بارش ہوتی تو نمازیوں کو خاصی دقت ہوتی مسجد میں کیچڑ ہو جاتا۔ اور اسی عالم میں نماز ادا کی جاتی، سب سے زیادہ روشن پیشانی والوں کی جبینیں کیچڑ آلود ہو جاتیں، گھٹنے زخمی ہو جاتے، اور کپڑے بھی بھیگ جاتے۔

پھر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک رات خاصی بارش ہوئی، سب کو اندازہ تھا کہ نماز فجر کیچڑ میں پڑھی جائے گی لہٰذا بعض اصحاب آتے آتے اپنے دامنوں میں سنگریزے بھر لائے اور اپنی اپنی سجدہ گاہ کی جگہ ان سنگریزوں کو بچھا لیا رسول اللہ ﷺ کو یہ طریقہ بہت پسند آیا لہٰذا اس کے بعد مسجد کا فرش سنگریزوں سے ڈھک دیا گیا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بارش کی صورت میں فرش پر کیچڑ نہیں ہوتا تھا یہ رجحان جدید دور تک قائم رہا تھا جب مسجد کے اندرونی حصہ میں فرش پختہ کر دیا گیا تھا تب بھی صحن مسجد میں کنکریاں ہی ڈالی جاتی تھیں بالآخر ۱۴۰۰ھ\ ۱۹۸۰ء میں کنکریاں ہٹا کر سارا فرش سنگ مرمر کا بنا دیا گیا۔

عہد رسالت میں اپنی ابتدائی تعمیر کے بعد مسجد سات سال تک اسی طرح رہی۔ ۷ ھ میں غزوہ خیبر سے واپسی پر آپ ؐ نے مسجد کی توسیع کا ارادہ کیا کیونکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مسجد تنگ پڑنے لگی تھی، نیز کھجور کے ستون، شہتیر اور شاخیں بوسیدہ ہو جانے کے باعث تجدید ضروری تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد سے متصل ایک انصاری کا مکان مسجد میں شامل کرنے کا ارادہ کیا اسے ترغیب دی گئی کہ اگر تم اپنا مکان مسجد کی توسیع کے لئے دے دو تو اس کے عوض تمہیں جنت میں محل ملے گا لیکن وہ انصاری ایسا نہ کر سکا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اعلان کیا کہ جو شخص فلاں انصاری کی جگہ

مسجد نبوی کا ایک دلکش منظر

خرید کر مسجد کی نذر کردے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کریں گے۔ سیدنا عثمانؓ نے یہ قطعہ زمین بیس ہزار یا پچیس ہزار درہم میں خرید لیا اور آپ ﷺ سے عرض کی

''یا رسول اللہ ﷺ آپ انصاری کے جس مکان کو جنت کے محل کے بدلے خریدنا چاہتے تھے، وہ مجھ سے جنت کے بدلے خرید لیں''۔

سودا ہو گیا۔ بڑے لوگوں کے بڑے سودے!!!

رسول اللہ ﷺ نے وہ قطعہ اراضی، جنت میں ایک محل کے معاوضے پر سیدنا عثمانؓ سے خرید کر مسجد میں شامل کر دی۔

جب دوسری مرتبہ تعمیر کا کام ہوا تو بنیادوں سے اوپر بھی چار فٹ کے قریب پتھر کی دیواریں بنا کر بقیہ دیواریں کچی اینٹوں سے مکمل کی گئیں۔ اس توسیع کے نتیجے میں اصحاب صفہ کا چبوترہ حدود مسجد میں آ گیا۔ توسیع چونکہ شمال اور مغرب کی جانب کی گئی تھی لہٰذا حضرت ابوایوبؓ کا گھر اور سیدہ عائشہؓ اور سیدہ سودہؓ کے حجرے اپنی جگہ قائم رہے۔

مسجد نبوی کی توسیع کا سلسلہ جو ۷ھ میں شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ ۱۷ھ میں سیدنا عمر فاروقؓ نے مسجد نبوی کو اور وسیع کیا کیونکہ یہ مسلمانوں کے لئے پھر تنگ ہو گئی تھی۔ سیدنا عمرؓ نے کہا:

''اگر میں نے اپنے آقا سے یہ نہ سنا ہوتا کہ مناسب ہے کہ ہم مسجد میں کچھ توسیع کریں تو اضافہ کرنے کی جرات نہ کرتا'۔

سیدنا عمرؓ نے مسجد کے مغرب، شمال اور جنوب کی طرف توسیع کا پروگرام بنایا۔ مشرق کی جانب امہات المومنین کے حجروں کے باعث اضافہ نہ کیا۔ اسی طرح مغرب میں سیدنا عباسؓ کا مکان راہ میں آتا تھا۔ سیدنا عمرؓ نے انہیں بتایا کہ مسجد کے توسیعی پروگرام میں ایک طرف امہات المومنین کے مکانات اور دوسری طرف آپ کا مکان رکاوٹ کا موجب ہے۔ میں امہات المومنین کے مکانات کو منہدم کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا البتہ آپ کے مکان کے متعلق تین تجاویز پیش کرتا ہوں آپ ان میں سے جو چاہیں قبول کر لیں:

(۱) آپ مکان میرے ہاتھ فروخت فرما دیں، آپ کو منہ مانگی قیمت بیت المال سے ادا کر دی جائے گی۔

(۲) مکان کے عوض مدینہ منورہ میں جو جگہ آپ پسند فرمائیں گے وہ دے دی جائے گی۔

(۳) آپ اپنا مکان مسلمانوں کے لئے وقف فرمادیں۔

سیدنا عباسؓ نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سیدنا ابی بن کعبؓ کو اپنا حکم بنایا۔ اور ان کے سامنے معاملہ پیش کیا، انہوں نے فریقین کے بیانات سن کر فرمایا:

'میں تم دونوں کو اسی نوعیت کا ایک واقعہ رسول اللہ ﷺ کے بیان کی روشنی میں سناتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا داؤد علیہ السلام کو بیت المقدس کی تعمیر کا حکم دیا۔ انہوں نے حسب حکم تعمیر کا کام شروع کردیا، اتفاق سے تعمیر کے مجوزہ حصہ کے ایک گوشہ میں کسی آدمی کا مکان پڑتا تھا۔ سیدنا داؤد نے اسے معاوضہ کی پیش کش کی مگر اس نے انکار کردیا۔ آپ نے زیادہ سے زیادہ قیمت لگائی مگر وہ پھر بھی مکان دینے پر آمادہ نہ ہوا، تو حضرت داؤد نے زبردستی مکان منہدم کردینے کا سوچا، فوراً اسی وقت جبرئیل آئے اور اللہ کا پیغام پہنچایا کہ "ہم نے بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اس غرض سے دیا تھا کہ لوگ اس میں عبادت کریں گے لیکن آپ نے حقوق العباد کا خیال نہ کرتے ہوئے لوگوں کے مکان غصب کرکے عبادت گاہ بنانے لگے ہیں، آپ تعمیر بیت المقدس فوراً بند کردیں"۔ یہ دل ہلا دینے والا حکم ملا تو حضرت داؤد نے تعمیر رکوادی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بارالہ میں تو اس سعادت سے محروم رہا لیکن میری اولاد میں سے کسی کو توفیق مرحمت فرما کہ وہ اس مقدس گھر کی تعمیر کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس دعا کو شرف قبولیت بخشا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر مکمل ہوئی۔

یہ واقعہ سن کر سیدنا عمرؓ اپنے مطالبہ سے دست کش ہوگئے، لیکن اب سیدنا عباسؓ نے برضا و رغبت، بلا قیمت اپنا مکان سیدنا عمرؓ کو دے دیا اور ان کا یہ مکان مسجد کی توسیع میں آگیا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ سیدنا عباسؓ کے مکان کے دو حصے تھے ایک حصہ جو مسجد نبوی کی طرف تھا حضرت عباسؓ کے تصرف میں تھا، اور دوسرا حصہ مروان بن حکم کے پاس تھا۔ توسیع فاروقی کے نتیجے میں اب مراوان کا مکان مسجد نبوی سے متصل ہوگیا، جب کہ حضرت عباسؓ وہاں سے نقل مکانی کر گئے۔

اسی طرح سیدنا عباسؓ کے مکان سے متصل سیدنا جعفر طیارؓ کا مکان تھا، اس کا نصف حصہ ایک لاکھ درہم میں خرید کر سیدنا عمرؓ نے مسجد میں شامل کردیا تھا، جب کہ اس کا بقیہ نصف حصہ سیدنا عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں خرید کر مسجد کی توسیع فرمائی۔

سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ کا دور، اسلام کی وسعت و پھیلاؤ کا زمانہ تھا ایران، عراق، شام اور مصر کے وسیع و عریض اور زرخیز علاقے اسلامی ریاست کا حصہ بن چکے تھے، اس اسلامی ریاست میں آباد لوگوں کی تعداد کئی گنا بڑھ چکی تھی لہٰذا مسجد نبوی ایک بار پھر تنگی داماں کا شکار ہوگئی۔ لہٰذا سیدنا عثمانؓ نے مسجد کی توسیع کی۔ اب جو توسیع کی گئی وہ کئی اعتبار سے شاندار تھی انہوں نے منقش پتھروں اور گچ سے مضبوط اور مزین دیواریں بنوائیں جن میں مٹی گارے کی جگہ چونا استعمال کیا گیا۔ ستون بھی منقش پتھروں سے دیدہ زیب بنوائے اور چھت ساگوان کی لکڑی کی بنوائی۔ اس توسیعی کام کی نگرانی سیدنا عثمانؓ نے خود کی، توسیع کا یہ کام دس ماہ میں مکمل ہوا (ربیع الاول ۲۹ھ / ۶۴۹ء، تا محرم الحرام ۳۰ھ / ۶۵۰ء)

یہ توسیع تین اطراف، یعنی شمال، جنوب اور مغرب میں ہوئی، مشرق میں حسب سابق ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حجرہ مقدس کی وجہ سے جہاں رسول اللہ کا مدفن بھی تھا، توسیع نہ کی گئی۔ مغرب میں جعفر طیارؓ کے مکان کا مزید نصف حصہ ایک لاکھ درہم کے عوض خرید کر مسجد میں شامل کردیا گیا۔ اس سمت سیدنا ابوبکرؓ کا وہ مکان بھی واقع تھا جس کے دروازے کے متعلق رحمت کائنات نے فرمایا تھا:

'ابوبکرؓ کے دروازے کے علاوہ مسجد کی جانب جتنے دروازے ہیں انہیں بند کردیا جائے۔

یہ مکان اپنی زندگی کے آخری ایام میں بوجوہ سیدنا ابوبکرؓ نے سیدہ حفصہؓ بنت عمرؓ کے ہاتھ چار ہزار درہم میں فروخت کردیا تھا۔ (یہ رقم انہوں نے اپنے ہاں آئی ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت پر خرچ کردی تھی) سیدنا عثمانؓ نے ام المومنین سیدہ حفصہؓ سے یہ مکان مانگ لیا اور اس کے عوض انہیں سیدنا عبداللہؓ ابن عمرؓ کی ایک بے حد کشادہ حویلی دے دی۔ یہ مکان باب السلام اور باب الرحمت کے درمیان واقع تھا۔ اس کے علاوہ سیدنا عباسؓ کے گھر کا باقی حصہ بھی خرید کر مسجد میں شامل کردیا گیا۔

توسیع عثمانی کے ساتھ مسجد نبوی نصف صدی سے کچھ زائد تک اسی طرح رہی، اس کے بعد اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ایک بار پھر مسجد نبوی کی توسیع کی۔ ان دنوں حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے گورنر تھے، ولید نے فرمان جاری کیا کہ مسجد کی تجدید، توسیع اور آرائش و زیبائش کا کام شروع کیا جائے، مسجد سے ملحقہ تمام مکانات خرید کر مسجد کو کشادہ کردیں، جو شخص خوشی سے مکان بیچ دے اسے قیمت ادا کرکے خرید لیں اور جو خوش اسلوبی سے نہ دے تو معززین شہر سے اس مکان کی قیمت کا صحیح اندازہ لگا کر اسے نقد ادا کردیں اور جو شخص اس طرح معاوضہ نہ لے اس کی رقم فقراء میں تقسیم کردیں اور مکان جبراً لے

لیا جائے، توسیع ہر طرف سے کی جائے اور ازدواج مطہرات کے حجرات بھی توسیع میں شامل کر دیے جائیں۔

اہلیان مدینہ نے مسجد نبوی کے لئے بخوشی اپنے مکانات کا نذرانہ پیش کر دیا، جس پر نہ تو انہیں بے گھر ہونے کا قلق تھا اور نہ ہی تعمیر نو کی صعوبتوں سے رنجیدہ خاطر تھے مگر جب یہ بتایا گیا کہ ازواج مطہرات کے حجرات بھی منہدم کر دیے جائیں گے تو لوگ بے قرار ہو کر روتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ معززین شہر کا استدلال اس ضمن میں یہ تھا کہ ان حجروں کو ہرگز منہدم نہیں ہونا چاہیے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں انہیں دیکھ کر سبق حاصل کرتیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے اہل خانہ کس قدر سادگی اور عسرت سے زندگی گذار گئے ہیں، یہ حجرے جن کی دیواریں کچی اینٹوں کی، چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی اور وہ بھی بہت نیچی، گھر بے چراغ اور دروازوں پر لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پردے۔ اگر انہیں اسی حالت میں قائم رہنے دیا جاتا تو حجاج وزائرین ان حجرات کو دیکھ کر دنیا کی زیب وزینت سے متنفر ہوتے۔

لیکن حکم شاہی، حکم شاہی تھا!

پتہ نہیں صحیح تھا کہ غلط تھا۔

بہر حال سیدہ عائشہؓ سمیت، امہات المومنین کے حجرے ڈھا دیے گئے، بیت فاطمہؓ بھی منہدم کر دیا گیا۔ جو حجرہ عائشہ سے چند گز کے فاصلے پر تھا

ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی، بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ:

'اس دن سے زیادہ کبھی اہل مدینہ کو روتے نہیں دیکھا گیا'۔

'اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا آج یوم الوصال ہے۔

مشرق میں حجرات امہات المومنین، بیت سیدہ فاطمہؓ کے علاوہ شمال کی جانب سیدنا عبدالرحمنؓ ابن عوف، کی تین حویلیاں، جنہیں 'القرائن' کہا جاتا تھا، سیدنا عبداللہ ابن مسعودؓ کا 'دارالقراء'، سیدنا ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاصؓ کے کئی مکانات، اور مغرب کی سمت سیدنا طلحہ بن عبداللہؓ، ابی سبرہ بن ابی رھمؓ، سیدنا عمار بن یاسرؓ اور سیدنا عباس بن عبدالمطلبؓ کے بعض مکانات مسجد میں شامل کیے گئے۔

مسجد اور مکانات کو گرانے کا کام صفر ۸۸ھ/ ۷۰۶ء میں شروع ہوا۔ اسی اثناء میں خلیفہ ولید

بن عبدالملک نے قیصر روم سے تعمیراتی اخراجات کے لئے مدد طلب کی چنانچہ قیصر روم نے بڑی فراخدلی سے ایک لاکھ مثقال سونا، (جس کا وزن موجودہ حساب سے گیارہ من سے کچھ زائد بنتا ہے) ایک سو ماہر کاریگر، نفیس اور منقش پتھروں سے لدے ہوئے چالیس اونٹ، قدیم مسمار شدہ شہروں اور قصبوں سے میناکاری کیے ہوئے بہت سے پتھر ولید کے پاس بھیج دیئے۔

مسجد نبوی کی توسیع وتعمیر کا یہ کام تین سال تک جاری رہا اور ۹۱ھ/ ۷۰۹ء میں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ سیدنا عمرؒ بن عبدالعزیز نے مسجد کی بنیادیں پتھروں کی بنوائیں، دیواریں تراشیدہ منقش پتھروں کی چونے سے کھڑی کیں، ستون پتھر کے بنوائے جن میں لوہا اور سیسہ بھرا ہوا تھا، دیواروں پر جواہرات اور مرمر کے ٹکڑوں سے جاذب نظر اور دلربا میناکاری کرائی، انہیں لگانے کے لئے خاص قسم کا مصالحہ بنوایا، چھت ساگوان کی بنوا کر سونے سے نقش ونگار کرایا۔ اس سے قبل مسجد میں محراب کی علامت نہیں تھی سیدنا عمر ثانی نے محراب بھی بنوائی اور منڈیر پر خوبصورت کنگرے بنوائے۔ علاوہ ازیں دیواروں پر مختلف آیات اور سورتیں کندہ کرائیں قبلہ والی دیوار پر، باب السلام سے باب جبرئیل تک سورہ فاتحہ، سورہ والشمس اور سورہ الناس لکھوائی۔ ولید سے قبل مسجد کے مینار بنانے کا طریقہ نہیں تھا، ولید نے سب سے پہلے مینار بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسجد کے چاروں کونوں میں مینار بنا دیے گئے۔ بعد ازاں جب ولید کا بھائی سلیمان تخت خلافت پر بیٹھا اور ایک بار جب وہ حج کے بعد مدینہ آیا اور مروان کے مکان میں قیام کیا۔ اس دوران سلیمان نے دیکھا کہ مینارہ باب السلام پر موذن کے چڑھنے سے اہل خانہ کی بے پردگی ہوتی ہے تو اس نے اس طرف کے مینار کو مسجد کی چھت تک گروا دیا۔۔۔۔۔ اس توسیع میں زر کثیر صرف ہوا، صرف قبلہ والی دیوار پر پینتالیس ہزار دینار اور مقصورہ کی چھت پر چالیس ہزار دینار خرچ ہوئے۔

ولید بن عبدالملک کی توسیع کے بعد عرصہ تک کسی خلیفہ نے مسجد کی مزید توسیع کی خدمت انجام نہ دی تا آنکہ عباسی خلیفہ المہدی نے ۱۶۲ھ/ ۷۷۹ء میں مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع کا حکم دیا۔ توسیع کا یہ کام صرف ایک سمت میں یعنی شمال کی جانب کیا گیا، مشرق، مغرب، اور جنوب میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، شمالی سمت کو کشادہ کرنے کے لئے عبدالرحمن ابن عوفؓ کا گھر جو دار ملیکہ کے نام سے شہرت رکھتا تھا، کے علاوہ شرحبیل بن حسنہؓ کا گھر، عبداللہ ابن مسعودؓ کے گھر کا بقیہ حصہ اور مسور بن مخرمہؓ کے گھر توسیع میں شامل کر لئے گئے۔ توسیع کا یہ کام تین سال میں مکمل ہوا۔ توسیع سے قبل مسجد کا رقبہ ۶۴۴۰ مربع

میٹر تھا۔ جو بڑھ کر ۸۸۹۰ مربع میٹر ہو گیا۔

اس کے بعد گیارہ سو سال تک مسجد میں توسیع کا کوئی اہم کام نہ ہوا بلکہ دو دفعہ مسجد نبوی شدید ترین آتشزدگی کا شکار ہوئی، پہلی دفعہ رمضان ۶۵۴ھ / ۱۲۶۵ء میں مسجد کو آگ لگی، مسجد نبوی کے خادم ابوبکر الفراش بن اوحد، مسجد میں غربی جانب واقع گودام سے کچھ سامان نکالنے کی غرض سے چراغ لے کر داخل ہوئے ان کی غفلت کے نتیجے میں چراغ سے سامان کو آگ لگ گئی جس نے آن واحد میں پوری مسجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ابوبکر لقمہ اجل بن گئے، مسجد کے جو ستون لکڑی کے تھے وہ جل گئے جو پتھر کے تھے وہ گر گئے، اور پوری مسجد راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

تقریباً سوا دو سو سال بعد آتش زدگی کا دوسرا خطرناک واقعہ بھی رمضان ہی میں پیش آیا ۱۳رمضان المبارک کی شب کا واقعہ ہے، شہر مدینہ طوفان باد و باراں کی زد میں تھا بارش کے علاوہ بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک نے انتہائی خوفناک سماں پیدا کر دیا تھا اسی اثناء میں رات کے پچھلے پہر، اعلان سحری کے لئے مسجد نبوی کے موذن شمس الدین محمد بن خطیب، روضہ رسول ﷺ کے قریب والے مینارہ پر چڑھے ہی تھے کہ آسمانی بجلی مینارہ کے قریب گرنے سے آگ بھڑک اٹھی، جس نے ساری مسجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، موذن اسی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ مسجد کی چھت، متعدد ستون منبر، نادر نایاب کتب کا علمی ذخیرہ اور کئی افراد آگ کی نذر ہو گئے۔

چنانچہ مسجد کی توسیع کا کام تو کیا ہوتا، قسطوں میں مسجد کی تعمیر کا کام کیا جاتا رہا کبھی کسی نے دیوار بنا دی۔ کسی نے چھت کی مرمت کرا دی، کسی نے ستونوں کو مضبوط کرا دیا اور کسی نے صحن مسجد کی تعمیر کرا دی، معاملہ یونہی چلتا رہا تا آنکہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں عثمانی خلیفہ سلطان عبدالمجید نے مسجد نبوی کی ازسرنو تعمیر بھی کی اور شمال کی جانب خاصی توسیع بھی کی اور اس طرف ایک نیا دروازہ 'باب المجیدی' بھی بنوایا۔ اس کی تعمیر قسطوں میں ہوئی یعنی مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا جاتا اور پھر اس کی ازسرنو تعمیر شروع کر دی جاتی، جب وہ حصہ مکمل ہو جاتا تو دوسرا حصہ منہدم کر دیا جاتا۔ یوں تعمیر و توسیع کا یہ کام دس سال تک چلتا رہا۔ سلطان عبدالمجید کی یہ تعمیر آج بھی مسجد نبوی میں موجود ہے۔

ترکوں نے تعمیر مسجد پر صرف زر کثیر ہی خرچ نہیں کیا بلکہ اپنے خلوص اور عشق اور نیاز مندانہ وارفتگی کو بھی استعمال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ترکوں نے تعمیر مسجد کے لئے اس بات کا اہتمام کیا کہ ہر معمار حافظ

قرآن ہو، کام شروع کرنے سے قبل ہر معمار غسل کرتا اور دو رکعت نفل ادا کرتا اس تعمیر میں مسجد کی ساری چھت پر نقاشی اور طلائی کام کیا گیا، چھت میں جابجا چھ اور نو فٹ اونچے ہشت پہلو شیشے کے دوہرے دروازے نصب کیے گئے جن پر دیدہ زیب خوبصورت قبے بنوائے، ان دروازوں سے سورج کی روشنی اور تازہ ہوا مسجد میں داخل ہوتی۔ در کی کمانیں بے جوڑ، ایک ہی پتھر سے تراشی ہوئی ہیں، کمانوں کو سیسہ پلا کر باہم جوڑا گیا ہے۔ باب السلام سے مقام جبرئیل تک ساری دیوار قرآن پاک کے سنہری حروف سے سجائی گئی، چھت میں واقع گنبدوں میں مختلف آیات و سورۃ نہایت خوش خط تحریر کرائیں۔ جگہ جگہ بجلی کے قمقمے لگائے گئے جس کی وجہ سے مسجد کی خوبصورتی دو چند ہو گئی۔ یہ تعمیراتی کام اس قدر مضبوط کیا گیا کہ آج بھی برقرار ہے بلکہ ابھی صدیوں تک انشاءاللہ اس میں شکست و ریخت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اس تعمیر تجدید پر ساڑھے سات لاکھ عثمانی گنی خرچ ہوئے، جو سات کروڑ روپیہ کے مساوی ہیں۔

عبدالمجید کے اس توسیعی پروگرام کی وجہ سے مسجد نبوی کی وسعت ۱۰۳۰۳مربع میٹر ہو گئی۔

اس کے بعد ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء میں شاہ عبدالعزیز آل سعود نے تعمیر و توسیع کا فقید المثال کام شروع کرایا جو آج تک جاری ہے اور اب یہ ایک مستقل کام ہے جو مسلسل ہو رہا ہے، آج جو مسجد نبوی نظروں کے سامنے تھی وہ اسی مسلسل توسیع کا نتیجہ ہے عہد رسالت ﷺ کا پورا شہر مدینہ اس توسیع کے نتیجے میں مسجد نبوی کے اندر سمٹ آیا ہے۔ اس کے حسن و دلکشی، رعنائی و زیبائی، مضبوطی و استحکام کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

آل سعود کی توسیع کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں مسجد میں ۲۸ ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی اب ۲ لاکھ ۵۷ ہزار نمازی مسجد نبوی میں سما سکیں گے اور مسجد کا رقبہ ۱۶۵۰۰ مربع میٹر سے بڑھ کر ۱۶۵۰۰۰ مربع میٹر ہو گیا ہے۔ سعودی حکومت نے مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر اور آرائش و زیبائش پر کروڑوں ریال صرف کیے ہیں۔

مسجد نبوی میں عورتوں کی جائے نماز کو مردوں کی جائے نماز سے ایک Barriar کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ مضبوط لکڑی کا یہ بیریر اس وقت میری نظروں کے سامنے تھا، اسی بیریر میں ایک دروازہ

تھا، جس کے کھلنے کا ساری خواتین کو شدت سے انتظار تھا۔

'خدا سمجھے ان سعودیوں سے عورتوں کا استحصال کرتے ہیں'۔ میرے قریب بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے سلام پھیرتے دیکھ کر کہا۔

میں ایک خفیف سی مسکراہٹ کے بعد درود شریف پڑھنے لگی۔

'اب ہمیں اتنا پیچھے پھینک دیا ہے'۔ وہ خاتون پھر مجھ سے بولی

'کیا مطلب'

'لگتا ہے آپ پہلی دفعہ آئی ہیں'۔

'جی ہاں'

'ارے بی بی چند سال پہلے میں آئی تھی تو یہ سارا علاقہ اور اس کے آگے کے دالان اور صحن مسجد کا بڑا حصہ، یہ سب عورتوں کے لئے تھا۔ اب دیکھو تو عورتوں کو اس کونے میں ڈال دیا ہے۔'

'یہ دروازہ کب کھولیں گے'۔ میں نے خاتون سے دوسرا سوال کیا۔

'پتہ نہیں' وہ بے زاری سے بولی 'ان کا بس چلے تو نہ ہی کھولیں، عورتوں کو تو انسان ہی نہیں سمجھتے، بدو ہیں بدو'۔

لکڑی کے دروازے کے آگے رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ میں رہ ہی جاؤں یہ سوچ کر میں بھی دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اسی بھیڑ کا ایک حصہ بن گئی، خواتین کے اس جم غفیر میں جوان عورتیں بھی تھیں بوڑھی بھی، سفید فام بھی تھیں سیاہ فام بھی، یورپی بھی تھیں ایشیائی بھی، خواتین کمال تحمل سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہی تھیں، بعض بوڑھی خواتین تھک کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھیں اور ان کی ساتھ والیوں نے ان کے گرد حلقہ سا بنا لیا تھا تا کہ وہ رش میں کچلی نہ جائیں۔

اور پھر اچانک وہ دروازہ کھل گیا۔ مودب اور خاموش خواتین کا سیلاب روضہ رسول ﷺ کی طرف بہنے لگا جس میں ایک حقیر قطرہ کی مانند میں بھی شامل تھی۔

☆☆☆☆☆

ریاض الجنۃ

گر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است

یہ خراج تحسین یوں تو کسی شاعر کا کسی حاکم وقت کے محل کے لئے تھا، لیکن کوئی ہم سے پوچھتا تو ہم بتاتے کہ یہ شعر واقعتاً ریاض الجنۃ کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ ریاض الجنۃ مسجد نبوی کا وہ سب سے بابرکت اور پر عظمت گوشہ ہے جسے آپ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے 'ریاض الجنۃ' کا لقب نصیب ہوا۔ اس کے مشرق میں رسول اللہ ﷺ کا حجرہ اور مغربی انتہا پر منبر ہے۔

ہم وسیع دالان عبور کر رہے تھے ہمارے داہنی جانب صحن مسجد تھا جہاں بہت سے مرد حضرات اب بھی موجود تھے، مسجد نبوی کی توسیع قابل ذکر ہے۔ آج جتنے رقبے پر مسجد نبوی پھیلی ہوئی ہے وہ اس عہد کا شہر مدینہ رہا ہوگا، اور جو آج شہر مدینہ ہے وہ مضافات مدینہ رہا ہوگا، رسول اللہ ﷺ کہتے تھے 'اگر میری اس مسجد کو صنعا (یمن) تک وسیع کر دیا جائے تو پھر بھی یہ میری ہی مسجد ہے'۔ یعنی اس کی عظمت و برکت بہر حال برقرار رہے گی خواہ وہ مسجد کا دور افتادہ گوشہ ہی کیوں نہ ہو۔

ہم کتھئی ستونوں کے اندر والے حصے میں داخل ہو گئے تھے یہ سجاد نے مجھے بتا دیا تھا کہ کتھئی ستونوں کے احاطے میں ہی دراصل سب کچھ ہے، یہیں منبر رسول ﷺ ہے اور یہیں حجرہ عائشہؓ تھا۔ میں کتھئی ستونوں کے اندر تو پہنچ گئی لیکن دل مایوس ہونے لگا کیونکہ یہاں خواتین کا ایسا شدید ہجوم تھا کہ منزل مقصود تک پہنچنا انتہائی دشوار لگ رہا تھا۔ میں ایک کتھئی ستون سے ٹک کر کھڑی ہو گئی اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کم از کم مجھے اتنا موقع تو ملے کہ رسول اللہ ﷺ کے سرہانے کھڑے ہو کر سلام عرض کر سکوں۔

شاہین باجی مجھے مسائل عمرہ کی ایک چھوٹی سی کتاب دے گئی تھیں جن میں دعائیں اور سلام وغیرہ لکھے ہوئے تھے کہ میں موقع کے حساب سے پڑھتی رہوں۔ میں وہ کتاب پہلے بھی دیکھ چکی تھی مگر اس عالم میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ میرے الفاظ کم مایہ سہی عرض مدعا کے لئے مجھے وہ کافی تھے

لہٰذا وہ کتاب مٹھی میں بند ہی رہی۔

چند منٹ تک میں کھمبے ستون سے لگی کھڑی رہی کہ خواتین کا رش اور دھکم پیل ختم ہو یا کم ہو تو آگے بڑھوں لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس جوار بھاٹے اور مد و جزر کا کوئی اختتام نہیں، مجھے بھی ہمت کرنی ہی ہوگی کہ

ساحل سے تو طوفاں کا نظارہ نہیں ہوتا

لہٰذا میں نے بھی آہستہ آہستہ روضہ رسول ﷺ کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ ایک بات کی شعوری کوشش کی کہ دیار رسول ﷺ ہے لہٰذا میری وجہ سے کسی کو دھکا نہ لگے، کوئی گر نہ پڑے یا میری وجہ سے کسی کا پیر نہ کچلا جائے، اور اسی حد ادب کی وجہ سے خاصا وقت صرف کر کے روضہ کی جالی تک پہنچ تو گئی لیکن یہ انکشاف ہوا کہ یہ روضہ رسول ﷺ کا بالکل عقبی حصہ ہے۔ یہاں روضہ کے گرد کھینچے گئے جنگلے کے اندر ایک سیاہ فام قاری جمع ہو جانے والی خواتین کو موقع کی مناسبت سے دعائیں اور درود پڑھا رہا تھا۔ حجاز مقدس میں اگر کوئی حبشی نژاد بزرگ نظر آتے ہیں تو ایسا ہی لگتا ہے کہ بلالؓ ابن ابی رباح ہیں، موذن مسجد نبوی!

بہر حال میں نے اسی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کو سلام عرض کیا، اس لمحے کے جذبات اور کیفیات میرا قیمتی سرمایۂ حیات ہیں، تھوڑی دیر میں میں جنگلے کے پاس سے ہٹ آئی تا کہ دوسری خواتین کو بھی موقع مل سکے۔

اب میں دوگانہ پڑھنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے سب سے بہترین جگہ تو ریاض الجنۃ ہی ہو سکتی تھی، جہاں دو رکعت نفل ادا کرنے کی آرزو یہاں تک لے آئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ جنت ارضی اس وقت مجھ سے دور تھی جہاں رش کا یہ عالم تھا کہ خواتین پر خواتین لدی ہوئی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے"۔ (بخاری، مسلم) اور ہر خاتون اس باغ کی آرزو مند تھی، لیکن کیا ہر ایک کو اس کے حسب آرزو مل بھی گیا؟

بہت سی خواتین میری ہی طرح بے نیل و مرام پیچھے کھڑی ہوئی تھیں۔

ریاض الجنۃ کے بعد وہ سات ستون بھی بڑی بابرکت جگہیں ہیں جنہیں ستونہائے رحمت کہتے ہیں۔ ان میں سے بھی خصوصاً ستون عائشہؓ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسے اسطوانہ قرع اور اسطوانہ مہاجرین بھی کہا جاتا ہے۔ تحویل قبلہ کے بعد محراب کی جگہ مقرر ہونے سے پہلے بارہ پندرہ دن تک

رسول اللہ نے اسی جگہ مصلیٰ بچھایا تھا۔ اکثر مہاجر صحابہ کرامؓ کی علمی، فکری و ذکری نشستیں بھی اسی جگہ جمتی تھیں۔ سیدہ عائشہؓ نے ایک بار رسول اللہ ﷺ کا فرمان بیان کیا کہ "مسجد نبوی میں ایک جگہ بہت زیادہ بابرکت ہے اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو انہیں اس جگہ نماز پڑھنے کے لئے، ہجوم کی وجہ سے قرعہ ڈالنا پڑے"۔ صحابہ کرامؓ نے سیدہ عائشہؓ سے وہ جگہ دریافت کی مگر انہوں نے بتانے سے پہلوتہی کی۔ بعد ازاں سیدنا عبداللہ ابن زبیرؓ کے اصرار پر انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی فرما دی، اس پر ابن زبیرؓ فوراً وہاں پہنچے اور نفل پڑھنے میں مصروف ہو گئے، اس طرح دیگر صحابہ کرامؓ کو بھی اس ستون کا علم ہو گیا۔

مگر اس وقت مجھ کو کون بتاتا کہ وہ ستون کہاں تھا۔

اس عالم بے خودی میں مجھے اسطوانہ عائشہؓ کی خبر کون دیتا۔

تھک ہار کر میں نے سوچا کہ جہاں جگہ مل جائے مجھے نماز پڑھ لینی چاہئے اس وقت میں روضہ رسول ﷺ کے عقب میں ایک میٹر بلند پیتل کے ایک انتہائی دلکش جنگلے کے قریب کھڑی تھی، جس میں لگی ہوئی جالی دار الماریوں میں قرآن کے سینکڑوں نسخے رکھے ہوئے تھے، بہت سی خواتین اس جنگلے کے اندر بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ یہ یقیناً کوئی خاص جگہ ہوگی جس کو اس اہتمام سے گھیرا گیا ہے۔

'کہیں یہ صفہ تو نہیں۔'

میرے ذہن میں خیال سا ابھرا۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ جنگلا ریاض الجنۃ اور فاروقی وعثمانی اضافہ مسجد کے درمیان محض ایک حد فاصل تھا۔

بہر حال میں ایسی جگہ کی تلاش میں داہنی جانب ہٹتی چلی گئی جہاں دلجمعی کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھ سکوں کوئی میرے سامنے سے اپنی چپلیں اٹھائے ہوئے نہ گذرے، مجھے قیام کی حالت میں رکوع پر مجبور کر دینے والے دھکے نہ دے اور نہ سجدہ کے عالم میں اپنے تن و توش سمیت میرے اوپر آ رہے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں میں مکمل سکون سے صرف دو سجدے کر سکوں اور کچھ دعائیں مانگ سکوں۔

بالآخر مجھے ایک مناسب جگہ مل گئی، رش تو یہاں بھی تھا لیکن خاصا کم میرے داہنے جانب ایک ستون تھا، اور بائیں جانب چند ایرانی اور ترک خواتین اپنے اپنے انداز میں نمازوں میں مصروف تھیں میرے بالکل سامنے جالی دار دیوار تھی چنانچہ میرے سامنے سے بھی کوئی نہیں گذر سکتا تھا، اس گوشہ عافیت کے مل جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور انتہائی یکسوئی کے ساتھ نماز میں مصروف ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں موجود محافظ عورتوں نے آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ تھوڑی ہی دیر میں عصر کی آذان ہو جائے گی اور یہ سب جگہیں مردوں سے بھر جائیں گی آہستہ آہستہ کر کے خواتین نے واپس جانا شروع کر دیا۔ میں نے بھی واپسی کے لئے قدم اٹھائے، پیتل کے جنگلے کے پاس پہنچ کر میں نے سوچا اب تو رش کم ہو رہا ہے ایک کوشش کیوں نہ کر دیکھوں شائد روضہ رسول ﷺ کے سامنے والے حصے تک پہنچ سکوں، اور شائد ایک نظر منبر رسول ﷺ کو بھی دیکھ سکوں لہٰذا میں نے واپسی کا خیال ترک کر کے خواتین کے ہجوم میں راستہ بنا کر آگے بڑھنا شروع کر دیا میں خواتین کے طوفان بلا خیز میں بری طرح گھری ہوئی تھی جب اچانک ہی خاصے بلند نسوانی قہقہے سنائی دیے، میں نے حیران ہو کر سامنے دیکھا وہ اٹھارہ، بیس سال کی پاکستانی لڑکی تھی جو بری طرح قہقہے لگا رہی تھی۔

''ارے، یہ کیا حرکت ہے۔ آپ کو پتہ ہے آپ کہاں ہیں''۔ میں نے اسے جھڑکا۔ جیسے وہ میری اسٹوڈنٹ ہو

'میں' وہ قہقہوں کے درمیان بمشکل تمام اپنی صفائی میں بولی 'وہاں سے... 'اس نے ہاتھ سے بہت دور اشارہ کیا' یہاں تک..... ہاہاہاہا...... خود بخود آ گئی ہوں'۔

اور وہ پھر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

کوئی اور جگہ ہوتی تو اس صورت حال پر شائد میں اس کا پورا پورا ساتھ دیتی مگر یہ جائے ادب تھی۔

''بس کریں.... چپ ہو جائیں''۔ میں نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی وہ آناً فاناً مجھ سے تین چار گز آگے بڑھا دی گئی، اب اس نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا تھا، لہٰذا اس کی آواز خاصی دب گئی تھی مگر اس کی ہنسی بالکل بند نہیں ہوئی تھی، اس وقت وہ مکمل طور پر ان خواتین کے رحم و کرم پر تھی جن میں سے نصف آ رہی تھیں اور نصف جا رہی تھیں۔ میں نے چشم بصیرت سے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میرے قدم بھی زمین سے اکھڑ گئے تو میرا بھی یقیناً یہی حشر ہونے والا ہے لہٰذا میں خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔

مجھے ریاض الجنۃ تک نہ پہنچ سکنے کا شدید قلق تھا لیکن یہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد تھی جہاں انتہائی ادب ملحوظ رکھنا ضروری تھا، تہذیب اور ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے جتنا ہو سکے کر لینا چاہیے، دھکم پیل اچھا پیچ اور چیخ و پکار کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں لہٰذا میں واپس آ گئی روضہ رسول ﷺ کی عقبی

سمت آ کر ایک بار پھر سلام عرض کیا اور درود شریف کا ورد کرتی ہوئی دوبارہ وسیع دالانوں کو عبور کرتی مصلی النساء میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد عصر کی جماعت کھڑی ہو گئی۔ عصر کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر آئی تو مصلی النساء کے بورڈ کے نیچے سجاد کو اپنا منتظر پایا۔ پھر ہم گھر آ گئے۔

شام میں روزہ افطار کرنے کے بعد میں اپنی ڈائری میں سفر کی خاص خاص باتیں لکھنے بیٹھ گئی، ثناء سعود اور سعدیہ فواد اور ایاز کے ساتھ کھیل کود اور اچھا پیچ میں لگے ہوئے تھے شاہین باجی کچن میں آنے والے مہمانوں کے لئے چائے بنا رہی تھیں اور سجاد اور مختار بھائی مہمانوں کے ساتھ اندر کے کمرے میں خوش گپیوں میں لگے تھے۔

عشاء کی اذان کے ساتھ ہم پھر مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے۔ عشاء کی نماز اور پھر تراویح پڑھی، سعود اپنے ابو کے ساتھ تھا جب کہ ثناء اور سعدیہ میرے ساتھ تھیں۔ تراویح پڑھ کے گھر آئے تو قدرے تھکن کا احساس تھا لہٰذا جلد ہی بستر پر لیٹ گئے۔

''دو ڈھائی بجے تہجد کی نماز ہوتی ہے، چلو گی''۔ سجاد نے مجھ سے پوچھا۔

اس سے قبل کہ میں جواب دیتی، بچوں نے نعرہ بازی شروع کر دی

''ہم بھی چلیں گے، ہم بھی چلیں گے''۔

ان نعروں میں سعود کی آواز نہیں تھی۔ شام سے وہ نڈھال سا تھا اور اس وقت بھی چپ چاپ بستر میں پڑا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھی خاصا بخار لگا، بار بار پیٹ کے درد کی شکائت کر رہا تھا لہٰذا میں نے اسے دوا دے دی اور تھوڑی دیر اس کے پیٹ کی سینکائی بھی کرتی رہی۔

''دو بجے اٹھ کے دیکھوں گی اگر سعود بہتر ہوا تو چلوں گی'' میں نے اپنے بستر میں لیٹتے ہوئے اپنا پروگرام سجاد کو بتایا۔

''ٹھیک ہے تم دیکھ لینا، میں تو بہر حال جاؤں گا''۔

''واہ'' میں جل گئی۔ ''اب تم اتنے بھی اللہ میاں کے نہ بنو، اور میں اتنی بھی سوتیلی نہیں، تم جاؤ گے تو پھر میں بھی ضرور جاؤں گی''۔

یوں ہم دو بجے اٹھنے کا طے کر کے بارہ بجے کے قریب سو گئے۔

☆☆☆☆☆

جبل احد
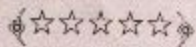
رات دو بجے سجاد نے مجھے اٹھایا، کچی نیند میں میں سیدھی سعود کے بستر پر گئی، اس کا جسم تو گرم نہیں تھا، ٹمپریچر نارمل تھا مگر کل رات سے وہ پیٹ درد کی شکایت کر رہا تھا، اور اس وقت بھی سوتے میں آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا میں نے ثناء کو اٹھا کر اسے سعود کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور اسے تاکید کی کہ بھائی کے پاس ہی آ کر لیٹ جائے۔

''آپ جائیں امی میں سعود کو سنبھال لوں گی'' نو سالہ معصوم ثناء نے بڑی ذمہ داری سے کہا، بچوں کے سلسلے میں میں بہت خوش نصیب رہی تھی، شروع سے ہی بچوں نے مجھے تنگ نہیں کیا تھا بلکہ ہر معاملے میں تعاون کرتے آئے تھے ورنہ عموماً لوگ بچوں کے ساتھ عمرے اور حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پرہیز ہی کرتے ہیں۔ جب عمرے کے سفر میں بچے میرے لئے مسئلہ نہ بنے تو میرا حوصلہ ہوا کہ ڈھائی ماہ بعد جب ہم حج کے لئے روانہ ہوئے تب بھی ہم نے بچوں کو اپنے ساتھ رکھا۔

بہر حال ثناء کی یقین دہانی کے بعد میں اور سجاد مسجد کی طرف چل پڑے تہجد کی اذان ہو چکی تھی۔ اس خیال سے کہ گھر والے بے آرام نہ ہوں مختار بھائی سے گھر کی ایک چابی ہم نے لے لی تھی۔ تہجد کی نماز میں رش تو تھا مگر اتنا نہیں کہ معاملہ باہر سڑک تک پہنچ جاتا لہٰذا مجھے بھی مسجد کے اندرونی برآمدے میں بڑے آرام سے جگہ مل گئی نماز میں بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، دیگر نمازوں میں اگر نصف عورتیں ہوتی تھیں تو نصف بچے۔ مگر رات کے اس پچھلے پہر لگتا تھا کہ خواتین بچوں کو سوتا چھوڑ کر اور موقع غنیمت جان کر چلی آئی تھیں۔

تہجد کی اس چار رکعت نماز میں جو لطف مجھے ملا اس کا اظہار میرے قلم کے حوصلے سے باہر کی چیز ہے۔ مسجد نبوی کے امام صاحب کی آواز بہت نرم اور شیریں ہے، جب کہ خانہ کعبہ کے امام سبیل کی آواز میں بدویانہ کرختگی ہے۔ اس نماز کا لطف ہی اور تھا، وقت افضلیت کا تھا، مہینہ رمضان کا تھا، عشرہ

دوزخ سے رہائی کا تھا، ذہن ہر قسم کی دنیاوی آلائش سے پاک تھا، قلب و نظر حاضر تھے۔ امام صاحب کی تلاوت اور پیش امام صاحب کا رکوع سے اٹھتے ہوئے، ربنا ولک الحمد، کہتے ہوئے سجدے میں چلے جانا، اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والا زیر و بم انتہائی پُر اثر تھا۔ میں جتنے دن مدینہ میں رہی تقریباً بیشتر نمازیں مسجد نبوی میں ہی ادا ہوئیں لیکن جو لطف تہجد کی نماز میں ملا وہ نہ فجر میں تھا نہ ظہر میں، نہ عصر میں نہ مغرب میں نہ عشاء میں نہ تراویح میں،

سچ کہا رب کعبہ نے کہ:

'اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے
رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم
نصف رات یا اس سے کچھ کم
یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھو
ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں
بے شک رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر
اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے
دن کے اوقات میں تو تمہارے لئے بہت مصروفیات ہیں
اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اس کے ہو رہو
وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے
اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے
لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو
(المزمل۔ ۱ ۔ ۹)

نماز کے بعد تھوڑی دیر تک وہیں بیٹھی رہی، یہ موقع روز روز کہاں نصیب ہوتا ہے تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ باہر سردی میں سجاد مصلی النساء کے بورڈ کے نیچے کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا با دل نخواستہ اٹھ کر باہر نکلی واقعی سجاد کو اپنا منتظر پایا۔

''کل پھر آئیں گے'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

جبل احد کا وہ غار جہاں رسول اللہ نے پناہ لی تھی۔ مدینہ ۱۹۸۶ء

حضرت حمزہ اور شہدائے احد کے مدفن

واپسی میں مدینے کے بازار ہمیں کھلے ہوئے ملے خصوصاً کھانے پینے کی دوکانوں پر خاصا رش تھا لوگ سحری کے لئے سامان خرید رہے تھے ہم نے بھی گھر کے نزدیک کی ایک دوکان سے گرما گرم پراٹھے اور چکن خریدا، گھر پہنچے تو اہل خانہ سحری کے لئے اٹھ چکے تھے۔

''آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں''۔ شاہین باجی نے ہمیں باہر سے آتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تہجد پڑھنے گئے تھے'' میں نے اطلاع دی اور سحری کے انتظامات میں ہاتھ بٹانے لگی۔ سحری کر کے فجر کی نماز کی ادائیگی کے لئے پھر مسجد نبوی گئے اور آ کر سو رہے۔ اٹھنے پر آثار مدینہ کی زیارت پر روانہ ہونا تھا۔

دن کے گیارہ بجے آنکھ کھلی، سعود کافی بہتر تھا، اور ہمارے ساتھ جانے پر بضد تھا۔ پہلے کوہ احد جانا تھا وہاں شہدائے جنگ احد کی قبر پر حاضری دینی تھی پھر ظہر کی نماز مسجد ذوقبلتین میں ادا کر کے خمسہ مساجد کی زیارت کرتے ہوئے گھر واپس آ جانا تھا، ہماری اپنی گاڑی پاس تھی سجاد کو راستوں کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ تھا، جو کمی تھی وہ ہم نقشوں کی مدد سے پوری کر لیا کرتے تھے۔ جب ہم روانہ ہوئے تو مختار بھائی کے دونوں چھوٹے بیٹے فواد اور ایاز بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ سجاد بغیر بھٹکے سیدھا ہمیں جبل احد پر لے گئے۔

ہم اکثر کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ جبل احد مدینہ سے تین چار کلومیٹر پر تھا لیکن اب تو صورت حال یہ ہے کہ مدینہ پھیلتے پھیلتے جبل احد تک آ گیا ہے۔ چنانچہ جبل احد کے دامن میں ایک طرف ہم نے جدید طرز کے بنے ہوئے انتہائی خوبصورت ولاز اور مکانات دیکھے جہاں لوگ رہتے بستے ہیں، پہلے شائد کچا راستہ مدینہ سے جبل احد تک جاتا ہوگا اب تو وسیع و عریض، سیاہ اسفالٹ کی شفاف اور چوڑی سڑکیں دامن کوہ احد تک چلی گئی ہیں۔ چنانچہ یہ کہنے کے بجائے کہ جبل احد مدینہ سے شمال کی جانب چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اب یوں کہنا چاہیے کہ جبل احد مسجد نبوی سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر شہر مدینہ کے اندر واقع ہے۔

یہ پہاڑ شرقاً غرباً چار میل پھیلا ہوا ہے، ۳ھ میں مسلمانان مدینہ اور کفار قریش کے درمیان غزوہ احد اسی کے دامن میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس پہاڑ سے قلبی تعلق اور فطری لگاؤ تھا آپ ﷺ کہا کرتے:

'کوہ احد سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ہم سے محبت کرتا ہے۔

ہماری گاڑی احد کے دامن میں ایک طرف رک چکی تھی، میں خوشی، حیرت، احترام اور
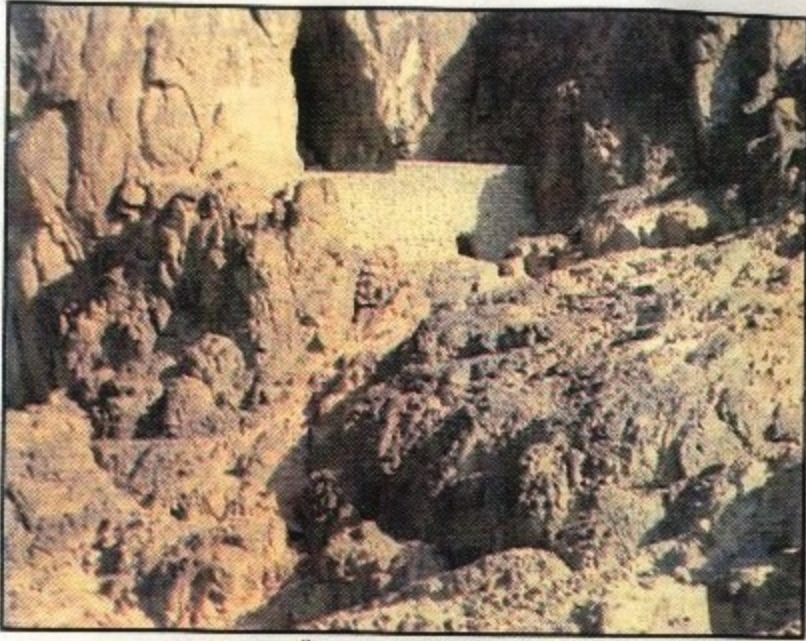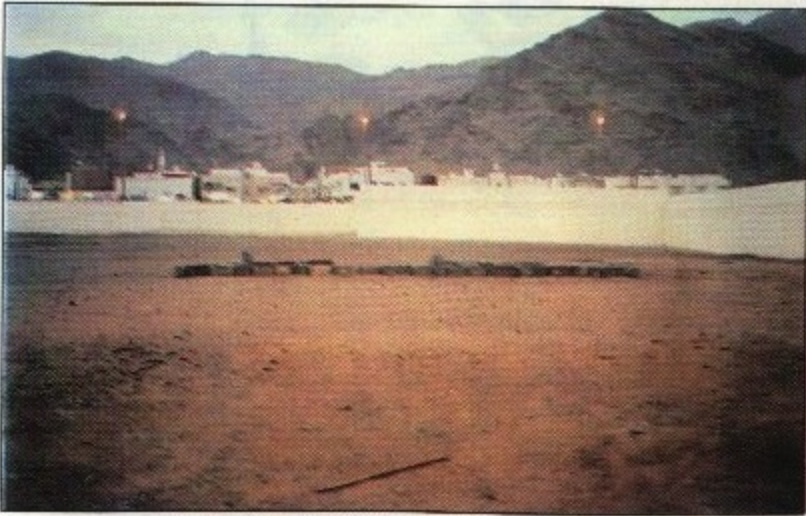
مرعوبیت کے ملے جلے جذبات کے تحت اس بلند و بالا، سوختہ بکل پہاڑ کو دیکھ رہی تھی جس کے دامن میں احد کی مشہور جنگ لڑی گئی تھی، جنگ بدر میں ملنے والی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے کفار مکہ بڑی تیاری سے تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ کی طرف بڑھے تھے، رسول اللہ ﷺ مدینہ میں رہ کر مدینہ کا دفاع کرنا چاہتے تھے مگر نوجوانان مدینہ کے جوش جہاد کے سبب اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر کفار کو روکا جائے گا، عبداللہ ابن ابی، رئیس المنافقون آدھے راستے سے اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا، اس کا بہانہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا جنگی مشورہ نہیں مانا تھا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ کوہ احد نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ اور مومنین سے محبت رکھتا تھا، منافقین سے نہیں!

اس جنگ میں پچاس تیر اندازوں کے ایک دستے کو آپ ﷺ نے جبل عینین پر متعین کر دیا تھا، جبل احد سے قبل داہنی جانب یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی آتی ہے اس کا قدیم نام جبل عینین تھا مگر واقعہ احد کے بعد یہ جبل الرماۃ (تیر اندازوں کی پہاڑی) کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جبل الرماۃ اور جبل احد کے درمیان وہ وادی ہے جسے وادی قناۃ کہا جاتا ہے، یہیں غزوہ احد واقع ہوا تھا۔

ہم نے تیر اندازوں کی یہ پہاڑی دیکھی پھر حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی آخری آرامگاہ کی طرف چلے۔ اس جنگ میں جو ستر صحابہ شہید ہوئے تھے ان میں حضرت حمزہؓ بھی تھے جو سید الشہداء (شہیدوں کے سردار) کہلاتے ہیں رسول اللہ ﷺ شہداء احد کی زیارت کو ہر سال تشریف لے جایا کرتے تھے۔ پہلے حضرت حمزہؓ کو وادی قناۃ کے جنوب میں دفن کیا گیا تھا لیکن سیلابوں میں قبر کو بار بار نقصان پہنچا تو تقریباً تین سو سال بعد خلافت عباسیہ میں لاش کو موجودہ مقام پر منتقل کیا گیا جو وادی قناۃ کے شمال میں کسی قدر بلند زمین پر واقع ہے کہا جاتا ہے کہ منتقلی کے وقت لاش بالکل تر و تازہ تھی۔

اب جس میدان میں شہدائے احد کی قبریں ہیں اس کے چاروں طرف احاطہ بنا دیا گیا ہے جو ایک سبز آہنی گیٹ سے بند رکھا جاتا ہے، زائرین کو اندر جانے کی اجازت نہیں، شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ ترکوں کے زمانے میں حضرت حمزہؓ اور دیگر شہدائے احد کی قبروں پر خوب نذرانے چڑھائے جاتے تھے اور اہل مدینہ سال میں تین دن یہاں میلہ لگایا کرتے تھے۔ اب تو پتھروں کی ایک لکیر ہے جس سے قبروں کا معمولی سا اندازہ ہو جاتا ہے، پہلے حضرت حمزہؓ کی قبر پر قبہ لگا ہوا تھا جسے نجدیوں نے منہدم کر دیا تھا۔

سبز آہنی گیٹ پر جس میں جالیاں بنی ہوئی ہیں، کافی زائرین کھڑے تھے، ایک عرب اپنی
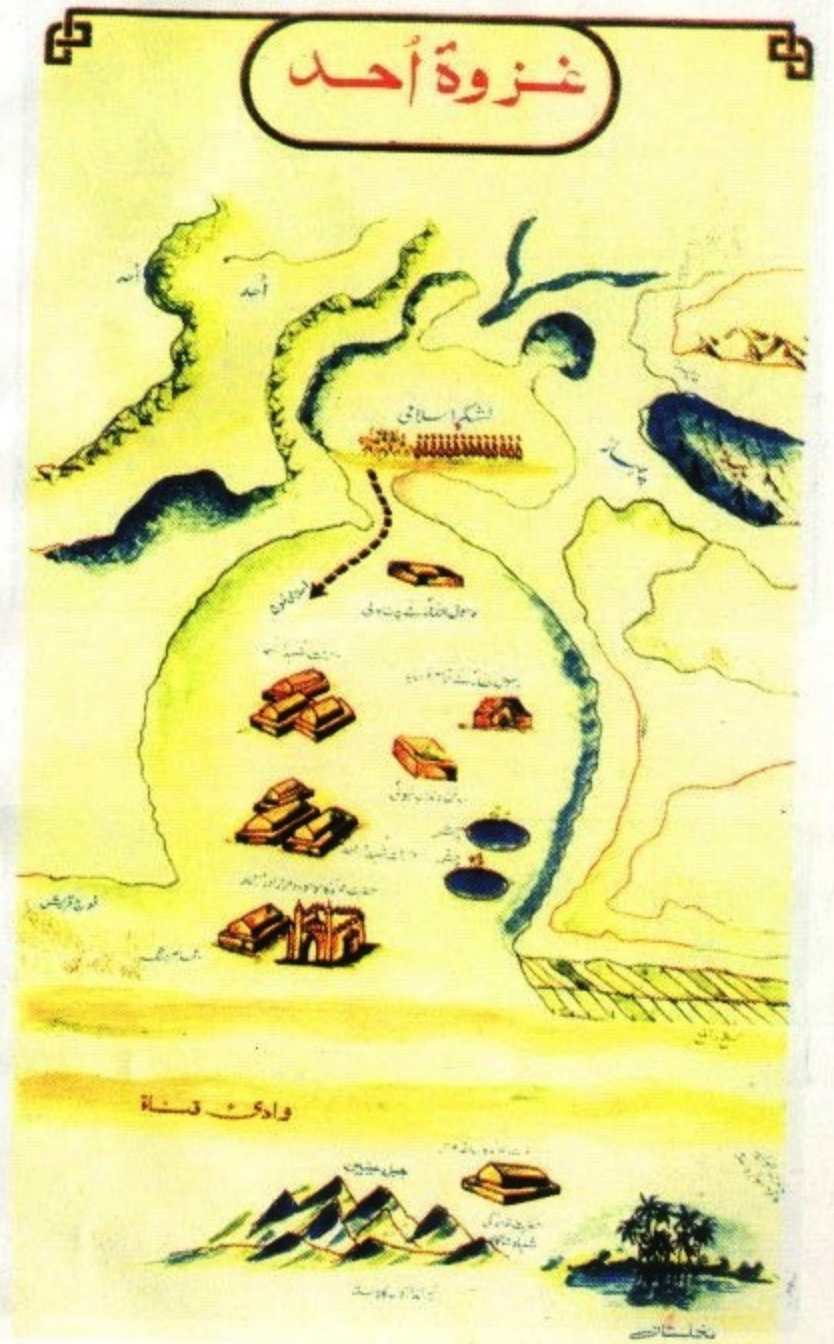
زبان میں زائرین کو موقع کے اعتبار سے دعا پڑھا رہا تھا۔ میں نے سبز جالیوں سے اندر دیکھا شہدائے احد اس زمین میں غریق رحمت ہیں جہاں ۳ھ میں حق و باطل کا معرکہ ہوا تھا اور جنہیں یقیناً ہماری دعاؤں کی حاجت نہیں تھی وہ تو ایسی سعد روحیں تھیں جنہوں نے اپنے رب سے ایسا سودا کیا جس میں گھاٹا ہے ہی نہیں۔ جو اپنے رب کی سجائی گئی جنتوں میں جانے والے لوگ ہیں ہم ایسے فاسق و فاجر کی دعاؤں کے محتاج نہیں، لیکن ایک سنت ہے جو پوری کرنی ہوتی ہے۔

شہداء کی قبروں کی زیارت کے بعد بوجھل دل سے ہم احد کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک نسبتاً تنگ گذرگاہ میں داخل ہو کر اس جگہ پہنچے جہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی، اس پر لگے ہوئے چھوٹے سے بورڈ پر مسجد کا نام لکھا ہوا تھا 'مسجد زینوط' اس کے مقابل کوہ احد پر خاصی بلندی پر ایک جگہ سفیدی سی پھری ہوئی تھی۔

"وہ سفیدی نظر آ رہی ہے، یہ وہ غار ہے جہاں زخمی ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو لے جایا گیا تھا"۔ سجاد نے مجھے بتایا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھ رہی تھی، اگر کوئی راہنمائی نہ کرے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے کہ وہاں کوئی غار ہوگا۔ احد کا یہ رخ چٹیل، کھردرا اور سنگلاخ تھا، چند منٹ آنکھیں جما کر دیکھنے سے یقین آ گیا کہ واقعی وہ غار ہی تھا۔

"میں یہ غار اندر سے دیکھوں گی" میں نے انتہائی خطرناک چڑھائی کے باوجود اپنے پروگرام کا اعلان کیا۔

"یہ جگہ اوپر سے بند کر دی گئی ہے"۔ سجاد نے اطلاع دی میں نے غور سے دیکھا واقعی غار سے کچھ نیچے رکاوٹ کھڑی کی گئی تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور پہلی دفعہ عربوں پر واقعی غصہ آیا۔ بیڑا غرق، کیا ضروری ہے کہ ہم اتنی خطرناک چڑھائی چڑھ کر اوپر کوئی بدعت ہی کرنے جائیں گے۔ یہ تو ہماری تاریخ کے آثار ہیں۔ وہ آثار جو جدید دور میں بھی قدیم شان سے کھڑے ہیں جو آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہیں میں یہ غار اندر سے دیکھنا چاہتی تھی، جہاں رسول اللہ ﷺ اور کئی جانثار پناہ گزین تھے، وہاں سے بیٹھ کر نیچے دیکھتی، اور ابوسفیان کے لشکر کو مکہ کی طرف روانہ ہوتے دیکھتی۔ یہیں سے سیدنا عمر کی للکار تھی

'او دشمن خدا ہم سب زندہ ہیں'۔

پروفیسر حمید اللہ نے یہ غار اندر سے دیکھا ہوا ہے، ان کا بیان ہے کہ یہ غار اندر سے اتنا وسیع ہے کہ اس کی ہموار سطح پر ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا ہے اور کئی آدمی اس کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔

میں نے کیمرہ سے اس غار کی تصویر لی۔ ہم مسجد زینوط کے قریب ہی کھڑے تھے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے غار سے اتر کر رسول اللہ ﷺ نے ظہر اور عصر کی نمازیں یہیں پڑھی تھیں، بعد میں وہاں مسجد بنا دی گئی۔

....

قریش جمعرات ۱۲ ؍شوال کو مدینہ پہنچے تھے اور وادی قناۃ کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے، جمعہ کو انہوں نے آرام کیا اور ہفتہ ۱۵ ؍شوال کو لڑائی ہوئی۔ جمعرات کو رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر روانہ ہوئے، شہر کے باہر مدینے اور جبل احد کے درمیان میں رضا کاروں کا معائنہ ہوا، کمسن بچے واپس کر دیئے گئے۔ کل سات سو جانثار تھے، جن میں سے صرف ایک سو کے جسم پر زرہیں تھیں اور صرف دو یا تین سوار تھے، رات دامن کوہ احد میں گذری، ساری رات پچاس جوان حفاظت کے لئے اسلامی پڑاؤ کے گرد گشت کرتے رہے۔ خدا کی راہ میں شب بیدار رہنے والی ان چوکس آنکھوں کو اب جنت کی ہوائیں بوسہ دیتی ہوں گی۔

صبح جب دشمن احد کی طرف بڑھا تو اس کے سواروں کا ایک دستہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں الگ ہو گیا اور سامنے سے آنے کے بجائے احد کی پشت پر سے پورے پہاڑ کا چکر کھا کر مسلمانوں پر بے خبری میں پیچھے سے دھاوا بول دیا'۔

....

"مجھے پورے احد کا چکر لگانا ہے"۔ میں نے دوسری فرمائش پیش کر دی

"چلئے جناب، آپ کو پورے احد کا چکر لگوا دیتے ہیں" سجاد نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا، ہم اپنی گاڑی میں آ بیٹھے اور بیس پچیس منٹ میں پورے جبل احد کا چکر کاٹ کر واپس وادی قناۃ میں آ پہنچے، اس دوران میں خالد بن ولید کے سوار دستے کو پوری بے جگری سے کوہ احد کے دامن کو روندتے دیکھ رہی تھی، سموں کی وجہ سے اٹھنے والے غبار کو پھیلتے اور بڑھتے دیکھ رہی تھی، خالد بن ولید کو اپنی عام فوج

کے مقابلے میں تقریباً پانچ میل زائد دھاوا مارنا پڑا تھا۔

کیسا ذہین شخص تھا

اور کس غضب کا بہادر

سیدنا عمرؓ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ قریش کی عورتیں خالد جیسا مرد جننے سے عاجز ہیں۔

خالد بن ولید نے جبل الرمادہ پر دھاوا بول دیا، جہاں رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی پچاس تیراندازوں کو متعین کیا ہوا تھا۔ مگر بدقسمتی سے چالیس سے زائد تیرانداز بھاگتے ہوئے دشمنوں کے تعاقب میں بھاگ پڑے، رسول اللہ ﷺ کے حکم کی یہ ایسی پامالی تھی جس کی سزا پورے لشکر کو بھگتنی پڑی، پہاڑی پر جمے رہنے والے سات آٹھ تیرانداز خالد بن ولید کے رسالے کے اچانک حملے کو نہ روک سکے۔ اب مسلمان دوطرف سے گھر گئے تھے۔ مسلمانوں کی صفوں میں ترتیب باقی نہ رہی، گردوغبار کا وہ طوفان اٹھا کہ دوست دشمن کی تمیز مشکل ہوگئی، رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر بھی اڑ گئی، حالانکہ آپ ﷺ دشمن کی سنگ باری سے صرف زخمی ہوئے تھے، زرہ کی کڑیاں چہرہ مبارک میں گھس گئیں اور سامنے کے دانت شہید ہوگئے تھے، اس حال میں بھی آپ ﷺ نے کمال دلسوزی سے دعا کی:

'خدایا میری قوم کو ہدایت دے، وہ جانتی نہیں'۔

'شب جائے کہ من بودم' میں جناب شورش کاشمیری نے یوں لکھا ہے کہ (اس موقع پر) حضور ﷺ نے غضب ناک ہوکر فرمایا: "وہ قوم کیوں کر فلاح پاسکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو لہولہان کرتی ہے"۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج نہیں تھا، میں پہلی دعا کو زیادہ درست سمجھتی ہوں آپ ﷺ کے بعض جانثار آپ ﷺ کے اردگرد حلقہ بنا کر لڑ رہے تھے، ان میں ایک مجاہدہ ام عمارہؓ بھی تھیں، جن کو رسول اللہ ﷺ بجلی کے کوندے کی مانند اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اچکتے، لپکتے اور حملہ کرتے دیکھ رہے تھے۔

مہاجرین تو تھے ہی رسول اللہ ﷺ کے ہم قبیلہ

لیکن انصار نے وفا کا حق ادا کردیا تھا۔

بہرحال وہ جنگ جو مسلمان تقریباً جیت چکے تھے، اپنے سردار کی حکم عدولی کی وجہ سے ہار بیٹھے۔ اس وقت رستے زخموں پر مرہم رکھنے والے رب نے فرمایا:

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہوگے، اگر تم مومن ہو

اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ

تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے

یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں

جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں

تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں۔

اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقی (راستی کے) گواہ ہوں

کیونکہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا

اور اس آزمائش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کردینا چاہتا تھا۔ (آل عمران)

آپ ﷺ کے جانثار ساتھی آپ ﷺ کو دشمن کے نرغے سے نکال کر اس غار میں لے گئے، مسلمان تتربتر ہوگئے تھے ہوسکتا ہے وہ بھی پہاڑوں میں چلے گئے ہوں۔ اس عہد کی جنگوں میں اکثر ہم یہ پڑھتے ہیں کہ فلاں بستی والوں نے دشمن کے آمد کی خبر سنی تو بستی خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے، میں سمجھتی ہوں یہ ان کا ایک دفاعی اقدام ہوتا ہوگا، جس سال ابراہہ نے مکہ پر حملہ کیا تھا، عبدالمطلب قریش کو لے کر پہاڑوں پر چلے گئے تھے اور مکہ خالی ہوگیا تھا یہ غالباً ایک طرح کا عندیہ ہوتا ہوگا کہ ہم جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ یا شائد ایک وجہ یہ ہوتی ہو کہ پہاڑوں پر جانے سے ان کی دفاعی حیثیت مستحکم ہوجاتی تھی کیونکہ اوپر سے مورچہ بند ہوکر تیراندازی بھی کی جاسکتی تھی اور غیر مسلح ہونے کی صورت میں پتھر مار مار کر بھی دشمن کو پیچھے اور نیچے دھکیلا جاسکتا تھا۔

بہرحال اپنے قیدیوں کو چھڑانے، اپنے لٹے ہوئے مال کو واپس لینے اور میدان جنگ میں نظر آنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر واپسی کے ارادے سے چل پڑا، جاتے جاتے اس نے احساس فتح مندی سے پورے میدان جنگ کا چکر لگایا اور یہ اندازہ کر کے کہ یہ لوگ پہاڑوں پر چلے گئے ہوں گے وہ پہاڑ کے دامن میں آکر پکارا

'یا محمد!'

جواب میں خاموشی تھی وہ پھر پکارا

'یا ابا بکر!'

جواب میں پھر خاموشی تھی وہ پھر پکارا

'یا عمر۔۔

اس کی آواز پھر چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی گئی تو وہ خوشی سے چلایا

'سب کے سب مارے گئے'

اور دیوانہ وار اعلیٰ الھبل' (ھبل سر بلند ہے) کا نعرہ مارا۔

اس پر سیدنا عمرؓ سے برداشت نہ ہوا اور وہ غار سے نکل کر للکارے

'او دشمن خدا ہم سب زندہ ہیں'۔

ساتھ ہی سیدنا عمرؓ نے بھی 'اللہ اعلیٰ واجل (بڑائی اللہ کے لئے ہے) کا نعرہ مارا۔ لیکن اس للکار کے جواب میں ابوسفیان رکا نہیں اور فوج کو فوری کوچ کا حکم دے دیا۔

....

میں وادی قناۃ میں چلتی پھرتی رہی، تاریخ کے کردار میرے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے کفار مکہ کے ساتھ آنے والی معزز خواتین مثلاً ہند بنت عتبہ (ابوسفیان کی بیوی جس کا باپ اور دو بھائی جنگ بدر میں مارے گئے تھے) ام حکیم (ابو جہل کی بہو، ابو جہل جنگ بدر میں مارا گیا تھا) فاطمہ بنت ولید (خالد بن ولید کی بہن) برزہ بنت مسعود ثقفی (رئیس طائف کی بیٹی) ریطہ زوجہ عمرو بن العاص، مصعب بن عمیر کی ماں حناس اور عمرہ بنت علقمہ جیسی عرب شہزادیاں لشکر کے ہمراہ بدر کا بدلہ چکانے آئی تھیں۔ میں ان کی پازیبوں اور چوڑیوں کی جھنکار اپنے ارد گرد سن رہی تھی، جو اپنے مردوں کے جذبات ابھار رہی تھیں مجھے وادی قناۃ کی مغربی سمت سے ان کے نغمے گونجتے سنائی دے رہے تھے

ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں

ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں

اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی

پیچھے ہٹو گے تو الگ ہو جائیں گی

اور کبھی یہ عورتیں مقتولین بدر کے مرثیے پڑھ کر اپنے مردوں کے خون کو گرما رہی تھیں،

اسی وادی قناۃ میں مشرقی جانب جہاں مسلمانوں کا پڑاؤ تھا میں ام المومنین سیدہ عائشہؓ اور سیدہ ام سلیمؓ کو پائنچے چڑھائے، مشکیزے اٹھائے دوڑتے بھاگتے دیکھ رہی تھی، ام عمارہؓ کو بجلی کی مانند کوندتے دیکھ رہی تھی، حناس کے خوبصورت بیٹے مصعب بن عمیرؓ کو شہید ہوتے دیکھ رہی تھی، سیدنا علیؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا حمزہؓ کو صفیں الٹتے دیکھ رہی تھی رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ پر دل برداشتہ ہو کر سیدنا عمرؓ کو ہتھیار پھینکتے دیکھ رہی تھی، وحشی کو عیار لومڑی کی طرح سیدنا حمزہؓ کا تعاقب کرتے دیکھ رہی تھی۔ ہند بنت عتبہ کو سیدنا حمزہؓ کا کلیجہ چباتے دیکھ رہی تھی کہ جنگ بدر میں سیدنا حمزہؓ نے ہی ہند کے باپ عتبہ کو مبارزت طلبی میں قتل کیا تھا۔

اور

سیدہ فاطمہؓ کو باپ کے زخم دھوتے دیکھ رہی تھی

احد کے چپے چپے میں ہماری تاریخ رقم ہے۔

قدیم مسجد قبلتین

مسجد قبلتین (یعنی دو قبلوں والی مسجد)

مسجد قبلتین

جبل احد سے واپسی پر ظہر کی نماز کے لئے ہم مسجد قبلتین پہنچے یہ مسجد مدینہ منورہ سے شمال مغرب میں ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے پر واقع ہے یہ مسجد تعمیراتی اعتبار سے بہت سادہ، مگر دل کو بھاتی ہے۔ بیس بائیس کشادہ زینے طے کر کے مسجد میں پہنچیں تو نیچے مردوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے جب کہ مصلی النساء اوپر ہے۔ یہی وہ مسجد ہے جس میں نماز کے دوران تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، جس کی وجہ سے دو رکعت بیت المقدس اور دو رکعت بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ادا کی گئیں۔ اسی وجہ سے یہ مسجد قبلتین کے نام سے مشہور ہوئی۔

عہد رسالت میں یہ قبیلہ بنو سلمہ کی، ایک قدرے اونچے ٹکرے پر بنی ہوئی معمولی سی مسجد تھی۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اسی قبیلے کی ایک خاتون ام بشیر بن براء بن معرور کی عیادت کے لئے گئے۔ انہوں نے آپ ﷺ کے لئے کھانا تیار کیا، اسی اثناء میں ظہر کا وقت ہو گیا آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ بنو سلمہ کی اسی مسجد میں نماز با جماعت ادا فرما رہے تھے، پہلی دو رکعت بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کر چکے تھے کہ بیت اللہ کی طرف رخ کر لینے کا حکم آ گیا۔ اس پر آپ ﷺ فوراً کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ بیت المقدس مدینہ منورہ سے عین شمال میں واقع ہے اور بیت اللہ بالکل جنوب میں، قبلہ تبدیل کرتے ہوئے لامحالہ آپ ﷺ چل کر مقتدیوں کے بالکل پیچھے آئے ہوں گے، اسی طرح تمام مقتدی بھی اپنی پشت کی طرف پلٹ گئے ہوں گے۔

یہ واقعہ ہجرت کے سترھویں مہینے یعنی ۱۵ رجب ۲ھ بروز پیر پیش آیا تھا۔ ابتداء میں مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے ہجرت کے بعد بھی تقریباً ڈیڑھ سال تک بیت المقدس ہی قبلہ رہا۔ لیکن اس تمام عرصے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ دلی تمنا رہی کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔ بالآخر اس روز عین حالت نماز میں پیغام لانے والا یہ پیغام لے کر آیا:

جنگ خندق میں رسول اللہ کا خیمہ تھا اب مسجد فتح کہلاتی ہے۔ ۱۹۸۶ء
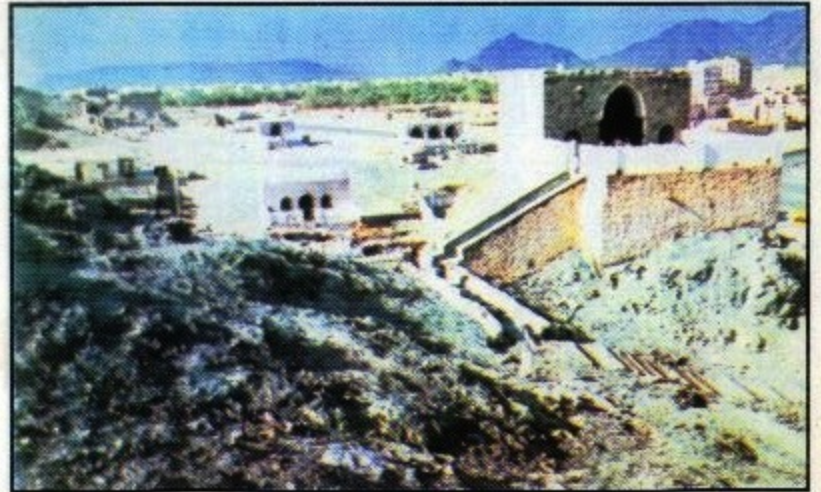
جبل سلع پر مسجد فتح اور دامن میں خمسہ مساجد کا ایک منظر

'یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں

لو ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو

مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف رخ پھیر دو

اب جہاں کہیں تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو'۔

(البقرہ۔۱۴۴)

محمد عاصم صاحب مسجد قبلتین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'یہ دراصل بنوسلمہ کی مسجد تھی۔ کہتے ہیں کہ لوگ اس مسجد میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کی وحی نازل ہوئی ہے تو لوگوں نے نماز ہی میں بیت المقدس کی طرف منہ پھیر کر بیت اللہ کی جانب رخ کر لیا'۔

(سفرنامہ ارض القرآن: ص ۲۲۹)

یہ بات درست نہیں ہے۔ نماز کی امامت، بنوسلمہ کی مسجد میں خود رسول اللہ ﷺ کرا رہے تھے۔ چنانچہ اس مسجد کو تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی، تمام مساجد کے قبلے تبدیل کرا دیے گئے۔ مسجد نبوی کا قبلہ بھی تبدیل ہوگیا زائرین مسجد قبلتین کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور یہاں دوگانہ پڑھتے ہیں پہلے مسجد میں دو محرابیں بنی ہوئی تھیں ایک کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا اور دوسری کا بیت اللہ کی طرف، تاہم اب بیت المقدس کی طرف والی محراب توڑ دی گئی ہے۔ مسجد قبلتین میں ہم نے ظہر کی نماز کی ادائیگی کی میں مسجد میں تھی کہ مجھے میمونہ کے ساتھ ہونے والا دلچسپ واقعہ یاد آنے لگا۔

میمونہ پاکستان ایمبیسی اسکول، ریاض کی ٹیچر تھی اور میری اچھی دوست، عمرہ ادا کرنے آئی، مسجد قبلتین میں وہ اور اس کی سہیلی جب نماز پڑھنے پہنچیں تو چار پانچ پاکستانی خواتین میمونہ کے پاس آئیں اور کہا۔

'تسی قبلے دی طرف منہ کار کے نماز نہیں پڑھ سکدے'۔

وہ کیوں۔ میمونہ نے پوچھا

'کیوں کہ ایہہ مسجد کبلتین آ ہے۔ اس مسجد دے واسطے حوکم اے کہ نماز بیت المقدس دی طرف منہ کار کے پڑھی جاوے'۔

میمونہ کہتی ہے کہ میں نے سوچا کسی سے پوچھوں مگر اس وقت مسجد کا مصلی النساء بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ یا میمونہ اور اس کی سہیلی تھی یا پھر پاکستانی خواتین کا وہ جتھا جو انہیں قبلہ رخ ہو کر نماز نہیں پڑھنے دے رہا تھا۔ خود ان خواتین نے بھی قبلہ کے برعکس ہو کر نماز ادا کی تھی۔

'لیکن میرے میاں نے یہی بتایا ہے کہ قبلہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنی ہے'۔ میمونہ نے انہیں قائل کرنا چاہا

'اونا.... نا.... اوناں نوں بے چارے توں کی پتہ.... تسی ایس طرف منھ کار کے نماز پڑھو'۔

ان خواتین نے بازوؤں سے پکڑ کر میمونہ اور اس کی سہیلی کو پھر پشت کی طرف پھیر دیا۔ میمونہ کہتی ہے کہ وہ خواتین اس قدر اعتماد سے کہہ رہی تھیں کہ وہ انہیں کو درست سمجھی۔ چنانچہ ان دونوں نے قبلہ سے رخ پھیر کر نماز ادا کی اور کچھ دیر تسبیح وتہلیل کے بعد باہر آ گئیں۔ وہ خواتین بھی چلی گئیں۔

جب میمونہ نے بعد میں اپنے میاں کو یہ قصہ سنایا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور غلطی کے ازالے کے لئے دوسرے دن پھر دونوں خواتین کو مسجد قبلتین لے کر آئے تا کہ اب یہ قبلہ رو ہو کر صحیح طریقے سے نماز ادا کر لیں۔ اتفاق کی بات کہ وہی چاروں، پانچوں خواتین انہیں سیڑھیوں پر ہی مل گئیں۔

'یہ ہیں وہ عورتیں'!

میمونہ نے اپنے میاں کو بتایا، تو وہ اپنے دوست کے ساتھ قدرے غصے میں ان عورتوں کی طرف بڑھے۔ ان میں سے جو کل سب سے زیادہ وعظ جھاڑ رہی تھی ایک دم ہی میمونہ سے آ کر کہنے لگی

'ہنڑ حوکم آ گیا ہے۔ ہنڑ قبلے دی طرف ہی منھ کرنا اے جی'۔

اور اپنے جتھے سمیت یہ جا، وہ جا

میمونہ کہتی ہے میرے میاں کا غصہ کافور ہو گیا اور وہ کافی دیر تک 'ہنڑ حوکم آ گیا ہے' پڑھتے رہے۔

اس مسجد کے پاس ہی وہ پرانا کنواں ہے جسے بئر رومہ کہا جاتا ہے۔ عہد رسالت ﷺ میں یہ کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا اور وہ مسلمانوں کو اپنے کنویں کا پانی قیمتاً بیچا کرتا تھا۔ مدینہ میں مسلمانوں کو پانی کی تکلیف تھی جب کہ بئر رومہ کا پانی میٹھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا 'جو آدمی اسے خرید کر وقف کر دے۔ اس کے لئے کتنا ہی عمدہ صدقہ جاریہ ہوگا'۔

حضرت عثمانؓ جو اس قسم کے سودوں کی تلاش میں رہتے تھے تیس ہزار درہم اور ایک دوسری روایت کے موجب پینتیس ہزار درہم میں یہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا یہ اطلاع جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو انہوں نے دعا کی:

'اے اللہ عثمانؓ کے لئے جنت واجب کر دے'

تاریخ میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ سیدنا عثمانؓ نے ابتداً نصف کنواں خریدا۔ یعنی ایک دن مسلمان پانی بھریں اور دوسرے دن دوسرے لوگ۔ لیکن جب کنویں کے مالک نے حضرت عثمانؓ سے شکایت کی کہ مسلمان دو دن کا پانی ایک ہی دن میں بھر لیتے ہیں تو حضرت عثمانؓ نے بقیہ نصف بھی خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کی بعد ہی یہ کنواں 'بئر عثمان' کہلانے لگا تھا۔

اپنے خلافت کے آخری ایام میں جب سیدنا عثمانؓ، عربی فتنے کی لپیٹ میں آ گئے اور باغیوں نے انہیں ان کے گھر میں قید کر دیا اور ان پر باہر سے خوراک اور پانی بند کر دیا تو خلیفہ مظلوم نے کہا تھا۔

'لوگو! تم جانتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے، تو اس وقت بئر رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کون شخص اسے خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کرتا ہے۔ اور اسے اس سے بہتر جنت میں ملے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ذاتی مال سے اسے خرید کر وقف کر دیا، اب تم مجھے اس کے پانی سے بھی محروم کر رہے ہو''؟

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسجد قبلتین کے قریب ہی بئر عثمان موجود ہے ورنہ ہم وہاں ضرور جاتے(۱)۔ سنا ہے کہ موجودہ حکومت نے اس کی قریب باقاعدہ ڈیری فارم اور پولٹری فارم قائم کر دیئے ہیں اور کنویں میں چار پانچ انچ موٹا پائپ لگا دیا ہے جو ہر وقت پانی کھینچتا رہتا ہے۔ اب یہ کنواں مسجد نبوی کے اوقاف میں شامل ہے۔

مسجد قبلتین کے مغرب میں وادی عقیق ہے جو مدینہ منورہ کی سب سے مشہور وادی ہے اور ایک زمانہ میں خلفاء اور امراء کے محلات کی وجہ سے مشہور تھی۔ اموی عہد میں یہ اہل مدینہ کی تفریح گاہ تھی۔ یہاں بے تکلف احباب کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا تھا۔ وادی عقیق کی ادبی مجالس کے تذکرے سے کتاب الاغانی کے اوراق معمور ہیں۔

---

(۱) ۲۰۰۰ء کے سفر عمرہ میں ہم اس جگہ پہنچے، اس کا احوال آگے بیان کیا گیا ہے۔

وہی وادیٔ عقیق اب ہماری نظروں کے سامنے تھی، خدا جانے اب بھی اسے اسی نام سے یاد کرتے ہیں یا اس جگہ کا کوئی اور نام ہو گیا ہے، خلفاء امراء اور شعراء کے جن محلات کا تذکرہ تاریخ کی کتب میں ملتا ہے ، وہ محلات اب خواب و خیال ہو چکے ہیں، اس کے کھنڈرات بھی باقی نہیں، بلکہ اب مدینہ پھلتے پھلتے وادیٔ عقیق میں داخل ہو چکا ہے، چنانچہ اس وادی میں جدید طرز کے کئی کئی منزلہ مکانات اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

مسجد قبلتین (دو قبلوں والی مسجد) کی جزئیات کو آنکھوں میں سمیٹتے ہم پھر گاڑی میں آ بیٹھے ''آئیں اب آپ لوگوں کو جبل سلع لے چلتے ہیں جہاں جنگ خندق ہوئی تھی''۔ سجاد نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور ہم جبل سلع کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆☆☆

جبل سلع

جبل سلع جس کے دامن میں خندق کی مشہور جنگ ہوئی تھی۔ مدینہ منورہ سے متصل شمال مغرب ہی کی سمت میں واقع ہے۔ یہ کافی بلند اور بڑا پہاڑ ہے اسی جبل سلع کے دامن میں تھوڑے فاصلے پر پانچ مساجد بنی ہوئی ہیں ان کو ''خمسہ مساجد'' کہتے ہیں۔ زائرین یہاں ہر مسجد میں دوگانہ نفل ادا کرتے ہیں۔

اسی جبل کے دامن اور اطراف میں آپؐ نے ۵ ھ میں خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کیا تھا۔ عہد رسالت میں مدینہ کی ایک سمت کھلی تھی' باقی تین اطراف میں مکانات اور گھنے نخلستان تھے جن میں سے دشمن گزر نہ سکتا تھا۔ ادھر کے راستے تنگ تھے اور مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت بھی دشمن کی بڑی سے بڑی قطاروں کو تیر اندازی سے روک سکتی تھی۔ مدینہ کی کھلی سمت کے بارے میں حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کیا جائے۔

اس جنگ میں صرف قریش مکہ ہی نہیں تھے بلکہ ساتھ کئی دیگر قبائل مثلاً غطفان' کنانہ' فزارہ اور بنو اسد وغیرہ بھی شامل تھے ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ رسول اللہ کو ان کی تیاریوں کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا تیزی سے خندق کھودی گئی۔ خندق کھودنے اور جنگ لڑنے والے مسلمان سپاہیوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ ہر دس آدمیوں کی ایک جماعت کو چالیس چالیس ذراع (ہاتھ) لمبی خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا۔ ان تین سو ٹولیوں میں سے ہر ایک نے بیس بیس گز یعنی کل ۲ ہزار گز یا تقریباً ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودی عموماً مورخین خندق کی چوڑائی اور گہرائی کا تذکرہ نہیں کرتے' مگر گھوڑا چھلانگ نہ سکنے کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دس گز چوڑی اور شاید پانچ گز گہری تھی۔ حضرت سلمان فارسیؓ قوی ہیکل تھے۔ لہٰذا انہوں نے دوسروں کے کوٹے سے زیادہ خندق کھودی۔ یہ خندق بیس دن میں بن کر تیار ہو گئی تھی۔ ہم اسی جگہ کھڑے تھے مگر دائیں بائیں آگے پیچھے کہیں ہلکا سا شائبہ بھی خندق کا نہیں تھا۔ خندق کی کھدائی میں رسول اللہ ﷺ بھی عام سپاہیوں کی طرح شامل تھے چونکہ آپؐ اس پورے کام کے نگران تھے لہٰذا آپ کا

خیمہ وہیں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا دیا گیا تھا' وہ جگہ اب مسجد ذباب کے نام سے مشہور ہے۔

جبل سلع کے شمال میں اس سے متصل ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا پہاڑ ہے۔ اسی پہاڑ پر وہ مسجد ہے جسے مسجد ذباب کہتے ہیں۔ ہم نے اس مسجد کا نیچے سے کھڑے کھڑے ہی نظارہ کیا تھا چونکہ بلندی خاصی تھی لہٰذا روزے میں اوپر جانے کی ہمت نہ پڑسکی۔ ہم اسی جبل سلع کے دامن میں چل پھر رہے تھے جہاں ڈیڑھ ہزار سال قبل رسول اللہ کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔

کفار کے احزاب شمال مغرب کی طرف سے مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے۔ جب وہ وادی عقیق میں داخل ہوئے تو انہیں ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ اس سے قبل ان کا سابقہ کسی خندق سے نہیں پڑا تھا خندق اتنی چوڑی تھی کہ گھوڑا ایڑ لگا کر بھی نہیں پار کر سکتا تھا۔ قریش وادی عقیق میں ہی خیمہ زن ہو گئے اور مدینہ کا ایک طرح محاصرہ کر لیا گیا۔ تین ہزار مسلمان رضا کار جبل سلع کے دامن میں خیمہ زن ہو کر شہر کی مدافعت کرنے لگے۔

جہاں آج مسجد فتح ہے' یہ وہ مقام ہے جہاں محاصرہ شروع ہونے پر رسول اللہ کا خیمہ منتقل ہوا۔ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا تھا' جب مسلمانوں پر شدت بڑھنے لگی تو رسول اللہؐ نے متواتر تین دن تک اسی مقام پر اللہ تعالٰی کے حضور دعا کی تھی کہ وہ کفار کے لشکروں کو تتر بتر کر دے اور مدینہ اور اہل مدینہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے' پیر' منگل اور بدھ تین دن تک دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا بالآخر تیسرے دن دعا قبول ہو گئی۔ اسی لئے اس کو مسجد فتح کہتے ہیں۔

دعا کی قبولیت کے وقت گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ دونوں طرف سے تیروں اور پتھروں کی نا ختم ہونے والی موسلا دھار بارش برس رہی تھی' مسلمانوں کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں تھی اس دن چاروں نمازیں قضا ہو گئیں' جو رات عشاء کے ساتھ پڑھی گئیں۔

مگر اسی رات تیز و تند آندھی آئی' جس نے احزاب کے خیموں کو اکھاڑ دیا' ان کے برتن اوندھا دیئے' سپاہیوں اور جانوروں کے منہ اور آنکھوں میں خاک بھر گئی ہم مسجد فتح تک جانے کے لئے کچے پکے زینے طے کر رہے تھے' میرے ارد گرد خندق کا میدان پھیلا ہوا تھا اور میں تصور کی آنکھ سے خدا کے وعدے کو پورا ہوتے دیکھتی رہی۔

یوں بھی وہ سردیوں کے دن تھے' سردی کی سیاہ اور مہیب رات' اچانک آپڑنے والی طوفانی

آندھی......دن بھر کے تھکے ہوئے لشکر کی گھبراہٹ......ان کے خیموں کی طنابوں کا اکھڑنا............برتنوں کا اوندھا ہو جانا...... ہلکے سامان کا اڑتے پھرنا............ چند گز فاصلے کی چیز کا نظر نہ آنا............اور وہ فوج جس میں چند دن قبل سے ہی اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ واپسی کا بگل بجا بیٹھی۔

اسی بات کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ احزاب میں ملتا ہے۔

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔
جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر سخت آندھی بھیج دی۔
اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔
اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔''

(الاحزاب......۹)

مسجد فتح' دیگر مساجد خمسہ کے مقابلے میں قدرے بلندی پر واقع ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ جنگ خندق کے دوران رسول اللہ کا خیمہ یہاں تھا اور وہ اس جنگ کو یہاں سے کمان کر رہے تھے تو مسلمانوں کی عسکری دانشمندی کا قائل ہونا پڑے گا کیونکہ ہم بھی جب مسجد فتح میں پہنچے تو گویا پورا میدان جنگ نظروں کے سامنے تھا۔

مسجد فتح تک جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں لیکن اب انتہائی شکستہ اور ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ بہت سے زائرین ہمارے آگے پیچھے اوپر چڑھ رہے تھے اور بہت سے نیچے بھی اتر رہے تھے۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ہم نے خود صحن مسجد میں پایا۔ صحن مسجد کے آگے ایک محرابی در تھا جس سے کمرہ میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ اندر کمرے میں قالین بچھی ہوئی تھی' چند زائرین نماز ادا کر رہے تھے۔ سجاد مردوں کی طرف چلے گئے میں نے دوسرے کونے میں نیت باندھ لی۔ یہاں صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا اندر بچھی ہوئی قالین بھی بدرنگ' پرانی گندی لگ رہی تھی۔

دوگانہ پڑھ کر میں پھر صحن مسجد میں آ گئی' یہاں دیگر مساجد مسجد ذباب' وادی عقیق سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ جنگ خندق کے دوران اس جگہ کو رسول اللہؐ Watch Tawer کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔

''ہاں بھئی نگار' آگے چلنے کا ارادہ نہیں ہے' باقی مساجد میں بھی نمازیں پڑھنی ہیں۔''

سجاد نے میری محویت کو توڑا تو ہم دیگر مساجد کی طرف روانہ ہوئے۔ ان میں سے ایک مسجد

علی تھی۔ ایک مسجد سلمان فارسی' ایک مسجد ابوبکر' ایک مسجد عمر اور ایک مسجد فاطمہ۔ ان میں سے مسجد ابوبکر قدرے بڑی اور کشادہ ہے جب کہ مسجد فاطمہ سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ یہ اتنی چھوٹی مسجد ہے کہ چار پانچ سے زیادہ افراد ایک ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتے لہٰذا یہاں نماز ادا کرنے کے لئے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ چند مرد زائر اندر نماز پڑھ رہے تھے۔ سجاد بھی چلے گئے' میں ان سب کے باہر آنے کا انتظار کرتی رہی اور مسجد کے باہر ہی تھڑے پر بیٹھی رہی جس پر درختوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

صفائی کا جو تصور سعودی عرب کے ساتھ وابستہ ہے وہ ان مساجد میں بالکل نظر نہیں آیا۔ یہاں کی قالینیں گرد آلود اور بوسیدہ تھیں' صحن مسجد میں بھی گرد اور مٹی کی حکمرانی تھی' جب کہ مساجد کے باہر سارا علاقہ صاف ستھرا ہے۔ چوڑی سڑکیں' صاف ستھرے راستے' جدید پارکنگ لاٹ اور مشروبات کارنر۔

ان مساجد کے بارے میں ایک غلط العام خیال یہ ہے کہ جنگ خندق کے دوران جن اصحاب کے جہاں خیمے تھے وہیں مسجدیں بن گئیں۔ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ان مساجد میں سے مسجد عمر اور مسجد فاطمہ کا عہد رسالت میں پتہ بھی نہیں چلتا' ابتداً یہ صرف تین مساجد تھیں اور مسجد عمر اور مسجد فاطمہ انیسویں صدی کی تعمیرات ہیں۔ ان مساجد کی وجہ تسمیہ بھی سمجھ میں نہیں آتی نہ ہی ان کی تعمیرات کا عرصہ متعین ہو سکا ہے۔ ان تمام معلومات کی عدم فراہمی کے باوجود زائرین ان مسجدوں میں نمازیں ادا کرتے ہیں۔

ان زیارتوں کے بعد روزے کی وجہ سے تھکن بڑھنے لگی تھی لہٰذا ہم نے گھر کا راستہ لیا' نماز عصر کی ادائیگی کے بعد ہم کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے اس دن مختار بھائی اور شاہین باجی کہیں افطار پر مدعو تھے لہٰذا سجاد بازار سے افطاری کا سامان لے آئے۔ مغرب کی نماز میں نے گھر پر پڑھی پھر عشاء کی نماز اور تراویح کے لئے مسجد نبوی گئے چونکہ دن بھر کی تھکن تھی لہٰذا تراویح کی دس رکعتیں پڑھ کر ہم واپس آ گئے مسجد نبوی میں تراویح کی دس رکعتوں کے بعد امام صاحب تبدیل ہو جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ کسی وجہ سے پوری تراویح نہیں پڑھ پاتے وہ اسی تبدیلی کے وقت جماعت سے ہٹ جاتے ہیں۔

رات دو بجے پھر میں اور سجاد نماز تہجد کے لئے مسجد نبوی گئے۔ پھر گھر واپس آ کر سحری کی' پھر فجر کی نماز کے لئے مسجد نبوی گئے' واپسی میں اس بری طرح تھک چکے تھے کہ وہ شعر صادق آتا تھا۔

جاتے میں قدم اور تھے آتے میں قدم اور

گھر واپس آ کر بے سدھ ہو کر سو گئے

حرم تا حرم

۲۶ واں روزہ تھا اور مارچ ۹۱ء کی ۲۹ ویں تاریخ جب ہم مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے، میں اپنی زندگی کا پہلا عمرہ شب قدر میں کرنا چاہتی تھی۔ دوپہر پونے دو بجے کے قریب ہم میقات یعنی ابیار علی جسے ذی الحلیفہ بھی کہتے ہیں' پہنچ گئے۔ سجاد اور سعود نے گھر سے ہی احرام باندھ لیا تھا جب کہ میں ثناء اور سعدیہ میقات پر آ کر احرام بند ہوئے۔ میقات کی ساری مسجدیں نہایت وسیع و عریض اور شاندار ہیں۔ بے شمار بیت الخلاء، بے شمار غسل خانے، طول طویل راہداریاں، کھلا پانی، ماند پڑنے والی روشنیاں۔

احرام باندھ کر دو رکعت نفل نماز کی ادائیگی کی، عمرہ کی نیت کے ساتھ ہی زیر لب تلبیہ پڑھتے ہوئے ہم تینوں باہر آئے تو سجاد اور سعود گاڑی میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے، دو بج کر بیس منٹ پر ہم میقات سے مکہ روانہ ہو گئے۔ ہم جس شاہراہ پر تھے یہ 'طریق ہجرت' کہلاتی ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جس سے ڈیڑھ ہزار سال قبل رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ آئے تھے۔ اس وقت ان کا سفر بائیس دن میں ختم ہوا تھا، آج کل آپ اپنی گاڑی یا بس میں چار سے پانچ گھنٹوں میں مکہ سے مدینہ آ جا سکتے ہیں۔

'طریق ہجرت' پر ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی، دونوں اطراف میں منظر بدلتے جا رہے تھے، کبھی نظروں کے سامنے تا حد نگاہ صحرائی سلسلہ پھیلا ہوتا تو کبھی پیلی، کتھئی چٹانوں کا سلسلہ۔ جتنا آرام دہ سفر ہم کر رہے تھے، ڈیڑھ ہزار سال قبل کی بات تو چھوڑیے، نصف صدی ادھر بھی یہ سفر سخت جان لیوا ہوا کرتا تھا لوگ مکہ حج کرنے کے بعد مدینہ عموماً اونٹوں پر ہی آیا کرتے تھے، اور بہت سے ہندوستانی (کہ اس وقت پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا) مسلمان جوان صحرائی تمازتوں کو برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے، حرم تا حرم سفر کے دوران ہلاک ہو جاتے تھے۔

اب جو آسانیاں ہیں اس کی بات ہی کیا، سیاہ اسفالٹ کی چوڑی کشادہ سڑک مکہ تا مدینہ پھیلی ہوئی ہے۔ دیکھا جائے تو صرف اس ایک سڑک کی بدولت ہی ہم کتنی آسانی میں تھے، گاڑی کی لمبی چوڑی

ڈگی میں ضرورت کا سارا سامان موجود تھا، پانی کا مناسب ذخیرہ بھی تھا، گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر اے۔سی چل رہا تھا، لہٰذا موسم کے شدائد سے بھی محفوظ تھے، اس سفر میں سفر والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم پانچویں بڑی سہولت میں تھے۔

....

وہ چار تھے

محمد ﷺ، ابوبکر صدیقؓ، عامر بن فہیرہؓ اور عبداللہ ابن اریقطؓ

۲۷ صفر ۱۳ نبوی، جمعرات کا دن تھا یعنی ۱۲ ستمبر ۶۲۱ء جب رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تاکہ آپ ﷺ کو قتل کیا جاسکے، آپ ﷺ عین محاصرے کی حالت میں رات کے کسی پہر اپنے گھر سے نکل کر ابوبکر صدیقؓ کے پاس پہنچے، جو پہلے سے ذہنی طور پر اس ہجرت کے لئے تیار تھے، دونوں رفیق خاموشی سے مکے سے نکل گئے، جاتے ہوئے ایک گہری نظر مکہ پر ڈالی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، مگر تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔'

رسول اللہ ﷺ نے سیدھا مدینہ کا راستہ نہیں پکڑا بلکہ مکہ سے نکل کر مدینہ کے مخالف سمت جبل ثور میں آ کر چھپ گئے۔ یہ غار مکہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ مع ابوبکرؓ کے تین دن تک اس غار میں رہے۔ ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، دن بھر مکہ میں کفار کے ارادوں اور مشوروں کا پتہ لگاتے تھے اور شام کو غار میں آ کر سنا دیتے، ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہؓ، جو مسلمان ہوگیا تھا، اپنی بکریاں چراتا ہوا ان تک پہنچتا، انہیں دودھ پلاتا، اور واپس چلا جاتا، اس کے ریوڑ سے عبداللہ ابن ابوبکرؓ کے نقش قدم بھی مٹ جایا کرتے۔

تین دن بعد عبداللہؓ کی رپورٹ کے مطابق کفار مکہ کی تلاش تقریباً ختم ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ، ابوبکر صدیقؓ، عامر بن فہیرہؓ اور ایک راہبر عبداللہ ابن اریقط عازم مدینہ ہوئے قریش کا خطرہ بالکل ختم نہیں ہوا تھا لہٰذا مدینہ جانے والا عام راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی، اور چونکہ اس راہ سے زیادہ واقفیت نہ تھی، لہٰذا عبداللہ ابن اریقط کی خدمات حاصل کی گئیں۔

یہ چاروں رات میں سفر کرتے اور دن میں روپوش رہتے۔ یہ بات شاید سب کو معلوم ہوگی کہ رات میں صحراؤں کا سفر انتہائی اعصاب شکن ہوتا ہے جب کہ چاند بھی ابتدائی دنوں کا ہو۔ قدیم زمانے

میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان مختلف راستوں سے سفر کیا جاتا تھا بعض راستے قدرے قریب تھے مگر دشوار گذار ہونے کی علاوہ ان میں پانی کی بھی قلت تھی، جب کہ بعض راستے طویل ہوتے، سفر بھی دشوار ہوتا مگر پانی مل جاتا تھا۔ جہاں پانی ملتا مسافر پڑاؤ کرلیا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں مدینہ اور مکہ کے درمیان گیارہ منزلیں یعنی پڑاؤ تھے اور اونٹوں کے ذریعہ گیارہ دن رات میں یہ سفر طے ہوجاتا تھا، مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ کا قافلہ دن میں سفر نہیں کرتا تھا لہٰذا بائیس دن لگ گئے۔

....

ہمارا خیال تھا کہ بغیر رکے چار گھنٹے میں مکہ پہنچ جائیں گے اور روزہ وہیں افطار کریں گے، مکہ میں ہمارا قیام سجاد کی پھوپی زاد بہن راحیلہ اور ان کے شوہر سجاد کبیر کے یہاں تھا جو مسجد عائشہ جسے مسجد تنعیم بھی کہتے ہیں کے پاس مقیم تھے اور جن کو ہم اپنی آمد کی اطلاع اور متوقع وقت بھی بتا چکے تھے، لیکن ہم سوچتے کچھ ہیں ہو کچھ جاتا ہے۔ چنانچہ راستہ میں، جب کہ نصف سے زائد سفر طے ہو چکا تھا، ایک خوبصورت سا ریسٹ ہاؤس، پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی نظر آیا، سجاد نے تھوڑی دیر ستانے کے خیال سے گاڑی مرکزی شاہراہ سے داہنی جانب، ریسٹ ہاؤس کی طرف جانے والی کچی سڑک پر اتار دی۔ یہ ریسٹ ہاؤس ابھی بن رہا تھا۔ کچی سڑک پر اتارتے ہی نہ صرف گاڑی کا ٹائر بری طرح پنکچر ہوگیا بلکہ اور کوئی خرابی بھی پیدا ہوگئی۔

سجاد ستاتے تو کیا الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ پہلے وہ ریسٹ ہاؤس گئے جہاں سے پتہ چلا کہ ابھی ان کی خدمات کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ پھر پیٹرول پمپ پر گئے جہاں پتہ چلا کہ ورکشاپ نہیں ہے۔ جو مزدور ریسٹ ہاؤس میں کام کر رہے تھے انہوں نے ہماری پریشانی کو دیکھتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں اور ان میں سے ایک اپنی گاڑی پر سجاد کو لے گیا تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ مکینک سمیت واپس آئے۔ اس دوران پہلے تو میں پچھلی سیٹ پر لیٹی رہی، بعد میں جب بچوں نے بھی سونے کی کوشش کی تو میں پچھلی سیٹ سے پسپا ہو کر زمین پر آلیٹی۔ گاڑی کی اوٹ میں چادر بچھا کر سڑک پر سونے کا یہ پہلا اتفاق تھا جو تا حال آخری بھی ثابت ہوا۔ اصل میں مدینہ کے قیام کے دوران نیند بالکل بھی پوری نہیں ہوسکی تھی اور کچھ روزے کی نقاہت بھی تھی لہٰذا جس طرح لوگوں کو کانٹوں پر نیند آجاتی ہے مجھے سڑک پر آنے لگی لیکن سجاد، مکینک سمیت واپس آچکے تھے لہٰذا اٹھنا پڑا۔

اس مکینک نے ٹائر بدلنے کے علاوہ کچھ اتنا کام کردیا کہ گاڑی چلنے کی پوزیشن میں آ گئی مگر اس کا مشورہ یہی تھا کہ ہائی وے پر پڑنے والی سب سے پہلی ورکشاپ سے رجوع کیا جائے، مسئلہ کچھ اور بھی تھا۔

ہم آہستہ آہستہ گاڑی کچے سے نکال کر پھر ہائی وے پر آ گئے، ایک گھنٹہ ضائع ہو چکا تھا، اب یقیناً ہمارا روزہ راستے میں کھلنا تھا۔ خاصی کم رفتار پر گاڑی چلاتے ہوئے سب سے پہلے پڑنے والی ورکشاپ میں ہم رک گئے۔ یہاں ایک گھنٹہ مزید لگ گیا شام اترنے لگی تھی، ہمارے پاس روزہ افطار کرنے کے لئے کوئی سامان نہیں تھا تاہم یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی، یہاں ہائی ویز پر بہتیرے 'مسافر نواز' ہیں۔ کسی بھی پیٹرول پمپ پر رک جایئے، ایک چھوٹی سی سپر مارکیٹ یا بقالہ، ایک ہوٹل، مسجد، غسل خانہ سب کچھ مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا ایک ایسی ہی جگہ رک کر ہم نے روزہ افطار کیا، مغرب کی نماز پڑھی اور مکہ کی طرف چل پڑے، رات آٹھ بجے کے قریب ہم طے شدہ مقام پر پہنچ گئے جہاں سجاد بھائی نے آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ظاہر ہے ہمارے ورود کے وقت میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی، لہٰذا سجاد نے کسی دوکان سے انہیں فون کیا، ان کے آتے آتے ہم تھک کر شل ہو چکے تھے۔ گھر پہنچے تو راحیلہ نے پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حرم جانے کی فکر شروع ہوئی۔

گھر والوں کا مشورہ بھی یہی تھا اور ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ بچوں کو آج حرم نہ لے جایا جائے کیوں کہ یہ سارے دن کے جاگے ہوئے ہیں، پھر سارے دن کا سفر ہے، رات، اور وہ بھی مشقت کی رات جاگنا ان کے بس کی بات شائد نہ ہو۔

"آج تو وہاں حج والا رش ہوگا" سجاد بھائی نے کہا "بچے کچلے جائیں گے، آپ دونوں جائیں انہیں ہمارے پاس چھوڑ دیں، رات تو ہو ہی گئی ہے، تھکے ہوئے ہیں سو جائیں گے"۔

بچے واقعی تھکے ہوئے تھے پھر راحیلہ کے بچے، رابعہ، علی اور عمر میرے بچوں کی طرح بڑے بے تکلف بچے تھے، لہٰذا پہلے ہی گھنٹے میں چھیوں بچوں کے سفارتی تعلقات جڑ گئے، انہوں نے ہمارے ساتھ جانے کی ضد نہیں کی یوں ہم عمرہ کے لئے روانہ ہوئے۔

"گاڑی نہ لے جائیں"۔ سجاد بھائی نے دوسرا مشورہ دیا "بہت پیچھے روکنی پڑے گی، حرم کے پاس کا سارا علاقہ گاڑیوں کے لئے بند کردیا گیا ہے، مسجد عائشہ کے پاس سے بسیں چل رہی ہیں وہ قریب ترین جگہ پر اتار دیں گی وہاں سے آپ لوگ پیدل چلے جائیں"۔

ہم نے گاڑی بھی چھوڑ دی اور مسجد عائشہ کی طرف چل پڑے، مسجد عائشہ جسے مسجد تنعیم بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ والوں کا میقات ہے یہ مسجد حدود حرم سے باہر ہے اور مدینہ روڈ پر واقع ہے۔ مسجد بہت کشادہ ہے اور تعمیراتی اعتبار سے جدید اور خوبصورت ہے، اردگرد سبزہ بھی ہے اور پھولوں کے تختے بھی۔ مسجد عائشہ کے سامنے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس آئی جو جلد ہی بھر گئی، ہمیں بھی پچھلی نشستوں پر جگہ مل گئی اور ہم مسجد حرام کی طرف چل پڑے۔ تنعیم کا علاقہ میقات ہونے کی وجہ سے برکت اور اہمیت کا حامل تو ہے لیکن ہماری تاریخ کا ایک بڑا ہی دردناک واقعہ اس جگہ سے متعلق ہے۔

یہ ۴ھ کا واقعہ ہے، اور تاریخ میں 'واقعہ رجیع' کے نام سے مشہور ہے قبیلہ خزیمہ کی دو شاخوں عضل اور قارہ کے چند آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں، اگر آپ ﷺ چند صحابہ کو بھیج دیں کہ وہ ان مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں تو بہت مناسب ہو (ابھی بئر معونہ کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا) رسول اللہ ﷺ نے مرثد غنویؓ کو مع پانچ آدمیوں کے، ساتھ کردیا گویا چھ معلمین کا قافلہ ان لوگوں کے ساتھ چل پڑا۔ مقام رجیع میں پہنچ کر ان لوگوں نے بدعہدی کی اور قبیلہ ہذیل کے دو سو آدمیوں کو ان چھ صحابہ کے قتل کے لئے بلا لائے۔

مرثد غنویؓ اور ان کے اصحاب بنو ہذیل کے آدمیوں کو دیکھ کر گھبرائے اور مجبوراً مدافعت کے لئے تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ کافروں نے فریب دینے کے لئے ان سے کہا کہ ہم تم کو امان دیتے ہیں۔ قتل نہیں کرنا چاہتے مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ سے ہم کچھ وصول کر سکیں۔

مسلمانوں نے امان قبول نہیں کی، انہوں نے اپنی بدعہدی کا مظاہرہ تو کر ہی دیا تھا، مسلمان کیسے اب ان غداروں کی امان قبول کر لیتے، تین صحابہ تو بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، باقی کو انہوں نے گرفتار کر لیا، ایک صحابی کو راستہ میں مار ڈالا اور دو جن کے نام خبیبؓ اور زیدؓ تھے مکہ لے جا کر قریش کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت زیدؓ کو صفوان بن اُمیہ نے خریدا اور حضرت خبیبؓ کو حارث کے بیٹوں نے مول لیا، تا کہ اپنے باپ کا بدلہ لیں، حضرت خبیبؓ نے احد کی جنگ میں حارث کو قتل کیا تھا۔ کچھ عرصہ رکھنے کے بعد اہل مکہ انہیں لے کر مکہ سے باہر چلے تا کہ قتل کیا جائے، اور مقام تنعیم میں لا کر ان دونوں کو ذبح کر دیا۔

''اگر تمہاری جگہ پر یہاں آج محمدؐ قتل کئے جاتے اور تم اپنے گھر میں آرام سے رہتے تو کیا خوش نہ ہوتے۔'' ابوسفیان نے قتل سے پہلے زیدؓ سے پوچھا۔

''خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھا رہوں اور رسول اللہ ﷺ کے پاؤں میں معمولی سا کانٹا بھی چبھے''۔

ابوسفیان ہی نہیں، اس جواب نے وہاں موجود ہر شخص کو حیرت زدہ کر دیا۔

''کسی شخص کو میں نے ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی اس کو اس قدر عزیز رکھتے ہوں جس قدر محمدؐ کے اصحاب ان کو عزیز رکھتے ہیں''۔ ابوسفیان بڑبڑایا۔

....

سڑک پر خاصا رش تھا، احرام میں ملبوس لوگ خاصی تعداد میں بسوں میں سفر کرتے اور پیدل چلتے نظر آ رہے تھے۔ ہماری بس بھی جو زائرین سے بھری ہوئی تھی مسجد حرام کی طرف رواں دواں تھی، لوگ اونچی آواز میں تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

حاضر ہوں۔ میرے اللہ میں حاضر ہوں۔

حاضر ہوں اور تیرا شریک کوئی نہیں میں حاضر ہوں۔

بے شک تمام تعریفیں اور تمام بادشاہی تیرے ہی لئے ہے۔

اور تیرا کوئی شریک نہیں!

ایک سماں بندھا ہوا تھا، ہم دن بھر کے تھکے ہارے اپنے اندر ایک نیا ولولہ اور جذبہ محسوس کرنے لگے۔ ہر شخص اپنی کیفیات کا قیدی تھا، ہر ایک کی منزل ایک ہی تھی، ہر ایک کے لب پر ایک ہی کلمہ تھا، حالانکہ رات خاصی ہو گئی تھی مگر دن کا سا رش تھا۔ یہ شب بھی تو سعادتوں والی شب تھی، شب قدر، جس رات قرآن نازل ہوا، اور جس رات فرشتوں کے پرے کے پرے، جبرئیل امین کی معیت میں اترتے ہیں، اور سب طرف پھیل جاتے ہیں، رحمتوں، برکتوں والی رات!!

ہم مکہ کی سڑکوں پر چلے جا رہے تھے، کم از کم مجھے راستوں کا کوئی شعور نہیں تھا، رش کی وجہ سے ٹریفک رواں نہیں تھا، ہمیں حرم پہنچتے پہنچتے تقریباً گھنٹہ لگ گیا، ایک جگہ بس رک گئی اور مسافر ایک ایک

کر کے بس سے اترنے لگے ہم بھی اتر گئے۔

'تھوڑا چلنا پڑے گا'۔ سجاد نے کہا اور ہم زائرین کے قافلے میں شامل مسجد حرام کی طرف چل پڑے۔

ایک جگہ ہم نشیب میں اترے تو آنکھوں کے سامنے ایک پرشکوہ سرمئی عمارت تھی۔

'یہ مسجد حرام ہے'۔ سجاد نے مجھے بتایا۔ عمارت کی شان وشوکت، اور عظمت وجلال نے مجھے تھوڑا سہا دیا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں وہ کون سا دروازہ تھا جس سے ہم اندر داخل ہوئے۔ لاکھوں افراد کو اپنے اندر سمو لینے والی مسجد، نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، تراویح کی نماز ادا کی جا رہی تھی ہم بھی نماز میں شریک ہو گئے۔ داہنی جانب خواتین کی صفیں تھیں اور بائیں جانب مردوں کی، درمیان میں کشادہ گذرگاہ تھی۔

تراویح کی وہ آخری رکعت تھی، اس کے بعد امام صاحب نے وتر پڑھائی، جس کی تیسری رکعت میں انہوں نے دعا کی، ایک طویل اور انتہائی پرسوز دعا، جس نے نمازیوں کو صرف رلایا نہیں بلکہ بلک بلک کر رونے پر مجبور کر دیا، عورتوں کی دبی دبی اور مردوں کی بلند آہ وزاری، ایک عجیب کیفیت تھی۔ طویل دعا میں امت مسلمہ کے اتحاد اور مسلم ممالک کی بقا وسلامتی کی خصوصی دعائیں شامل تھیں، کشمیر کے لئے بھی دعا کی گئی۔

نماز ختم ہوئی تو کچھ دیر میں خاموشی سے وہیں بیٹھی رہی، ابھی تک میں نے خانہ کعبہ نہیں دیکھا تھا، سنتے ہیں کہ خانہ کعبہ پر نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے میں سوچ رہی تھی کہ کیا مانگوں۔ بالآخر طے کر لیا کہ اللہ سے اس کی رضا اور اپنی مغفرت طلب کروں۔ لہٰذا زیر لب یہ دعا دہراتی سجاد کے ساتھ آگے بڑھتی رہی، میں طویل برآمدوں کی سیڑھیوں کے قریب تھی کہ اچانک وہ خوبصورت، سیاہ گھر نظروں کے سامنے آ گیا قدم اپنی جگہ جم کے رہ گئے، جلدی سے دعا پڑھی، یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

''یہ سبز بتی ہے'' سجاد نے داہنی جانب، بہت بلندی پر نصب بتی کی طرف اشارہ کیا، ''یہاں کھونے کی صورت میں اسی بتی کے نیچے میرا انتظار کرنا''۔

''کیا یہ بتی اسی لئے لگی ہے''۔

''نہیں بلکہ یہ طواف شروع کرنے کی جگہ کو ظاہر کرتی ہے''۔

حرم شریف کے چاروں طرف اونچی محرابوں والے دو منزلہ دالان ہیں اور ان کے درمیان مسجد الحرام کا صحن ہے۔ اور صحن کے وسط میں خانہ کعبہ ہے۔

☆☆☆☆☆

بیت اللہ

ہماری منزل مراد یعنی خانہ کعبہ، نظروں کے سامنے تھا سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ خانہ کعبہ کے گرد طواف کر رہے تھے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ابھی ابھی حرم پاک کی نماز تراویح سے فارغ ہوئے تھے، ہم بھی انہی لاکھوں میں سے دو تھے، سجاد اس سے قبل بھی چند عمرے کر چکے تھے جب کہ میرا یہ پہلا عمرہ تھا نماز سے فراغت پانے کے بعد ان میں سے اکثریت طواف کے لئے جا رہی تھی ہم بھی اسی طوفان مرد وزن کا ایک جزو تھے۔

سجاد مجھے ہدایات دیتے جا رہے تھے، جس پر میں خاموشی سے عمل کرتی جا رہی تھی، میں خود اپنی عقل استعمال کرنے کے موڈ میں نہیں تھی میں صرف اس کیفیت کا ایک حصہ بننا چاہتی تھی جو اس وقت ہر طرف طاری تھی۔ پورا حرم پاک غیر معمولی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ شائد دن اور رات میں روشنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر یہ شب قدر کی رات تھی، ہزاروں راتوں سے افضل، جب جبرئیل امین اور فرشتوں کے پرے کے پرے زمین پر اتر کر ہر طرف پھیل جاتے ہیں، یہی تو وہ خوبصورت رات تھی جب رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل کیا گیا تھا۔

بے شک ہم نے اسے (قرآن کو) برکتوں والی رات میں نازل کیا
اور تجھے کیا پتہ کہ کیا ہے وہ برکتوں والی رات؟
برکتوں والی رات، ہزار مہینوں سے بہتر ہے
جب ملائکہ اور روح اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں
(اس رات میں) سلامتی ہے طلوع فجر تک
(سورہ القدر)

ہم اسی انتہائی بابرکت رات کے حلقے میں تھے اور خانہ کعبہ میں تھے جو کہ دنیا کی سب سے پر

امن اور رحمتوں، برکتوں والی جگہ ہے۔ یہ سب سے پہلی عبادت گاہ ہے جو انسانوں کے لئے روئے زمین پر قائم کی گئی، اس سلسلے میں ایک روایت تو یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا جب کہ ابھی حضرت آدم کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت آدم نے اس دنیا میں آنے کے بعد کعبے کو دوبارہ تعمیر کیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا اور اس تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان، طور زیتا، طور سیناء، الجودی اور حراء کے پتھر استعمال کئے۔ آدم کے بعد ان کے بیٹے حضرت شیثؑ نے کعبہ کی تعمیر ثانی میں حصہ لیا تھا۔ طوفان نوح میں کعبہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا تاہم حجر اسود کو اللہ تعالیٰ نے کوہ ابو قبیس پر محفوظ رکھا۔ حجر اسود کے بارے میں یہ عجیب و غریب روایت سنی ہے کہ یہ پانی میں ڈوبتا نہیں، حالانکہ دیکھا جائے تو یہ پتھر ہے اور خاصا بڑا اور وزنی پتھر ہے، مگر اسے اللہ کی قدرت ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ پانی میں ڈوبتا نہیں، تیرتا رہتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو کعبے کی تعمیر کی ہدایت ہوئی، چونکہ کعبے کے ابتدائی آثار مٹ چکے تھے لہذا فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں ابتدائی تعمیر ہوئی تھی۔ ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اس کو بے نشان کر دیا تھا۔ تاہم وہ ایک ٹیلے یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کی مدد سے اس جگہ کو کھودنا شروع کیا تو سابقہ تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، انہی بنیادوں پر از سر نو بیت اللہ کی تعمیر کی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ کعبہ جب گر گیا تو قبیلہ جرہم نے اس کو تعمیر کیا۔ جب مرور زمانہ سے کعبے کی عمارت پھر منہدم ہو گئی تو عمالقہ نے اس کو تعمیر کیا، پھر قریش نے اس کو تعمیر کیا۔

کعبے کی عمارت کو بار بار نقصان پہنچنے کی وجہ اب میری نظروں کے سامنے تھی۔ خانہ کعبہ بلند و بالا، سیاہ، مہیب، چٹیل پہاڑوں کے بیچوں بیچ نشیب میں ہے۔ اگر آپ وادی مکہ کو ایک ہانڈی تصور کریں، تو خانہ کعبہ اس کے پیندے میں ہے۔ شورش کاشمیری نے بھی بڑی اچھی مثال دی ہے کہ جیسے نون کے پیٹ میں نقطہ، اسی طرح وادی کے بطن میں خانہ کعبہ! بارشوں کے زمانے میں کعبہ کو سخت سیلابی ریلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ جس سے اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچتا ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کی جوانی میں بھی ایک بار کعبہ کو نقصان پہنچا تھا ایک عرب عورت کے ہاتھ سے

جو بجو رات جلا رہی تھی، کعبے کو آگ لگ گئی تھی اور عمارت تباہ ہوگئی تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں ایک بازنطینی جہاز جدے کے ساحل پر خشکی پر چڑھ گیا تھا، اہل مکہ اس کی لکڑی اٹھالائے اور نئی عمارت کی تعمیر میں اس کو استعمال کیا۔

کعبے کی قدیم تعمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قد آدم اونچی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت کا قد آدم کا پیمانہ بھی انتہائی مختلف رہا ہوگا، عمارت بغیر چھت کے تھی، دہلیز زمین کے برابر تھی جس کی وجہ سے سیلابی پانی آسانی سے اندر داخل ہوسکتا تھا۔

قریش نے تعمیر قدرے مضبوط کی، باری باری سے ایک تہہ پتھر کی اور ایک لکڑی کی بنائی گئی۔ بلندی پہلے سے دوگنی کردی گئی، عمارت پر چھت بھی ڈال دی گئی دروازہ زمین سے اتنا اونچا کردیا گیا کہ داخل ہونے کے لئے سیڑھی درکار ہوتی۔ جب حجر اسود کی تنصیب کا موقع آیا تو رسول اللہ ﷺ کی سمجھداری سے ایک بڑی جنگ ٹل گئی۔

اسی کعبے کے اندر اور اطراف میں رسول اللہ ﷺ کی جوانی میں قریش نے تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے، کعبہ کی اندرونی دیواروں پر دیوتاؤں اور دیویوں کی تصویریں بنا رکھی تھیں۔ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر اور اطراف میں رکھے ان بتوں کو ڈھا کر کعبہ کو ہمیشہ کے لئے ان سے پاک کردیا۔ اب ہوسکتا ہے ہم جیسے زائرین کے دلوں میں بت ہوں، مگر کعبہ کے اندر بہرحال نہیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی ایک دفعہ خانہ کعبہ کو ڈھا کر اس کی از سرِ نو تعمیر کی گئی تھی۔ ایسا یزید بن معاویہ کی خلافت میں ہوا تھا۔ جب یزیدی لشکر، حصین بن نمیر السکونی کی قیادت میں مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ مکہ کا محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر نے خانہ کعبہ میں پناہ لی تھی، حصین کے لشکر نے خانہ کعبہ پر سنگ باری کی تھی جس سے کعبہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ یزید کی موت کی خبر سن کر جب نمیری لشکر واپس چلا گیا تو عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ کو مکمل طور پر منہدم کر کے اسے از سرِ نو تعمیر کیا، اس دفعہ کعبہ کی تعمیر میں تمام ترکے کا پتھر اور یمن کا چونا استعمال کیا گیا۔ حجر حطیم کو عمارت میں شامل کردیا گیا، فرش کے برابر دو دروازے رکھے گئے مشرقی دروازہ داخلے کے لئے اور مغربی دروازہ خروج کے لئے۔ ایسا حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اپنی خالہ، سیدہ عائشہ صدیقہ کی بیان کردہ رسول اللہ کی حدیث کی روشنی میں کیا تھا۔

تاہم یہ تبدیلیاں فقط تھوڑے عرصے تک قائم رہیں ۷۴ھ (۶۹۳ء) میں حجاج بن یوسف نے مکے کی تسخیر کے بعد جبکہ حضرت عبداللہ ابن زبیر شہید ہو چکے تھے، خانہ کعبہ کی عمارت میں پھر سابقہ تبدیلیاں کردیں یعنی حجر حطیم کو کعبے سے جدا کردیا اور مغربی دروازہ بند کردیا۔ اس طرح کعبے نے عملاً پھر وہی شکل اختیار کرلی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھی اور یہی شکل آج بھی ہے۔

ہارون الرشید نے اپنے زمانے میں امام مالک سے پوچھا تھا کہ کیا میں خانہ کعبہ کو منہدم کر کے از سرِ نو، عبداللہ ابن زبیر کے طریقے پر تعمیر کردوں تو امام مالک نے خلیفہ وقت کو ایسا کرنے سے منع کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کعبہ کو ڈھانا اور بنانا ایک کھیل بن کر رہ جائے، چنانچہ اس کے بعد کسی نے کعبے کو ڈھا کر از سرِ نو اٹھانے کی جرات نہ کی، ہاں البتہ اس کی مضبوطی کے لئے مرمت کا کام بہرحال جاری رہتا ہے کیونکہ سیلابی پانی سے عمارت کو بہرحال نقصان پہنچتا ہے۔

ہمارا تیسرا چکر اختتام کے قریب تھا، پاؤں طواف میں مصروف تھے۔ لب دعاؤں میں اور آنکھیں خانہ کعبہ کے دیدار میں۔ ہم تیسری دفعہ حجر اسود کے سامنے آئے، بوسہ دینے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم کعبہ کی دیواروں سے گزوں دور تھے۔ تاہم حجر اسود کے پاس اچھی خاصی دھکم پیل تھی جس کو دیکھتے ہوئے خواہش کے باوجود ہم نے وہاں جانے کی کوشش نہیں کی۔

اس عمرہ کے سوا دو ماہ بعد جب ہم حج کرنے آئے تب بھی قیامت خیز رش کی وجہ سے حجر اسود کو بوسہ نہ دے سکے، تاہم اسی سال ماہ نومبر میں جب ہم پھر عمرہ کے لئے آئے تو رش کم تھا، لہٰذا تین چار چکروں میں ہمیں حجر اسود کو بوسہ دینا مل گیا۔ اس وقت ہر چکر پر پانچ سالہ سعدیہ کی فرمائش ہوتی

"ابو حجر اسود کو پپی کرنی ہے۔"

اور سجاد ہر دفعہ اسے گود میں اٹھا کر پپی کروا دیتے۔

حجر اسود کے بارے میں سنتے ہیں کہ جنت کا پتھر ہے جو ہبوط آدم کے وقت زمین پر بھیجا گیا جسے خانہ کعبہ کی اولین تعمیر میں نصب کیا گیا۔ طوفان نوح کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اس پتھر کو جبل ابو قبیس پر محفوظ رکھا جب حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حضرت جبرئیل نے حجر اسود کو لا کر اس کی جگہ پر نصب کردیا۔

یزید کے زمانے میں جب حصین بن نمیر السکونی نے عبداللہ ابن زبیر کی سرکوبی کے لئے خانہ

کعبہ پر سنگ باری کی تھی تو یہ پتھر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے تین حصے ہو گئے تھے۔ جسے ابن زبیر نے چاندی کی زنجیر سے باندھ دیا تھا یہ ۶۴ھ (۶۸۳ء) کا واقعہ تھا۔ جب مرور زمانہ سے یہ تار ڈھیلا ہو گیا اور حجر اسود کے ٹکڑے ہلنے لگے تو عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے عہد خلافت میں حجر اسود میں آر پار سوراخ کر کے اس میں چاندی بھروا دی جس کی وجہ سے حجر اسود کے تینوں ٹکڑے آپس میں پیوست اور مضبوطی سے مربوط ہو گئے۔

جنت کے اس پتھر پر دوسری آزمائش ۳۱۹ھ (۹۳۱ء) میں آئی جب قرامطہ نے مکہ پر حملہ کیا، کعبہ تو محفوظ رہا البتہ حملہ آور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے جو کوئی بیس برس غائب رہنے کے بعد پھر واپس مکے پہنچ گیا۔ وہ ابو طاہر قرمطی تھا جو حجر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ بلاد ہجر (الحساء) لے گیا۔ خاصے عرصے تک خانہ کعبہ حجر اسود سے خالی رہا اور زائرین تبرکاً اس کی جگہ پر ہاتھ رکھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ۳۳۹ھ میں حجر اسود واپس اپنی جگہ پر نصب کر دیا گیا، واپس لانے والا بھی ایک قرمطی سنبر بن حسن تھا۔

تاریخ میں ایک اور حیرت انگیز روایت یہ ملتی ہے کہ جب مکہ سے حجر اسود کو حساء لے جایا جا رہا تھا تو وہ اونٹ ہلاک ہوتے چلے گئے جن پر اس کو لادا جاتا تھا، اس طرح یکے بعد دیگرے حجر اسود کو لادنے سے پانچ سو اونٹ ہلاک ہو گئے، جب کہ واپسی کے سفر میں حجر اسود کو ایک نحیف اونٹ پر لاد کر مکے لایا گیا جو پہلے سے زیادہ فربہ ہو گیا۔

قرامطہ کی غارت گری کے ان سالوں میں کئی سال حج بھی نہیں ہو سکا کیونکہ راستے پُر امن نہیں تھے، قرامطہ حاجیوں کے قافلوں کو بے دردی سے لوٹ لیتے تھے اور زائرین کو مرنے کے لئے صحراؤں میں چھوڑ دیتے تھے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو زمین پر آنے کے بعد حجر اسود عظیم حوادث سے دو چار ہوا مگر آج بھی محفوظ ہے، روزانہ ہزاروں زائرین اس کو بوسہ دیتے ہیں، صرف اس لئے کہ رسول اللہ نے ایسا کیا تھا۔

ہمارا ساتواں چکر قریب الختم تھا، طواف کرتے ہوئے اب ہم خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ شمال مشرقی دیوار میں زمین سے کوئی سات فیٹ اونچا کعبہ کا دروازہ ہے۔ حج کے زمانے میں جب خانہ کعبہ کو غسل دیا جاتا ہے تو یہ دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس رسم میں سعودی عرب کے حکام، اسلامی ممالک کے وفود، اور چند ممتاز زائرین شریک ہوتے ہیں سب سے پہلے سلطان وقت داخل

ہوتا ہے، دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خود فرش کو آب زمزم سے دھوتا ہے۔ پانی دہلیز کی ایک موری کے راستے باہر بہہ جاتا ہے۔ دیواریں ایک قسم کی جاروب سے دھوئی جاتی ہیں جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ کا گورنر ہر ایک چیز پر عرق گلاب چھڑکتا ہے اور آخر میں عمارت کے اندر قسم قسم کے بخورات سے دھونی دی جاتی ہے تاکہ عمارت مہکتی رہے۔

اس وقت سب کچھ ہم سے خاصا دور تھا، میزاب رحمت، مقام ابراہیمؑ، حطیم، ملتزم اور حجر اسود ہم ان متبرک مقامات سے گزوں دور تھے، نہ مقام ابراہیمؑ پر حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان دیکھ سکے، نہ حطیم میں نماز پڑھ سکے نہ ملتزم سے چمٹ سکے، نہ میزاب رحمت کے نیچے دعا کر سکے اور نہ ہی حجر اسود کو بوسہ دے سکے، مگر ان سب کے باوجود عمرہ کی خوشی تھی یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم واقعی صحن کعبہ میں ہیں، کم از کم میں بار بار خانہ کعبہ کو دیکھ رہی تھی، کسوۃ سے ڈھکا ہوا سیاہ پوش خانہ کعبہ واقعی نظروں کے سامنے تھا۔

کعبے کو کسوۃ یعنی غلاف پہنانے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اسلام نے اس سلسلے کو باقی رکھا۔ ہر سال محرم کی دس تاریخ کو خانہ کعبہ کو غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ جو مختلف رنگ کا ہوتا تھا، چونکہ عباسی خلفاء کا شعار سیاہ رنگ تھا لہٰذا عباسیوں کے دور میں ہمیشہ غلاف کعبہ سیاہ ہوتا تھا اور آج تک یہی صورت حال باقی ہے۔

محمد علی پاشا کے عہد میں مصری حکومت نے ہر سال غلاف کعبہ بھیجنے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی لہٰذا کسوۃ مدت تک ہر سال مصر سے تیار ہو کر آتا تھا۔ پھر ہند اور پاکستان میں بھی تیار ہوتا رہا تاہم اب یہ غلاف کعبہ، سعودی عرب کے مقامی دارالکسوۃ میں تیار ہوتا ہے۔ کسوۃ عام طور پر سیاہ کمخواب کا ہوتا ہے، جس میں کلمہ شہادت بُنا ہوتا ہے۔ یعنی لکھا ہوا نہیں ہوتا بلکہ باقاعدہ طلائی تاروں سے بُنائی کی جاتی ہے۔ غلاف کی دو تہائی بلندی پر زردوزی کے کام کی ایک پٹی (حزام) ہوتی ہے، جس پر قرآن مجید کی آیات خوش خط لکھی ہوتی ہیں۔

چاروں طرف سے پھوٹنے والی روشنی میں یہ سیاہ گھر بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ جس پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ رات کے شائد ایک بجے تھے جب ہمارا طواف ختم ہوا۔ سجاد نے مقام ابراہیمؑ پر جب کہ میں نے خاصے پیچھے دوگانہ نماز پڑھی پھر چاہ زمزم کی طرف چلے۔

حجر اسود کے بمقابل، کعبے کی جنوب مشرقی سمت میں کوئی پچاس فیٹ کے فاصلے پر یہ کنواں واقع ہے۔ جسے زمزم یا بئر اسمٰعیل کہتے ہیں۔ یہ کنواں ایک سو چالیس فیٹ گہرا ہے۔ پہلے یہ کنواں حرم کے صحن میں ایک ہی سطح پر تھا لیکن جب مطاف کو وسعت دی گئی تو حرم شریف کے صحن سے بند کر کے اب اسے نیچے تہہ خانے میں کر دیا گیا ہے۔ تہہ خانے میں جانے کے لئے کئی سیڑھیاں نیچے اترنی پڑتی ہیں یہ سیڑھیاں اس قدر کشادہ ہیں کہ بیس پچیس افراد بیک وقت آ جا سکتے ہیں۔ نیچے عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ وضو کرنے کی جگہ بنادی گئی ہے، حجاج کی سہولت کے لئے حرم شریف میں سینکڑوں کی تعداد میں جگہ جگہ اورنج رنگ کے کولر رکھ دیئے گئے ہیں جس میں آب زمزم بھرا ہوتا ہے جسے ہر شخص اپنی سہولت کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں چاہ زمزم کی صفائی کی گئی اس کے بعد سعودی دور میں جدید مشنری سے صفائی ہوئی دو غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی انسان اس چشمے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک انجینئر یحیٰی کوشک نے بتایا کہ چشمے کے اندر ایک بڑی چٹان پر 'باذن اللہ' لکھا ہے۔ جن چٹانوں سے یہ چشمہ پھوٹتا ہے ان پر رنگ برنگی مٹی کی تہیں جمی ہوئی ہیں جس سے قدرتی طور پر پانی کی فلٹریشن ہوتی ہے۔

ہم خاصے تھکے ہوئے تھے اور پھر سعی بھی کرنی تھی لہٰذا ہم نے نیچے اترنے کے بجائے اوپر ہی نلکوں میں آنے والے زمزم کے پانی سے تسکین حاصل کی زائرین آب زمزم پی بھی رہے تھے۔ اپنے گریبانوں میں اور سروں پر انڈیل بھی رہے تھے اس پانی کے بارے میں روایت ہے کہ یہ پانی جس نیت سے پیا جائے گا، اللہ اسے پورا کرے گا۔ یہ بھی اس پانی کی خصوصیت ہے کہ یہ صرف پیاس ہی نہیں مٹاتا بلکہ پیٹ بھرنے والی غذا کا کام بھی کرتا ہے اور اس میں بیمار کے لئے شفا بھی ہے۔

اس کنویں کی ابتداء کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے ملتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کی جان بچانے کے لئے جاری کیا تھا۔ جب وہ وادی غیر ذی ذرع کے صحراؤں میں فرط تشنگی سے جاں بلب ہو رہے تھے۔ جب یہ چشمہ ابل پڑا تو حضرت ہاجرہ نے سب سے پہلے اس کے ارد گرد پتھر کی دیوار کھڑی کی تا کہ پانی بہہ کر ضائع نہ ہو جائے بلکہ پتھروں کے درمیان محفوظ رہے

جب پانی نکل آیا تو پرندوں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ اتفاقاً بنو جرہم کا ایک قافلہ کچھ فاصلے

سے گذر رہا تھا، انہوں نے پرندوں کو منڈلاتے دیکھا تو قیاس کیا کہ ضرور یہاں پانی ہوگا۔ تحقیق احوال پر ان کا قیاس درست نکلا انہوں نے اس وادی میں ایک عورت اور اس کے بیٹے کو تنہا پایا اور پانی بھی افراط سے تھا انہوں نے ہاجرہ سے یہاں رہنے کی اجازت مانگی، ہاجرہ نے اجازت تو دے دی مگر کہا کہ پانی پر بہر حال تمہارا کوئی حق نہیں۔ وہ لوگ وہیں رہنے لگے اور حضرت ہاجرہ کی اجازت سے پانی لیتے رہے، رفتہ رفتہ خاندان بنتے گئے، آبادی بڑھتی گئی، انہی کی ایک لڑکی سے اسمٰعیل کی شادی ہوگئی اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد پوری وادی فاران میں پھیل گئی۔

چاہ زمزم کو زمانہ جاہلیت میں بنو جرہم نے پاٹ دیا تھا اور اپنا سارا خزانہ بھی اس میں ڈال دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اس کنویں کو پھر سے دریافت کر کے کھلوایا، اور اس کے گرد اینٹوں کی دیواریں تعمیر کرادیں۔ انہیں اس میں سے دو طلائی ہرن، کچھ تلواریں اور زرہ بکتر بھی ملیں۔ تلواروں سے تو انہوں نے خانہ کعبہ کا دروازہ بنوایا اور اس پر سونے کی پتریاں لگوادیں جس میں ایک طلائی ہرن کام آیا۔ دوسرا طلائی ہرن انہوں نے حرم پاک میں رکھوادیا۔ کسی زمانے میں نائلہ بت بھی زمزم پر رکھا ہوا تھا۔

عجیب بات ہے چاہ زمزم کو ہزاروں، لاکھوں زائرین استعمال کرتے ہیں تبرک کے طور پر دنیا کے گوشے گوشے میں یہ پانی پہنچتا ہے مگر اس میں کوئی کمی یا تخفیف نہیں ہوتی۔ آج بھی اسی طرح ابل رہا ہے۔ البتہ ۲۹۷ھ (۹۰۹ء) میں اس کنویں کے پاس ایک انتہائی عجیب وغریب واقعہ ہوا جو نہ اس سے قبل کبھی ہوا تھا نہ اس کے بعد آج تک ایسا سنا گیا ہوا یہ کہ چاہ زمزم بری طرح چھلک کر بہہ نکلا جس میں کئی حاجی ڈوب گئے تھے۔

رات میں دن کا سماں تھا، ہم زمزم سے پیاس بجھا چکے تھے ہمارا اگلا مرحلہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کا تھا۔

صفاومروہ

صفااور مروہ، بیت اللہ کے نزدیک دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔آب زمزم پی کرہم صفا کی طرف چلے۔یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے یہ وہی پہاڑی ہے کہ بعثت کے تین سال بعد جب رسول اللہ کو حکم ہوا کہ توحید کی دعوت عام دیں تو آپ نے قریش کو اسی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا تھا۔

یامعشر القریش

ذرا ایک منٹ ٹھہریئے میرے ساتھ چودہ سو سال ادھر چلئے۔مکہ کی یہ وادی جو کبھی دشت فاران میں اک دشت امکاں تھی اور جو سیدہ ہاجرہ اور سیدنا اسماعیل کی آمد سے قبل محض ایک تجارتی راہ گزر تھی بے آب وگیاہ بے نام ونشاں، رسول اللہ کے عہد تک آتے آتے پورے عرب کے لئے انتہائی مرکزی حیثیت حاصل کرگئی تھی۔خانہ کعبہ تمام اہل مکہ کے لئے ایک مرکزی مقام اتصال تھااس کے سامنے ہی دارالندوہ کی عمارت تھی، جو رسول اللہ کے جد قصی بن کلاب نے قائم کی تھی۔اس وقت قریش کی آبادی بیت اللہ کے اردگرد ڈیڑھ دو میل کے دائرے میں رہی ہوگی اور یہی مکہ تھا۔عموماً سربرآوردہ قسم کے زعماء اور روساء مسئلے مسائل حل کرنے کے لئے خانہ کعبہ کے صحن میں اپنی نشست لگایا کرتے تھے یہ گویاان کی چوپال تھی۔

ایسا ہی ایک دن تھا جب رسول اللہ آئے ،طواف کیااور صفا پر چڑھ کر پکارے

یامعشر القریش

قریش چونک اٹھے۔محمد کیا کہنے والے ہیں۔ان کے سماجی طریقوں کے مطابق یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا اپنے ہم قبیلہ کو اس طرح پکارنا۔کسی اہم صورت حال کے رونما ہونے کا اشارہ کرتا تھا۔صحن کعبہ میں بیٹھے ہوئے اہل قریش تیزی سے صفا کے دامن میں جمع ہوگئے۔

''لوگو، اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا ایک لشکر آرہا ہے تو کیا تم یقین کر

لوگے''؟

بڑی انہونی اور نا قابل یقین سی بات تھی۔صفا کے پیچھے تو قریش کے محلے تھے، جہاں مختلف خاندان رہائش پذیر تھے، اس سے پرے جبل ابوقبیس سر اٹھائے کھڑا تھا، اس سلسلہ کوہ کو پار کرنا بھی کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) ایک بالکل عجیب سی بات کہہ رہے تھے، خاصی نا قابل یقین سی

''ہاں کیوں نہیں، ہم ضرور یقین کرلیں گے، کیوں کہ اے محمد ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا''۔ قریش کے اکابرین نے جواب دیا۔

''تو میری بات غور سے سنو! لوگو تمہارا رب ایک ہے، اور تمہیں ایک دن اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

''تیرا ستیاناس جائے'' ابولہب بپھر گیا ''کیا تو نے ہمیں اس لئے بلایا تھا'' چچا بھتیجے پر برس پڑا اور دیگر روسائے قریش کو لے کر واپس چلا گیا، جتنے منہ اتنی باتیں، لوگ بڑبڑاتے بکتے جھکتے چلے گئے۔

محمد ﷺ (ہزاروں درودوسلام ہوان پر) صفا پر تنہا رہ گئے

دور ونزدیک کوئی بھی ان کا پیغام سننے کو تیار نہیں تھا

ہم اسی صفا پر چڑھ رہے تھے، ہمارے اردگرد ہزاروں افراد تھے ہم پہاڑی پر اتنا اوپر گئے کہ بیت اللہ نظر آنے لگا، ہم نے استلام کیا، سعی کی نیت کی اور سعی شروع کردی۔

''مجھے صفا پر اوپر چوٹی تک چڑھنا ہے''۔میں نے سجاد کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا

''جس چکر میں موقع لگ گیا تو اوپر تک چلے جائیں گے، فکر نہ کرو''

ہماری سعی شروع ہوگئی، شب قدر کی رات تھی لہٰذا بہت رش تھا۔اب سعودی حکومت صفا اور مروہ پہاڑوں سمیت، سعی کا پورا راستہ جدید تعمیرات کے اندر لے آئے ہیں۔نیچے سنگ مرمر کا شفاف فرش، دائیں بائیں مختلف ابواب، لائٹوں اور پنکھوں سے لدی پھندی منقش چھت اور عمدہ ستون سعی کی درمیانی جگہ پر ریلنگ لگا کر چند فیٹ چوڑا راستہ معذور افراد کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے، جنہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر سعی کرائی جاتی ہے ____ اور تو اور صفا اور مروہ کی پہاڑی کے بیشتر حصے پر بھی سنگ مرمر کا فرش بنادیا گیا ہے۔صرف چوٹی پر تبرکا اصل پہاڑی چھوڑ دی گئی ہے، جو مکہ کی دیگر پہاڑیوں کی طرح سیاہ، چٹیل، اور بے آب وگیاہ ہے

کاش سعودی حکومت نے ان دونوں پہاڑیوں کو، جو شعائر اللہ ہیں، یونہی چھوڑ دیا ہوتا کیا یہاں بھی انہیں کسی بدعت کا خطرہ تھا؟ یہ تو ہماری تاریخ کے آثار ہیں، جو ایمان کی مضبوطی اور تقویت کا باعث بنتے ہیں، ان آثار کو ان کی حالت اصلی پر نہ چھوڑ کر سعودی حکومت نے خدا جانے دین کی کون سی خدمت انجام دی ہے۔

پہلا چکر

دوسرا چکر

پھر یہ ساری جدید تعمیرات، اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت نظروں سے اوجھل ہو گئیں، یہ ساڑھے چار ہزار سال ادھر کی بات ہے۔

اللہ کے انتہائی برگزیدہ پیغمبر سیدنا ابراہیم اپنے اہل خانہ سمیت فلسطین میں رہ رہے تھے۔ ان کی عمر پچاسی سال تھی، ان کی بیوی سارہ، جو انہی کے خاندان سے تھیں، بھی ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ دونوں اولاد کے خواہشمند تھے۔ اپنے بڑھاپے کے پیش نظر سیدہ سارہ نے اپنی خدمتگار ہاجرہ کا نکاح سیدنا ابراہیم سے کر دیا کہ شائد اولاد کی خواہش پوری ہو جائے۔ سیدہ ہاجرہ رقیون، شاہ مصر کی بیٹی تھیں، حسین و جمیل اور نوجوان خاتون جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور قبطی زبان بولتی تھیں۔ سیدنا ابراہیم اور سیدہ سارہ مصر گئے ہوئے تھے، جہاں وہ شاہ مصر کے بھی مہمان ہوئے۔ شاہ مصر، سارہ کی بعض کرامات سے انتہائی متاثر ہوا اور اپنی بیٹی ہاجرہ انہیں بخش دی اور کہا

"میری بیٹی کا آپ کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا، دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے زیادہ بہتر ہے"۔

اس طرح ہاجرہ، مصر سے فلسطین پہنچ گئیں اور بعد ازاں ابراہیم کے عقد میں چلی گئیں

ان سے اسماعیل پیدا ہوئے

اس پر سیدہ سارا کو سخت رشک آیا اور اسی غیرت میں انہوں نے اپنے شوہر سے مطالبہ کیا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو کہیں دور چھوڑ آؤ

سیدنا ابراہیم ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے مگر جب اللہ نے بھی یہی حکم دیا کہ ہاجرہ اور اسماعیل کو دشت فاران میں چھوڑ آؤ تو وہ پیکر تسلیم و رضا اپنی جواں سال، خوبصورت بیوی اور بڑھاپے کی

اکلوتی اولاد اسماعیل کو لے کر دشت فاران کی طرف چل پڑے۔ فلسطین سے دشت فاران تک کا راستہ غالباً ڈیڑھ دو ماہ میں طے ہوا ہوگا۔ یہاں جبل ابوقبیس سے ذرا آگے، کوہ صفا کے قریب ایک صحرائی درخت کے سائے میں دونوں کو چھوڑ دیا۔ انہیں پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجوریں دیں، انہیں کبھی کبھی آ کر ملنے کا وعدہ کر کے فلسطین کے ارادے سے چل پڑے۔

یہ مکہ کی غیر آباد وادی تھی، جہاں ایک انسان بھی نہیں بستا تھا، یہاں چاروں طرف مہیب، سنگلاخ، بنجر، سیاہ دیو جیسی چٹانیں تھیں اور بس۔

سیدہ ہاجرہ، سیدنا ابراہیم کی واپسی کے ارادے سے گھبرا گئیں۔ وہ ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی طریق کدا تک آئیں

"آخر آپ ہمیں کس کے سہارے یہاں چھوڑے جا رہے ہیں"۔

سیدنا ابراہیم خاموش رہے

"کیا یہ آپ کے رب کا حکم ہے"۔

"ہاں"

"پھر تو ہمارا رب ہمیں ہرگز ضائع نہ کرے گا"

سیدہ ہاجرہ کو ایکدم قرار آ گیا اور وہ ایک قوت ایمانی کے ساتھ واپس آ گئیں۔ سیدنا ابراہیم انہیں واپس جاتا دیکھتے رہے۔ یہ ایک انتہائی اعصاب شکن فیصلہ تھا۔ ایک دشت ویراں میں جہاں انسان تو انسان، پرندے بھی، پانی کی کمیابی کی وجہ سے پر نہیں مارتے تھے، وہاں اپنی بیوی اور بڑھاپے کی اولاد کو چھوڑنا، کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہو سکتی، یہ ابراہیم ہی کا ایثار ہو سکتا تھا۔

جب اونچے، نیچے، سنگلاخ، ناہموار راستوں پر واپس جاتی ہوئی ہاجرہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو سیدنا ابراہیم کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لئے اٹھ گئے

اے ہم سب کے رب!

میں نے اپنی اولاد، اس وادی غیر ذی زرع میں لا بسائی ہے

تا کہ یہ یہاں نماز قائم کریں

پس تو ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں

اوران کے لئے زمین کی پیداوار سے رزق اور پھل مہیا کر دے

تا کہ یہ تیرے شکر گذار ہوں

دعا مانگ کر، اپنی متاع عزیز اپنے رب کو سونپ کر سیدنا ابراہیم فلسطین واپس چلے گئے۔ سیدہ ہاجرہ نے چند دن تو مشکیزے کے پانی اور کھجوروں پر گذارہ کیا، لیکن بالآخر خورد ونوش کا وہ معمولی سا سرمایہ ختم ہو گیا، اور بچے نے بھوک پیاس سے بلکنا شروع کیا تو ممتا کی ماری ماں بے قراری میں ادھر ادھر بھاگتی پھریں۔ اصل مسئلہ پانی کا تھا۔ جب بچے نے پیاس سے ہلکان ہو کر ایڑیاں رگڑنی شروع کیں تو سیدہ ہاجرہ پانی کی تلاش میں بھاگتی ہوئی صفا پر چڑھ گئیں۔ آنکھوں کو سکیڑ سکیڑ کر اور پنجوں کے بل اچک اچک کر دور ونزدیک پانی کی تلاش میں نظریں دوڑاتی رہیں، جب کچھ نظر نہ آیا تو بے چینی میں مروہ کی طرف چلیں، ساتھ ہی مڑ مڑ کر بچے کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھیں، درمیان میں نشیب ہونے کی وجہ سے جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو دوڑتیں، یہاں تک کہ بچہ پھر نظر آنے لگتا

مروہ پر پہنچیں۔ مگر پانی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا

وہ خود بھی تشنہ لب تھیں اور بچہ بھی پیاسا تھا۔ اسی تشنہ لبی کے عالم میں کہ ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور زبان تالو سے چمٹ گئی تھی وہ صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا کے مابین بھاگتی رہیں۔

یہ ایک تنہا اور بے سہارا، کمزور عورت کی بے قراری کی انتہا تھی۔ وہ اپنے جاں بلب بچے کے پاس خالی ہاتھ واپس جانا نہیں چاہتی تھیں، ورنہ ناکامی کے باوجود بار بار صفا اور مروہ پر چڑھنا کیا معنی رکھتا تھا۔ ساتویں چکر پر جب وہ بے نیل ومرام مروہ سے اترنے لگی تھیں تو ان کی نظروں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا____ جہاں اسماعیل پڑے تھے وہیں سے ایک چشمہ ابلنے لگا تھا۔ "وہ زم زم"۔ "زم زم" کہتی ہوئی بے اختیار ادھر دوڑیں۔ ان کی خوشی اور حیرت دیدنی تھی، انہوں نے سیر ہو کر پانی پیا، بچے کو پلایا۔ حالت قابو میں آئی تو دور ونزدیک سے پتھر اٹھا اٹھا کر لاتیں اور چشمے کے ارد گرد رکھتی جاتیں تا کہ پانی ذخیرہ ہو جائے اور بہہ کر ضائع نہ ہو۔ اس طرح چاہ زم زم کے چاروں طرف منڈیر بنانے کا کام سیدہ ہاجرہ نے اپنے نازک، نسوانی ہاتھوں سے انجام دیا۔ آب زم زم دونوں ماں بیٹے کے لئے صرف پانی ہی نہ تھا جو پیاس بجھاتا ہو، بلکہ خوراک بھی تھا، جو بھوک مٹاتا تھا اور شفا بھی تھا۔ سیدہ ہاجرہ کی بے قراری کی اس ادا کو دہرانا ہر حاجی یا عمرہ کرنے والے پر واجب ہے

ہر روز سینکڑوں مسلمان اس ادا کو دہراتے ہیں۔

ہم بھی دہرا رہے تھے۔ مگر بخدا اس میں ہاجرہ کی سعی والی کوئی بات نہ تھی، ہم شعلے برساتے کھلے آسمان تلے نہیں تھے بلکہ ایسی چھت کے نیچے تھے جس پر متعدد پنکھے لگے ہوئے تھے، اور جگہ جگہ DESERT COOLER چل رہے تھے جن کی وجہ سے عمارت کے اندر کا درجہ حرارت خاصا کم تھا____ پانی کی کمیابی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جگہ جگہ نلکوں سے آب زم زم ابل رہا تھا۔ ذرا سی پیاس لگی او مگ بھر کے آب زم زم پی لیا____ پھر پیروں کے نیچے بھی دشت فاران کی دہکتی ہوئی زمین کی جگہ، سنگ مرمر کا ٹھنڈا فرش تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے گھٹا ٹوپ اندھیرے کی جگہ، برقی قمقموں کی وہ چمک دمک تھی جو دن کی روشنیوں کو شرما رہی تھی۔

تیسرا چکر

چوتھا چکر

خدا گواہ ہے اس سعی میں، سیدہ ہاجرہ کی سعی جیسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ایک واجب رکن تھا جو ادا کیا جا رہا تھا۔ لبوں پر مسلسل دعائیں تھیں۔ کہ یہ سب جگہیں قبولیت کی ہیں

عہد جاہلیت میں بھی حج کا یہ رکن ادا کیا جاتا تھا۔ اس وقت ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان بازار تھے، سعی بھی ہوتی رہتی تھی، خریدار بھی چلتے پھرتے رہتے تھے۔ بت پرست عربوں نے صفا پر 'اساف' بت نصب کر رکھا تھا اور مروہ پر 'نائلہ'۔ بت پرست عرب اپنی سعی کے دوران ان دونوں بتوں کو چھوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں تانبے کی مورتیاں بھی رکھی تھیں

پانچواں چکر

چھٹا چکر

اور ساتواں چکر

مروہ پر جا کر سجاد نے بال کٹوائے، اور پھر میرے بال بھی کاٹے

عمرہ پورا ہو گیا

حرم میں آ کر ہم نے شکرانے کے نفل ادا کئے۔ سحری کا وقت ہو چکا تھا لہذا مسجد حرام سے با
گئے، شیور ما کھایا، جوس پیا، اور روزے کی نیت کر کے نماز فجر کے لئے پھر حرم میں آ گئے۔ بڑا ہی س

وقت تھا جب ہم نے نماز فجر ادا کی، جب ہم مسجد الحرام سے باہر آئے تو انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہمارے چاروں طرف موجزن تھا اب مسئلہ گھر جانے کا تھا جہاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ بسوں اور ویگنوں کے انتظار میں کھڑے ہوں، وہاں اگر ہر منٹ پر بھی ویگن آئے تب بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ صورت حال انتہائی اعصاب شکن تھی۔ جسم کا ایک ایک عضو تھکن سے چور ہو چکا تھا اور کم از کم میں گھر جا کر سونا چاہتی تھی۔

سب سے اچھے وہ لوگ تھے جو نزدیکی ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہ پیدل اپنے ہوٹلوں تک پہنچ رہے تھے اور ہم بسوں کے انتظار میں ہلکان ہو رہے تھے۔ نصف گھنٹہ گذر گیا، پاوں جواب دے رہے تھے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ سڑک کے کنارے کسی منڈیر پر یا دوکان کے تھڑے پر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ یہ ساری جگہیں انتہائی گندی تھیں۔ لفظ 'گندی' سے اصل صورت حال ابھر کر سامنے نہیں آ سکتی، یوں سمجھئے کھانے پینے کی دوکانوں کی وجہ سے حرم کے اردگرد کا سارا علاقہ انتہائی غلیظ اور چیکٹ ہو رہا تھا۔ سعودی عرب میں تقریباً ہر شہر میں آپ کو مثالی صفائی نظر آئے گی مگر یہ صورت حال حرم کے اردگرد مفقود ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ زائرین کا شدید رش ہے، کہ صفائی برقرار رہنے نہیں پاتی۔

اس وقت ہم نے شکر ادا کیا کہ بچے ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ داستان ہے کہ ہم ایک بس میں کس طرح چڑھنے میں کامیاب ہوئے، جس کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں جا رہی ہے۔ دس منٹ بعد بس ایک جگہ رک گئی۔ پتہ چلا کہ اس کو یہیں تک آنا تھا۔ وہاں اتر کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور صبح نو، دس بجے کے قریب گھر پہنچے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ میں اپنے بستر تک کیسے پہنچی تھی، البتہ جب آنکھ کھلی تو دوپہر کے دو بج رہے تھے

منیٰ

اگلے دن شام کو روزہ افطار کرنے کے بعد سجاد بھائی ہمیں منیٰ اور مزدلفہ کے مقام دکھانے لے گئے۔ منیٰ دراصل مکہ کے مشرقی پہاڑوں کا نام ہے اور مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک تنگ وادی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ منیٰ کے شمال کی جانب جبل ثبیر ہے۔ "یہ عجیب بستی ہے" سجاد کہہ رہے تھے "سال کے چار پانچ دنوں کے لئے بستی ہے اور پھر سال کے ساڑھے تین سو دن یہاں ویرانی ہی ویرانی ہوتی ہے"۔

ایام حج میں حجاج کرام پر یہ لازمی ہے کہ وہ ۸ ذی الحج کو چار نمازیں، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور ۹ ذی الحج کی فجر لازماً منیٰ میں ادا کریں اس کے بعد عرفات کے لئے روانہ ہو جائیں۔ عرفات سے واپسی کے بعد ایام تشریق یعنی ۱۰، ۱۱، اور ۱۲ ذی الحج بھی حجاج کرام منیٰ میں قیام کرتے ہیں اور رمی جمرات کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ان دنوں اچانک اس بستی کی آبادی لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں خیمے منیٰ کے چپے چپے پر لگے ہوتے ہیں۔ اور ایام حج کے بعد یہاں کی آبادی پھر صفر رہ جاتی ہے۔

مکہ سے منیٰ آئیں تو منیٰ کا سب سے پہلا مقام عقبہ کہلاتا ہے یہیں بیعت عقبہ اولی اور ثانی ہوئی تھی۔ ہجرت سے قبل، اسلام کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے آپ کا طریقہ تھا کہ ایام حج میں جب کہ اطراف واکناف سے سینکڑوں افراد مکہ آتے تھے اور منیٰ میں قیام کرتے تھے، رسول اللہ ان کے پاس جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ رسول اللہ کا ایک چچا ابولہب ایسے میں ان کے پیچھے پیچھے ہوتا اور لوگوں سے کہتا جاتا کہ یہ ملحد ہو گیا ہے دین سے پھر گیا ہے، وغیرہ وغیرہ لہٰذا لوگ رسول اللہ کی بات پر کان نہ دھرتے۔

۱۱ نبوی کو مدینہ کے چند افراد ایام حج میں منیٰ میں مقیم تھے، رسول اللہ نے انہیں حسب سابق

دعوت اسلام دی، وہ یہودیوں کے پڑوسی تھے اور اس بات سے باخبر تھے کہ یہود ایک پیغمبر کا انتظار کر رہے ہیں لہذا انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور آئندہ سال ایام حج میں اسی جگہ ملنے کا طے کر لیا۔

۱۲ نبوی کو حسب وعدہ اہل یثرب آئے، اب ان کی تعداد ۷۲ تھی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق رسول اللہ ان سے ملنے گئے، ان کے چچا عباس جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے ان کے ساتھ تھے۔ یہاں اہل یثرب نے رسول اللہ کی بیعت کی جو بیعت عقبہ کہلاتی ہے۔

جمرہ عقبیٰ سے کچھ پہلے ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جسے مسجد العشرۃ بھی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اہل یثرب نے رسول اللہ سے نبوت کے گیارہویں سال یہیں بیعت کی تھی۔ مسجد العشرۃ سے آگے جمرہ عقبیٰ کے ساتھ ہی ایک اونچی سی جگہ تھی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں نبوت کے بارہویں سال مدینہ منورہ کے ۷۲ آدمیوں نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت عقبہ ثانی کے نام سے مشہور ہے اور اسی مناسبت سے اس جمرۃ کا نام جمرۃ عقبیٰ رکھا گیا ہے۔ مگر یہ جگہ اب نئی سڑک کے نیچے آ گئی ہے۔ حالانکہ بیعت عقبہ جیسے اہم تاریخی واقعہ کی یادگار کو ذرا سی توجہ سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا

سجاد بھائی نے گاڑی جمرۃ العقبیٰ سے ذرا دور سڑک کے کنارے روک دی تھی۔ یہ پوری جگہ سنسان پڑی ہوئی تھی، دو تین گاڑیوں کے علاوہ یہاں کچھ نہیں تھا۔ ہم آرام سے چہل قدمی کرتے ہوئے جمرۃ العقبیٰ تک آئے۔ وادی منیٰ میں تین جمرات ایستادہ ہیں۔ جہاں حج کے دنوں میں رمی کی جاتی ہے۔ اگر آپ مکہ سے منیٰ آئیں تو پہلے جمرۃ عقبیٰ پڑے گا۔ اس سے ۱۱۵ میٹر آگے جمرۃ وسطیٰ ہے اور اس سے ۱۵۰ میٹر آگے جمرۃ الاولیٰ ہے اگر عرفات کی طرف سے آئیں تو ترتیب الٹ جاتی ہے پہلے جمرۃ الاولیٰ، پھر جمرۃ الوسطیٰ اور پھر جمرۃ عقبیٰ پڑتا ہے۔

یہ جمرات پتھر کے قدرے بھدے سے ستون ہیں، ان کی بلندی بارہ، تیرہ فٹ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ہر جمرہ ایک مدور گھیر میں بنایا گیا ہے سمینٹ کا بنا ہوا یہ بھدا سا دائرہ یا حوض تقریباً تین چار فٹ بلند ہوگا۔ اس میں جمرات کو ماری جانے والی کنکریاں گرتی ہیں۔ بعض حاجی حضرات ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں لہذا ایام تشریق میں رمی جمرات کے بعد اگر آپ وہاں جائیں کروڑوں، اربوں کنکریوں کے علاوہ سینکڑوں جوتے بھی پڑے ملیں گے۔ جو شیطان کو رسید کیے گئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اپنا

کھویا ہوا جوتا یا چپل یہیں سے مل جائے۔

عہد جاہلیت میں، ایام حج میں یہاں بازار لگا کرتے تھے۔ عرب یہاں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کی بڑائی اور بزرگی بیان کرتے اور وہ سب کچھ ہوتا جو میلوں ٹھیلوں میں ہوتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانوں میں جب حجاج کرام کی تعداد آج کے مقابلے میں کافی کم ہوتی تھی تب بھی جمرات کے ارد گرد بازاروں کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ اب جب کہ زائرین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے، راستوں کو کشادہ کرنے کے لئے تعمیرات اور بازاروں کو کافی پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔

ہم منیٰ کو دیکھ رہے تھے جہاں بالکل سناٹا تھا۔ عمارتیں بنی ہوئی تھیں مگر خالی تھیں، شیڈ پڑے ہوئے تھے جہاں یقیناً ایام الحج میں دوکانیں قائم کی جاتی ہوں گی، مگر اس وقت سناٹا تھا۔ یہ بازار حج کے ایک مہینے میں لگتے ہیں اور یہاں خورد نوش کا ہر طرح کا سامان ملتا ہے۔ اس وقت ان چیزوں کے لاکھوں خریدار ہوتے ہیں۔ اسی طرح منیٰ کے بنے ہوئے مکانات، مال دار حاجیوں کو کرائے پر دے دیے جاتے ہیں اور ان سے اتنا کرایہ وصول کر لیا جاتا ہے کہ سال بھر یہ عمارت خالی پڑے رہے تب بھی مالک مکان کو خسارہ نہیں ہوتا۔

جمرہ عقبیٰ کو دیکھنے کے بعد ہم ٹہلتے ہوئے جمرہ الوسطیٰ اور پھر جمرہ الاولیٰ تک آئے۔ یہ تینوں جمرات ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں شیطان نے سیدنا ابراہیم کو بہکانے اور ان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی تھی جب کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو اذن خداوندی سے قربان کرنے لے جا رہے تھے۔

....

یہ دو ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے۔

سیدنا ابراہیم اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل کو دشت فاران میں چھوڑ کر فلسطین میں اپنی پہلی بیوی سارہ کے ساتھ رہ رہے تھے، اسی طرح بارہ تیرہ سال گذر گئے جب سیدنا ابراہیم نے متواتر تین رات خواب میں دیکھا کہ وہ اسماعیل کو راہ خدا میں قربان کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی آزمائش تھی جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن وہ ابراہیم تھے، پیکر تسلیم و رضا چنانچہ انہوں نے رخت سفر باندھا اور دشت فاران پہنچے، یہاں بئر اسماعیل کے قریب ایک درخت کے نیچے ایک بارہ تیرہ سالہ خوش شکل لڑکا بیٹھا

تیر بنا رہا تھا۔

یہ اسماعیل تھے۔

سیدنا ابراہیم اپنی بیوی اور بیٹے سے ملے، جنہیں اس دشت و بیاباں میں رہتے کئی سال ہو گئے تھے، پانی کا چشمہ جاری تھا، جس کے گرد کنواں بنالیا گیا تھا۔ پتھروں سے ایک گھر سا سائبان بھی بنالیا گیا تھا، اسماعیل کو فطری طور پر شکار کا شوق تھا لہٰذا وہ تیر بنانے لگے تھے۔ ماں اور بیٹا، سیدنا ابراہیم کے آنے پر خوش تھے کہ سیدنا ابراہیم نے انہیں اپنا خواب سنایا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"آپ وہ کچھ کر گذریئے جس کا آپ کو حکم ملا ہے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں پائیں گے"۔

ہو سکتا ہے اس خبر سے سیدہ ہاجرہ کے دل کے پرخچے اڑ گئے ہوں مگر آخر پیغمبر کی بیوی تھیں اور ہونے والے دوسرے پیغمبر کی ماں تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تنہائیوں کا واحد سہارا، اپنا جگر گوشہ سیدنا ابراہیم کے سپرد کر دیا۔ اٹھانوے سالہ بوڑھا باپ تیرہ سالہ نوجوان بیٹے کو لے کر مکہ سے تین میل دور منیٰ وادی میں پہنچا۔ شیطان راستے میں تین جگہ ابراہیم اور اسماعیل کے دل میں وسوسہ ڈالنے اور شکوک پیدا کرنے کے لئے سامنے آیا تو سیدنا ابراہیم نے اس کو کنکریاں ماریں۔ عین انہی مقامات پر جمرات نصب کر دیئے گئے ہیں۔

یہ ادائے ابراہیمی، اب ہر سال ہزاروں، لاکھوں حجاج کرام دہراتے ہیں

آج کل جہاں مذبح خانے بنے ہوئے ہیں اور دس ذی الحج کو قربانی دی جاتی ہے وہیں کسی پہاڑی پر سیدنا ابراہیم، اسماعیل کو لے گئے اور انہیں چٹان پر پیشانی کے بل لٹا دیا تا کہ ان کے چہرے پر ابھرنے والے اذیت کے آثار نہ دیکھ سکیں بلکہ انہوں نے اپنی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ لی اور چھری جسے وہ بہت زیادہ تیز کر چکے تھے، بیٹے کی گردن پر رکھی ہی تھی کہ وحی نازل ہوئی قرآن اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"اور ہم نے ندا دی کہ۔۔۔۔ "اے ابراہیم تو نے خواب کو سچ کر دکھایا"

ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں

یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی

اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا

اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لئے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی

سلام ہے ابراہیم پر

ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں

(الصفت ۱۱۰ تا ۱۱۴)

ہر سال دس ذی الحج کو نہ صرف حجاج کرام بلکہ روئے زمین کے تمام صاحب نصاب مسلمان، اس عظیم قربانی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اس دن ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں جانور ذبح ہوتے ہیں۔ اللہ نے اس طرح اپنے محبوب پیغمبر کو رہتی دنیا تک زندہ جاوید کر دیا۔

....

تینوں جمرات کو دیکھ کر اب ہم واپس آ رہے تھے۔ جمرات کا راستہ پہلے آسماں تلے تھا اب دو منزلہ ہو گیا ہے۔ حجاج کرام کے بے پناہ رش کو دیکھتے ہوئے سعودی حکومت نے لاکھوں افراد کو بیک وقت رمی جمرات کی سہولت دینے کے غرض سے جمرات کے راستے کے اوپر ایک بہت وسیع و عریض پل بنا دیا ہے اور جمرات کا راستہ دو منزلہ ہو گیا ہے۔ اب اگر ہزاروں افراد نیچے سے رمی جمرات کرتے ہیں تو اسی وقت اس سے کہیں زیادہ تعداد میں حجاج کرام اوپری منزل سے رمی کرتے ہیں نیچے کی طرح اوپری حصے پر بھی جمرات استادہ کر دیئے گئے ہیں۔ اوپر سے پھینکی جانے والی کنکریاں اوپر ہی ڈھیر نہیں ہوتیں بلکہ نیچے اصل جمرات پر گرتی ہیں بشرطیکہ نشانہ صحیح ہو۔

ہم گاڑی میں واپس بیٹھ چکے تھے اور اب مسجد خیف کی طرف روانہ تھے۔ منیٰ کی آخری مشرقی حد پر پہاڑ کے دامن میں منیٰ کی سب سے بڑی اور سب سے معروف مسجد خیف ہے۔ اس جگہ رسول اللہ نے حجتہ الوداع کے موقع پر اپنا خیمہ لگایا تھا اور آٹھ ذی الحج کو ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور ۹ ذی الحج کو فجر کی نماز ادا کی تھی اور اس کے بعد عرفات کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ رسول اللہ کے خیمے کی جگہ کو مسجد بنا دیا گیا۔ جو مختلف ادوار میں توسیع کے مراحل سے گذرتی رہی، اب جو مسجد خیف ہمارے سامنے تھی اس کی وسعت اور کشادگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں بیک وقت دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔

منیٰ اور مسجد خیف کے ہم نے دو روپ دیکھے۔ ایک تو اسی دن زیارت کرتے ہوئے، یعنی ماہ

رومضان کی آخری تاریخ کو۔۔۔۔۔اور دوسرا ڈھائی ماہ بعد جب ہم حج کرنے آئے تب۔ پہلی مرتبہ وہاں ہو کا عالم تھا۔ پوری مسجد بھائیں بھائیں کر رہی تھی، مسجد کی سیڑھیوں پر ہمارے بچے دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور حج کے دنوں میں اسی مسجد خیف کے اردگرد، لاکھوں افراد کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ حج کے دنوں میں ہمارا خیمہ منیٰ میں مسجد خیف سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ ہم باتھ روم جانے کے لئے یا وضو کرنے کے لئے بعض اوقات مسجد خیف چلے جاتے تھے۔ منیٰ میں ہمارا قیام ۸ تا ۱۲ ذی الحج رہا۔ حج کے موقع پر بچے ہمارے ساتھ تھے۔ اس سال ریکارڈ گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمارے معلم نے جو خیمہ ہمیں دیا تھا اس میں نصب DESERT COOLER ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی خراب ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب ہم گرمی سے بے حال ہوتے تو مسجد چلے جاتے جہاں سینکڑوں اے۔سی پوری قوت سے چل رہے تھے جن کی وجہ سے مسجد اتنی ٹھنڈی ہو گئی تھی کہ اوپر چادر یا کھیس لینی پڑتی تھی۔ نماز کا وقت ہو یا نہ ہو، مسجد زائرین سے اس طرح کھچا کھچ بھری تھی کہ اوپر سے کوئی چیز پھینکی جائے تو شائد زمین تک نہ پہنچ سکے۔ اس غضب ناک رش کی وجہ سے ہم ایک وقت کی نماز بھی مسجد خیف میں نہ پڑھ سکے۔ آذان ہوتی تو اپنے خیموں میں ہی صفیں باندھ لیتے۔

حج کے دنوں میں مسجد خیف کے حوالے سے دو سخت ناگوار واقعات ہوئے۔ وہ دس ذی الحج کا دن تھا رمی اور قربانی سے فارغ ہو کر ہمیں احرام اتارنا تھا۔ چنانچہ میں نہانے دھونے کی غرض سے، نئے کپڑے لے کر ثناء کے ساتھ مسجد خیف چلی گئی جہاں متعدد غسل خانے بنے ہوئے تھے اور انتہائی زور و شور سے نلکوں میں پانی آتا تھا میں نے احرام اتارا، سر کے بال تراشے، غسل کیا، نئے کپڑے پہنے تو سوچا لگے ہاتھوں پرانے کپڑے اور احرام بھی دھو ڈالوں، ثناء نہانے چلی گئی تھی لہٰذا میں وہیں کپڑے دھونے لگی، اچانک دھما چوکڑی سی مچ گئی، بائیں جانب گردن گھما کر دیکھا تو دو عورتیں گتھم گتھا تھیں۔ ان میں سے ایک انتہائی خوبصورت سفید جلد والی، چالیس بیالیس سالہ عورت تھی، شائد مصری تھی، جب کہ دوسری غسل خانوں کی صفائی کرنے والی سیاہ فام حبشن ملازمہ تھی۔ میرے پاس ہی چند پاکستانی خواتین بھی میری ہی طرح کے کاموں میں مصروف تھیں 'یہ کیا ہو رہا ہے۔' میں نے حج کے پرامن دنوں میں یہ پہلا جھگڑا دیکھا تھا۔ اور وہ بھی خواتین کا دنگل! اور وہ بھی مسجد خیف کے غسل خانے میں

''یہ لڑائی تو بہت دیر سے ہو رہی ہے''۔ ایک پاکستانی خاتون نے مجھے جواب دیا

''کیا بات ہو گئی آخر''۔

اسی وقت مصری خاتون نے اپنی مدمقابل کو ایک زبردست جھانپڑ رسید کیا ساتھ ہی سولہ سترہ سالہ نازک اندام حسین و جمیل لڑکی نے، جو شکل سے گوری عورت کی بیٹی لگ رہی تھی، حبشن ملازمہ کو زبردست دھکا دیا، زمین پر پانی تو پہلے ہی سے پڑا ہوا تھا لہٰذا حبشن ملازمہ پھسل کر بری طرح گری۔ لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی، وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح گوری عورت پر جھپٹی اور اس کو رگیدتے ہوئے کئی گز تک گھسیٹ لے گئی، اور اس کے لمبے سیاہ، گیلے بال پکڑ کر اسے دھکا دینے کی کوشش کی مگر اس کی بیٹی نے اسے سنبھال لیا۔ اب یہ دنگل ہم سے چند گز کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔ ایک مزید جھونک میں ہو سکتا تھا کہ وہ تینوں ہمارے اوپر آ رہتیں۔ لیکن اچانک ہی صورت حال بدل گئی، گوری عورت کی لڑکی جسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ سب لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں، اچانک احساس شرمندگی، اور احساس ذلت سے رونے لگی، لہٰذا اماں دنگل چھوڑ کر بیٹی کو چپ کرانے کے لئے اس کے پاس چلی گئی اور حبشن جمعدارنی ایک احساس فتح مندی سے انہیں دیکھتے ہوئے دوسری طرف چل پڑی۔

''اصل میں'' اب وہ پاکستانی خاتون میری طرف متوجہ ہوئیں ''یہ عرب عورت اپنی بیٹی کے ساتھ احرام اتارنے اور نہانے دھونے آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے تولیہ دھویا اور پنکھے کے اوپر پھیلا دیا۔ جمعدارنی نے منع کیا کہ پنکھے پر تولیہ نہ پھیلاو، وہ نہ مانی تو جمعدارنی نے اپنے ڈنڈے سے اس کا تولیہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس پر ہنگامہ شروع ہو گیا''۔

خدا جانے زیادہ بڑی غلطی کس کی تھی، تاہم ایک بات ضرور ہے کہ میں نے حرم کی سیاہ فام ملازم عورتوں کو سخت بدتہذیب بلکہ خاصا بدتمیز پایا، اس کے مقابلے میں دیگر سیاہ فام عورتیں، خصوصاً اشیاء فروخت کرنے والی عورتوں میں ایسی بدتہذیبی نہیں دیکھی۔ پاکستانی خواتین اس جھگڑے پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ زیادہ تر کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ عرب عورت اور اس کی بیٹی نے احرام اتار کر جو لباس پہنا وہ انتہائی ننگا اور ناکافی لباس تھا۔

دوسرا واقعہ بھی یہیں پیش آیا، منیٰ سے روانگی سے قبل میں نے سوچا کہ جو چند کپڑے، بچوں کے گندے ہوئے ہیں انہیں دھو کر سکھا لوں تا کہ ان میں بو نہ آئے، میں ثناء کو لے کر مسجد خیف کے غسل خانوں میں چلی گئی۔ جہاں میں کپڑے دھو رہی تھی وہیں دو نوجوان سیاہ فام خواتین بھی نہانے کی غرض سے

آئی تھیں۔ ان دونوں نے کمر پر دو بالشت کی لنگی لگائی ہوئی تھی باقی بالکل برہنہ تھیں۔ جو زیادہ جوان تھی اس کے سینے سے ایک بچہ چمٹا ہوا تھا، دوسری اس "آڑ" سے بھی بے نیاز تھی

مجھے یہ صورت حال اس لئے سخت بری لگی کیونکہ غسل خانوں میں بیشتر ماؤں کے ساتھ ان کے کم عمر بچے بھی آئے ہوئے تھے جو حیرت سے ہونق بنے ان دونوں برہنہ خواتین کو دیکھ رہے تھے۔ میرے ساتھ ثناء تھی، ظاہر ہے مجھے اس بات پر غیرت آنی ہی تھی، میں نے کپڑے ایک طرف رکھے اور اس لڑکی کے پاس پہنچی جس کی گود میں بچہ تھا۔ دوسری عورت غسل خانے کے اندر نہانے کے بجائے، وضو کرنے کے لئے جو نلکے باہر لگے ہوئے تھے ان کے آگے بیٹھ کر نہار ہی تھی۔ بے شرمی کے یہ نظارے سخت ناقابل برداشت تھے۔

"اپنے آپ کو ڈھکو" میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس لڑکی سے کہا۔ اس نے کندھے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں نے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ یہاں لڑکے بھی ہیں۔

"یہ کیوں یہاں آئے ہیں" اس نے لاپرواہی سے کہا "یہ عورتوں کا حمام ہے"۔

اس کے آگے میری عربی دم توڑ گئی۔ اردو یا انگریزی کا معاملہ ہوتا تو اسے ایک گھنٹے کا ایسا شاندار لیکچر جھاڑتی کہ اسے برسوں یاد رہتا مگر زبان کا مسئلہ آڑے آ گیا میں ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتی واپس آ گئی۔ اس وقت میرے قریب کھڑی ایک ادھیڑ عمر عورت نے میری ترجمانی کی اور عربی میں اسے سمجھانے لگی

"یہ عورتوں کا حمام تو ہے، مگر حیا تو عورتوں سے بھی کرنی چاہئے۔ اسلام نے اس کو لازم کیا ہے، پردہ عورتوں سے بھی ہے، اس کھلی بے حیائی کو کوئی پسند نہیں کرے گا"۔

'وہ عرب عورت بلا مبالغہ، سات آٹھ منٹ تک اس سیاہ فام لڑکی کو بڑی نرم زبان میں سمجھاتی رہی۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ ہم سمجھے کچھ اثر ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ وہ پلٹ کر اس طرف گئی جہاں اس کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہم سمجھے وہ کوئی چادر یا کپڑا اپنے اوپر ڈال لے گی۔ مگر ہوا یہ کہ اس نے سامان کی جگہ پر بچہ بٹھا دیا، اور خود دوسرے نلکے کے نیچے نہانے بیٹھ گئی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میں نے اس عرب ناصح عورت کو دیکھا جو اپنا لیکچر ضائع جانے پر ملول تھی۔ میں نے اپنے کپڑے اٹھائے، اور ثناء کو لے کر سب سے پچھلی

طرف چلی گئی۔

....

منیٰ سے اگلی منزل مزدلفہ تھی، یہ وسیع میدان ہے یہاں ایک مسجد بھی ہے جو مسجد مزدلفہ یا مسجد مشعر الحرام کہلاتی ہے۔ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مزدلفہ کی بابرکت رات ذکر و فکر، عبادت اور دعا میں گذاری تھی۔ حجاج کرام مزدلفہ سے ہی رمی جمرات کے لئے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔

"یہ مزدلفہ ہے" سجاد بھائی نے چاروں طرف پھیلے ہوئے میدان کی طرف اشارہ کیا کہیں کہیں چھوٹے درخت لگے ہوئے تھے اور کہیں کہیں گھاس بھی نظر آ رہی تھی۔ تا حد نظر تک ہمارے علاوہ وہاں ایک خاندان اور نظر آ رہا تھا، چند بڑے، چند خواتین اور چند بچے، ان کی گاڑیاں نزدیک ہی پارک تھیں اور وہ دریوں پر بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے اور ان کے بچے کھیل کود اور بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ اس کے علاوہ مزدلفہ کے میدان میں ہو کا عالم تھا۔

اسی مزدلفہ کا دوسرا رخ ہم نے ڈھائی ماہ بعد حج کے موقع پر دیکھا جب عرفات سے واپسی پر ہم نے یہاں ۹ اور ۱۰ ذی الحج کی درمیانی رات گذاری تھی۔ اور یہ میدان اس وقت پوری طرح آباد تھا۔ سینکڑوں ویگنیں اور بسیں کھڑی تھیں ہزاروں افراد مزدلفہ کے میدان میں تھکے ہارے، ننگی زمین پر ادھر ادھر بے سدھ پڑے تھے۔ یہ خاصی نامناسب بات ہے کہ معلم حضرات مزدلفہ میں رات کے قیام کی کوئی سہولت نہیں دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ رات میں موسم اچھا ہو جاتا ہے لہٰذا خیموں کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن کم از کم عارضی بیت الخلاء کا انتظام ضرور ہونا چاہئے۔

جن لوگوں کو سابقہ تجربہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ خاصا سامان منیٰ سے لے کر چلے تھے۔ پورے بستر، پانی کے کین، اور ضرورت کی متعدد چیزیں۔ مجھے چونکہ اندازہ نہیں تھا لہٰذا میرے پاس صرف کاٹن کی دو چادریں نکلیں۔ وہی بچھائی گئیں، بچے بغیر تکیے کے چادروں پر لیٹتے ہی سو گئے۔ میں اور سجاد کنکریاں چننے چلے گئے۔ میں سوچ رہی تھی ننگی زمین پر خدا جانے نیند آئے گی یا نہیں۔ ویسے تو یہ عبادت والی رات تھی لیکن، ہم اس قدر تھک چکے تھے کہ شائد ہمارے لئے سب سے بڑی عبادت اس وقت سونا ہی تھا۔ چنانچہ ہم سب اس طرح سو گئے، کہ ہمارے اور مزدلفہ کی سخت، پتھریلی زمین کے درمیان صرف ایک چادر تھی۔

صبح فجر کی آذان کے ساتھ ہی ہمارے ڈرائیور نے ویگن کا ہارن بجا بجا کر ہمیں اٹھا دیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو عجیب منظر نظروں کے سامنے تھا، دور تک پھیلا ہوا مزدلفہ کا میدان، صبح کا دھندلکا، ہزاروں سوئے پڑے ہوئے، مسافران رہ شوق کا ایک ایک کر کے نماز کی تیاری کے لئے اٹھنا، کتنے اچھے شب و روز ہوتے ہیں حج کے

مزدلفہ پر حرم کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عہد جاہلیت میں جب حج کیا جاتا تھا تو قریش مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے جب کہ باقی لوگ عرفات جاتے تھے (۔عرفات حدود حرم سے باہر ہے) قریش کا کہنا تھا کہ ہم اہل حرم ہیں، حرم سے باہر نہیں جائیں گے۔ اسی بدعت کو ختم کرنے کے لئے رسول اللہ نے عرفات میں قیام کو حج کا لازمی رکن قرار دیا تھا

☆☆☆☆☆

جنت المعلیٰ

۳ راپریل ۱۹۹۲ء کو عید تھی، وہ جمعہ کا دن تھا، سجاد بھائی نے چھٹی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں آثار مکہ کی زیارت کرانے کا پروگرام بنالیا۔ راحیلہ کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ میں راشد صاحب رہتے تھے جو گزشتہ کئی سالوں سے مکہ میں آباد ہیں اور انہیں آثار مکہ میں سے خاصی جگہوں کا علم تھا لہذا ان کی معیت اختیار کی گئی یوں ہمارا تین گاڑیوں کا قافلہ عید والے دن آثار مکہ کی زیارت کے لے نکلا۔

سب سے پہلے ہم جنت المعلیٰ پہنچے، مکہ مکرمہ کا یہ مشہور اور تاریخی قبرستان، حجون میں شارع غزہ پر مسجد جن کے قریب ہے۔ اب اس قبرستان کے دو حصے کر دیے گے ہیں اور ان دونوں کے درمیان سڑک نکالی گی ہے۔ شمال میں ایک چھوٹے احاطے میں سیدہ خدیجہ الکبریٰ ؓ، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے بیٹے قاسم اور عبداللہ، حضور ﷺ کے اجداد مثلاً حضرت عبدالمطلب، حضرت ابو طالب کی قبریں ہیں۔ اس حصے میں اور بہت سے صحابہ کرام، تابعین عظام اور اولیائے کرام دفن ہیں مثلاً حضرت اسما بنت ابی بکرؓ، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور حضرت فضیل بن عباسؓ وغیرہ۔ یہ قبرستان بیت اللہ سے کوئی ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس کے سامنے کا بلند پہاڑی حصہ حجون کہلاتا ہے۔ فتح مکہ کے وقت رسول اللہ یہاں ٹھہرے تھے۔

نجدیوں کی حجاز میں آمد سے قبل یہاں بہت سی پختہ قبروں پر بڑے شاندار قبے بنے ہوئے تھے۔ جو اکابر صحابہ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے اور لوگ ان پر طرح طرح کے نذرانے بھی پیش کرتے تھے۔ نجدیوں نے آکر ان تمام قبوں کو گرادیا اور پختہ قبروں کو مسمار کر دیا۔ اب یہاں کوئی پختہ قبر نہیں ہے۔ چونکہ اندر جانے کا راستہ بند تھا لہذا میں نے چاردیواری پر چڑھ کر جنت المعلیٰ کے اندر دیکھا، یہ اندازہ لگانا سخت دشوار تھا کہ کون سی قبر کس کی ہے، تاہم راشد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب اشارہ کیا، جہاں چند قبریں تھیں جن پر اینٹیں رکھی ہوئی تھیں، انہیں میں سے ایک سیدہ خدیجہ الکبریٰؓ کی قبر تھی۔

وہ خدیجہ الکبریٰؓ جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعہ سلام بھیجا تھا اور جنت میں ایک

شاندار محل کی بشارت دی تھی۔ وہ مکہ کی انتہائی صاحب حیثیت اور صاحب جمال خاتون تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آنے سے قبل وہ پہلے ابو ہالہ ہند بن زرارہ کے نکاح میں تھیں۔ جن سے آپ کی تین اولادیں ہوئیں دو بیٹے ہند اور حارث اور ایک بیٹی زینب، ابو ہالہ کی وفات پر سیدہ خدیجہ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا۔ ان سے حضرت خدیجہ کی ایک بیٹی ام محمد پیدا ہوئیں۔

سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کا ذریعہ معاش تجارت تھا، والد اور دونوں شوہروں کی وفات کی وجہ سے اپنے تجارتی امور وہ خود نبٹاتی تھیں۔ وہ لوگوں کو اجرت پر کام دیتی تھیں۔ اور مضاربہ کے طور پر مال ان کے حوالے کرتی تھیں۔ مضاربہ کے معنی یہ ہیں کہ مال اپنا دیتی تھیں اور اس کے فروخت کرنے کا معاوضہ (کمیشن) طے کر لیتی تھیں۔ ان کا مال عموماً شام جاتا تھا اور ان کے مال کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ مکہ کے کاروان تجارت میں جتنے اونٹ قریش مکہ کے ہوتے تھے، اتنے ہی تنہا سیدہ خدیجہ کے ہوتے تھے۔

ان کے چھوٹے بھائی عوام بن خویلد بن اسد کی شادی رسول اللہ کی پھوپی، صفیہ بنت عبدالمطلب سے ہوئی تھی، اس اعتبار سے سیدہ خدیجہ اور رسول اللہ کی پھوپی صفیہ آپس میں نند بھاوج تھیں۔ وہ بھائی کے بھتیجے کی تجارتی مہارت، اور امانت و صداقت کے چرچے سنا کرتیں لہٰذا اس سال انہوں نے تجارت کی فروخت کے لئے رسول اللہ ﷺ کو چنا اور پیغام بھیجا۔

''میرا مال تجارت لے کر شام جائیں، میرا غلام میسرہ آپ کے ہمراہ ہوگا، جو معاوضہ میں آپ کے ہم قوموں کو دیتی رہی ہوں، آپ کو اس کا دوگنا دوں گی۔''

تجارتی معاملات طے ہو گئے۔ سیدہ خدیجہ کا مال کثیر لے کر آپ ﷺ شام کے شہر بصریٰ گئے اس سفر میں زبردست منافع ہوا جس سے سیدہ خدیجہؓ خاصی متاثر ہوئیں، چنانچہ سفر شام سے واپسی کے تین ماہ بعد سیدہ خدیجہ ﷺ نے آپ کو پیغام نکاح بھیجا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ پچیس سال کے نوجوان تھے اور سیدہ خدیجہؓ چالیس سال کی صاحب حیثیت اور عیالدار خاتون تھیں جن کے پاس گھر میں چار بچے تھے۔ نکاح کی صورت میں یہ چاروں بچے رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری بن جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے بطیب خاطر یہ رشتہ منظور کر لیا اور شادی کے بعد آپ سیدہ خدیجہؓ کے گھر میں رہنے لگے۔ اسی گھر میں آپ کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہوئے، یہی گھر قریش مکہ کی اذیتوں کے دوران آپ کے لئے دارالقرار و سکون بنا رہا، یہیں سے آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

سیدہ خدیجہ کا یہ مکان اب بھی موجود ہے گو کہ بدقسمتی سے ہم اس کی زیارت نہ کر سکے تاہم مقامی لوگ سیدہ خدیجہؓ کے گھر کی راہنمائی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کو مروہ سے باہر نکلیں تو سامنے چھتہ بازار میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب زرگروں کی پہلی گلی میں یہ مکان ہے۔ اب یہاں پر ایک دارالحفاظ قائم ہے جہاں بچے قرآن پاک حفظ کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت کر گئے تو یہ مکان خالی ہو گیا، اسے حضرت عقیلؓ بن ابی طالب نے لے لیا۔ ان سے بعد میں حضرت معاویہؓ نے خرید کر مسجد میں تبدیل کر دیا۔

سیدہ خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں تقریباً چوبیس سال رہیں۔ یہ ہر لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کی بہترین رفیقہ حیات رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی چاروں بیٹیاں اور تین میں سے دو بیٹے انہیں کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ یہ شرف بھی صرف انہی کو حاصل ہے کہ ان کی زندگی میں رسول اللہ نے دوسری شادی نہیں کی۔ سب سے پہلے رسول اللہ کی بعثت پر یقین کرنے والی اور سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی خاتون یہی تھیں۔ تبلیغ اسلام کے ابتدائی دس، انتہائی سخت اور کڑے سالوں میں آپ کی مونس و معاون یہی رہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ قریش مکہ کی عداوتیں شدید تر ہوتی جا رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی جان کو سخت خطرہ تھا۔ یہ صورت حال سیدہ خدیجہؓ کے لئے سخت پریشان کن تھی، تاہم وہ انتہائی صبر و حوصلہ سے کام لیتی رہیں، اپنے بیٹوں ہند اور حارث کو رسول اللہ ﷺ کی معاونت کی تاکید کرتیں، چنانچہ ان کے یہ دونوں بیٹے راہ اسلام میں شہید ہوئے۔ حارث بن ابی ہالہ کو تو اسلام کا سب سے پہلا شہید ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، (جب کہ ہند، غزوہ بدر یا غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے) رسول اللہ ﷺ سے ان کے دونوں بیٹے قاسم اور عبداللہ کم سنی میں وفات پا چکے تھے۔ یہ خاصے بڑے حادثے تھے کیونکہ اس عرب معاشرے میں 'بیٹا' سیادت و قیادت، عزت وقار اور طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔

دیکھا جائے تو سیدہ خدیجہ کو بہت سے خانگی، سماجی اور مالی نوعیت کے مسائل سے نبٹنا پڑ رہا تھا۔ ان کی دولت کا ایک بڑا حصہ تبلیغ اسلام پر خرچ ہونے لگا تھا۔ یہ انتہائی درجہ کی عالی حوصلگی اور ظرف کی بات تھی کہ انہوں نے بے دریغ اپنا مال مسلمانوں پر خرچ کیا چنانچہ مکہ میں ایک اور معروف قبرستان شبیکہ ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب کہ کفار قریش کی عداوت و حالات کی پیچیدگی سے مسلمانوں کی تدفین میں مزاحمت کی گئی تو ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ نے اپنی یہ زمین مسلمانوں کے قبرستان کے طور پر وقف کر دی تھی۔ اسی طرح کے اور بہت سے کام مسلمانوں کی منفعت کے لئے سیدہ خدیجہؓ کے مالی تعاون سے ممکن ہوئے۔

شعب ابی طالب کے تین انتہائی ہولناک سالوں کے بعد سیدہ خدیجہؓ محض چند ماہ زندہ رہ سکیں۔ ان مصائب نے ان کی صحت پر بُرے اثرات مرتب کئے تھے وہ مسلسل بیمار رہنے لگی تھیں۔ جب ان کی وفات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسی حجون کے قبرستان میں جو اب جنت المعلیٰ کہلاتا ہے، عبدالمطلب کی قبر سے ذرا فاصلے پر دفن کیا۔ خود قبر میں اترے اور اپنی رفیقہ حیات کو بھاری دل سے سپرد خاک کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ساری زندگی ان کی رفاقت، ان کی قربانیوں اور ان کے ایثار و وفا کو یاد رکھا۔ ایک وقت مدینہ میں ایسا بھی آیا کہ آپ کے پاس پانچ سے زائد اعلیٰ نسب، خوبصورت، ذہین اور پاکیزہ بیویاں تھیں مگر آپ خدیجہؓ کی یاد کو دل سے نہ بھلا سکے۔ خصوصاً جب آپ ﷺ سیدہ ہالہؓ کی آواز سنتے تو بے قرار ہو جاتے کیونکہ ان کی آواز سیدہ خدیجہؓ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ جب قربانی کا گوشت اقرباء میں بھجواتے تو یاد کر کے ان کی سہیلیوں کو ہدیہ بھجواتے۔ سیدہ عائشہ ان باتوں سے رشک محسوس کرتیں۔ ایک بار انہوں نے کہا ’آپ سرخ بالوں والی بڑھیا کو یاد کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر بیویاں آپ کو دے دیں‘۔

’ہرگز نہیں‘ رسول اللہ نے کہا ’خدیجہؓ نے اس وقت میری تصدیق کی اور مجھ پر ایمان لائیں جب لوگوں نے میری تکذیب کی، خدیجہؓ نے مجھے اپنے مال و منال میں شریک کر لیا‘۔

یہ ساری باتیں میرے ذہن میں گذرتی رہیں، ہم جنت المعلیٰ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ یہ قبرستان شمال اور جنوب دونوں اطراف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہوگا، کیونکہ یہ پہاڑ اب بھی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ان پہاڑوں کو بہت کچھ کاٹ کر ان پر کئی کئی منزلہ مکانات بن گئے ہیں۔ انہی پہاڑیوں کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک راستہ جاتا ہے جسے طریق کدا کہتے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل کو اس وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کر جانے لگے تو بی بی ہاجرہ ان کے پیچھے دوڑتی ہوئی طریق کداء تک آئیں اور کہا کہ آپ ہمیں کیوں یہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بتایا کہ یہ خدا کا حکم ہے تو انہیں تسلی ہوگئی اور وہ یہ کہہ کر واپس چلی گئیں کہ پھر خدا ہمیں ضائع نہ کرے گا۔

یہی وہ راستہ ہے، جس سے فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆

مسجد جن اور مسجد رایہ

جنت المعلیٰ سے اگلی منزل مسجد جن تھی۔ یہ مسجد، سوق معلیٰ میں جنت المعلیٰ کے قبرستان کے قریب ہے اس کا نام مسجد بیعت اور مسجد حرس بھی ہے یہیں جنوں نے رسول کریم کی بیعت کی تھی تب وہ ایک کھلا میدان تھا مگر اب یہاں خاصی بڑی مسجد بنادی گئی ہے۔ پتھروں کی بنی ہوئی اس مسجد کا ایک مینار ہے اور اس کی تعمیر خاصی سادی ہے۔

جنوں کا گروہ اس سے قبل مقام نخلہ میں قرآن کی سماعت کر چکا تھا امام ترمذی نے اپنی الجامع میں حضرت ابن عباس کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ کی بعثت سے قبل جنات آسمان پر جا کر خبریں لاتے تھے اور ایک سچی خبر کے ساتھ نو جھوٹی خبریں بھی اپنی طرف سے بڑھا دیتے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو مبعوث فرمایا تو جنوں کو آسمانی خبریں ملنا بند ہوگئیں جب جن خبریں سننے کے لئے آسمان پر جاتے تو آسمان سے شعلے چھوٹتے اور انگارے برستے۔ اس پر جن بڑے پریشان ہوئے۔ انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ دنیا میں کسی بڑے واقعہ کے رونما ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے آسمانی خبریں رک گئی ہیں۔ اس لئے زمین کے مشرق و مغرب میں گھوم پھر کر اس امر مانع کا پتہ لگانا چاہئے۔ چنانچہ جنوں نے اس سلسلے میں کوششیں شروع کر دیں۔

ایک دن رسول اللہ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مقام نخلہ میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا وہاں سے گذر ہوا۔ انہوں نے قرآن سنا تو فوراً اس نتیجے پر پہنچے کہ یہی وہ امر مانع ہے اور یہی وہ واقعہ ہے، جس کے باعث آسمانی خبریں ہم سے روک لی گئی ہیں۔ پھر ان جنوں نے واپس جا کر اپنی جن برادری کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو رشد و بھلائی کی طرف راہبری کرتا ہے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ کو قرآن پاک نے دی:

اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن مجید سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک حیرت انگیز کلام سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ (سورۃ جن:۱)

یہ سات یا نو جن تھے جنہوں نے مقام نخلہ میں قرآن سنا تھا۔ اس کے بعد جنوں کا ایک وفد مکہ مکرمہ آیا اور رسول اللہ کی بیعت کی، مسجد جن اسی تاریخی واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ چونکہ بطن نخلہ میں جنوں کا قرآن سننا انتہائی معروف واقعہ ہے لہذا بہت سے لوگ یہ درست نہیں سمجھتے کہ جن مکہ میں آئے تھے چنانچہ محمد عاصم صاحب نے 'سفر نامہ ارض القرآن' میں سہواً یہی لکھا ہے کہ مشہور یہ ہے کہ یہاں (یعنی مسجد جن کے مقام پر) جنوں نے رسول اللہ کو قرآن پڑھتے سنا اور پھر وہ ایمان لائے (سفر نامہ ارض القرآن ص ۱۵۵) لیکن صحیح یہ ہے کہ جنوں کے قرآن سننے اور ایمان لانے کا واقعہ وادی بطن نخلہ میں پیش آیا جو مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ بالکل یہی غلطی ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان صاحب نے اپنے سفر نامے 'کراچی سے گنبد خضراء تک' میں کی ہے۔ (ص ۱۱۲۔۱۱۳)

اصل بات یوں ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی سماعت، جنوں کے ایک گروہ نے وادی نخلہ میں کی اس کے بعد وہ وفد کی صورت میں مکہ مکرمہ آئے، اور جس جگہ رسول اللہ کی بیعت کی وہیں آج مسجد جن بنی ہوئی ہے، ظاہر ہے بیعت سے قبل یا بعد میں بھی رسول اللہ نے انہیں قرآن سنایا اور اسلامی احکامات، جتنے اس وقت تک نازل ہو چکے ہوں گے بتائے ہوں گے اور انہیں عقائد کی تعلیم بھی دی ہوگی۔ اس بیعت کے بعد جنوں کے نمائندوں اور ایلچیوں کی آمد و رفت مدینہ منورہ میں متواتر ہوتی رہی۔

مسجد جن کے قریب ہی سیدھے ہاتھ کو مسجد رایہ ہے رایہ کے معنی عربی میں جھنڈے کے ہیں۔ یہ وہ تاریخی جگہ ہے جہاں رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا علم نصب کیا گیا تھا، اور شائد یہیں ان کا خیمہ بھی گاڑا گیا تھا۔ جہاں رسول اللہ ﷺ نے قیام کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر پوچھا گیا کہ آپ کہاں ٹھہریں گے۔ فرمایا

"کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی مکان چھوڑا ہے"۔؟

(حضرت خدیجہ کا مکان اور حضرت عبداللہ کا مکان، عقیل، ہجرت کے بعد بیچ چکے تھے) لہذا مقام حجون

میں جہاں رسول اللہ کے قیام کے لئے خیمہ بنایا گیا وہیں آج مسجد الرایۃ ہے۔ یہ جگہ رسول اللہ ﷺ کے آبائی گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ بالائی مکہ، حجون کی طرف سے داخل ہوئے۔ طریق کداء سے آگے بڑھے ہوں گے اور اس مقام پر پڑاؤ کیا جہاں آج یہ مسجد ہے۔ مسجد الرایۃ ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی مسجد ہے جس کا ایک مینار ہے۔ داخلے کے لئے چار دروازے ہیں، یہاں ہمیں گاڑیاں پارک کرنے کی جگہ مل گئی تھی لہذا ہم سب ہی اترے، اور سبز رنگ کی اس سادہ سی مگر انتہائی تاریخی مسجد کی زیارت کی۔

جبل ابوقبیس

جنت المعلیٰ، مسجد جن، مسجد رایہ اور جناب عبداللہؓ کا گھر جہاں رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی یہ سب قریب قریب واقع ہیں میرا اندازہ ہے کہ حرم پاک سے رسول اللہ کی جائے پیدائش کا فاصلہ ایک، ڈیڑھ فرلانگ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ آثار مکہ کی زیارت کرنے کے خواہشمند حضرات، ضروری نہیں ہے کہ گاڑیوں یا ٹیکسیوں پر سفر کریں، اگر موسم ٹھنڈا ہو تو ترجیحاً یہ سب زیارتیں پیدل کرنی چاہئیں۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں گی اور شہر بھی کو زیادہ قریب سے دیکھا جاسکے گا۔

مکہ کا ایک مشہور پہاڑ جبل ابوقبیس ہے۔ یہ پہاڑ صفا کی پہاڑی کے نزدیک، بیت اللہ شریف کے بالکل سامنے ہے اگر حرم شریف سے حجر اسود کے رخ سے سامنے دیکھا جائے تو بھی یہ پہاڑ نظر آتا ہے۔ یہ بڑا تاریخی پہاڑ ہے، طوفان نوح کے دوران اور بعد میں حجر اسود اسی جبل ابوقبیس پر محفوظ کیا گیا، یہ بات میں پہلے بھی بیان کرچکی ہوں کہ حجر اسود کی یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ یہ پانی پر تیرتا رہتا ہے، ڈوبتا نہیں، طوفان نوح کے نتیجے میں خانہ خدا کو نقصان پہنچا مگر حجر اسود محفوظ کرلیا گیا۔ یہ بھی تاریخی کتب میں ملتا ہے کہ جب زمین پھیلائی گئی اور پہاڑ اس پر میخوں کی طرح گاڑے گئے تو مکہ کا جبل ابوقبیس وہ پہلا پہاڑ ہے جو روئے زمین پر نصب ہوا۔

اسی جبل ابوقبیس کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو مسجد بلال کے نام سے مشہور ہے، یہ پہاڑی زیادہ اونچی نہیں ہے چنانچہ زائرین بہ آسانی اس کی چوٹی تک چڑھ جاتے ہیں بلکہ بہت سے زائرین اسی پہاڑی پر قیام بھی کرتے ہیں اور عارضی خیموں میں رہتے ہیں۔ پہاڑی پر پائپ کے ذریعہ نلوں کا انتظام ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی عارضی طور پر قائم ہوجاتی ہیں جن کی وجہ سے زائرین کو خرید و فروخت میں آسانی ہوجاتی ہے۔ پینے کے مشروبات بھی مل جاتے ہیں۔

تاہم ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ اب نہ ہو کیوں کہ اب یہاں شاہ فہد نے ایک انتہائی عظیم الشان

محل بنوایا ہے۔ جسے دیکھ کر ایک شدید احساس ناگواری میرے اوپر طاری ہوگیا تھا۔ اس محل کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ سلامت حرم کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ سکیں۔ ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ حرم کی آذان محل میں سنائی دیتی ہے اور بادشاہ سلامت وہیں محل میں امام حرم کی امامت میں نماز ادا کرتے ہیں۔

'یہ کیا تک ہے۔' میں نے سجاد سے محل کی تفصیلات سننے کے بعد سخت ناگواری سے کہا' کہ حرم کے ساتھ نماز پڑھنی ہے تو حرم کے بالکل مدمقابل ایک شاندار محل بنالو، جس کی بنیادیں، کلسی دیواریں اور برج آسمان سے باتیں کررہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرم کے مدمقابل کوئی آگیا ہے۔'

ویسے دیکھا جائے تو حرم پاک ہے ہی نشیب میں، خانہ کعبہ کے چاروں طرف اونچے، نیچے، چھوٹے بڑے پہاڑوں کے سلسلے ہیں، ان کے درمیان میں خانہ کعبہ ہے۔ ان پہاڑوں پر ہزاروں مکانات بنے ہوئے ہیں، بارہ بارہ اور تیرہ تیرہ منزلہ ہوٹل کھڑے ہیں بعض پہاڑیوں پر اس طرح دو اور تین منزلہ مکانات بنے ہیں کہ ایک مکان کی چھت، اوپر کے دوسرے مکان کا صحن ہے۔ پورا مکہ اسی طرح پہاڑوں پر آباد ہے۔ اور یہ سب مکانات اور ہوٹل، حرم پاک سے اونچے ہیں، لیکن ان کو دیکھ کر قطعی ناگواری کا احساس پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ یہ سیدھے سادے مکانات ہیں، اور ان کی تعمیر میں کسی قسم کی شہنشاہیت، شان و شوکت اور اسراف کا احساس نہیں ہوتا۔ جب کہ حرم کے مدمقابل، جبل ابوقبیس کی بلندیوں پر بادشاہ کا محل ایک شدید ناگواری کے احساس کو جنم دیتا ہے، اس جدید محل کی آرائش و زیبائش پر، بہت کچھ خرچ کیا گیا ہے، اس محل کی تعمیر میں غیر مسلم اطالوی اور فرانسیسی انجینئروں کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس غرض کے لئے ان غیر مسلموں کو مسلم پاسپورٹ پر یہاں لایا گیا، جارج، جاوید بن گیا اور پیٹر صدیق بن گیا۔

ایک پاکستانی انجینئر نے مجھے یہ واقعہ بتایا کہ انہوں نے ایک فرانسیسی انجینئر پیٹر سے پوچھا:

'کیا تم مسلمان ہو؟'

'ہاں' اس نے جواب دیا' میں اپنے پاسپورٹ پر مسلمان ہوں'

بہرحال، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جبل ابوقبیس پر ایک مکان بنا کر بھی اس مقصد کو پورا کیا جاسکتا تھا، ایک عظیم الشان محل بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، یہ تو جاہی فقیری کی ہے، انکساری، عاجزی اور فروتنی کے اظہار کے اس مقام پر اس شان و شوکت، رعب و دبدبہ اور آن بان کا کیا کام۔ بلکہ اب تو اس محل پر ڈش اینٹینا بھی لگے ہوئے ہیں۔

بہر حال یہ وہی تاریخی پہاڑ ہے کہ جب تعمیر کعبہ ہو چکی اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیمؑ کو حکم دیا:

'اور لوگوں میں حج کے لئے منادی کرو'

تو سیدنا ابراہیمؑ جبل ابوقبیس پر چڑھ گئے، اور پکار کر لوگوں کو ندا دی کہ اپنے رب کے اس گھر کا حج کرو۔ اس پکار کے جواب میں اس دن سے آج تک لوگ دیوانہ وار لبیک اللھم لبیک (حاضر ہوں، میرے رب میں حاضر ہوں) پکارتے ہوئے اس گھر کے طواف کے لئے دیوانہ وار دوڑے چلے جاتے ہیں۔

اسی جبل ابوقبیس کے دامن میں بنو ہاشم آباد تھے، انہی میں ایک گھر جناب عبداللہ کا تھا۔ جس کی دہلیز سے سیدہ آمنہ، کاروان تجارت کی شام سے واپسی کا انتظار کیا کرتی ہوں گی، جس میں ان کے شوہر جناب عبداللہ کو بھی واپس آنا تھا۔ اسی گھر میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اب وہ مکان تو نہیں ہے نہ ہی وہ در و دیوار ہیں، تاہم اسی جگہ پر جہاں رسول پاک ﷺ کے والد جناب عبداللہ کا مکان تھا اور جو رسول اللہ ﷺ کی جائے پیدائش تھا۔ اب وزارۃ الحج والاوقاف، کا دفتر واقع ہے۔

مسجد حرام سے مشرقی سمت باب السلام سے آگے محلہ سوق اللیل (رات کا بازار) تھا اس سے متصل گلی میں حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کا گھر تھا۔ ہجرت کے بعد حضرت عقیلؓ بن ابی طالب نے جو اپنے والد کے بعد اب بنی ہاشم کے بڑے تھے اسے بیچ دیا۔ پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے یہ مکان حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی کو فروخت کر دیا، جو یمن کا گورنر بھی رہا تھا۔ اس نے اس گھر کو اپنے مکان 'بیفا' کا حصہ بنالیا۔ اور یہ 'دار یوسف' کہلاتا رہا۔

عباسی دور میں ہارون الرشید کی والدہ خیزران ۱۷۱ھ میں جب حج کرنے آئیں تو یہ مکان خرید کر اور دار یوسف سے الگ کر کے، مولد نبی کو مسجد بنا دیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے آج کل اس عمارت پر 'وزارۃ الحج والاوقاف' کا بورڈ لگا ہوا ہے اور یہاں ایک کتب خانہ اور ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ہماری گاڑیاں اس مکان کے پچھلی طرف پارک ہو گئیں۔ اس مکان سے پیچھے خاصے فاصلے پر سیاہ چٹیل اور سنگلاخ پہاڑی سر اٹھائے کھڑی تھی کم وبیش یہ وہی علاقہ رہا ہو گا جہاں بنو ہاشم آباد تھے۔ اب تو وہ کچی، ناہموار گلیاں، جدید ترین سڑکوں کے نیچے چلی گئی ہیں مگر بہر حال یہ وہی گرد و نواح ہے جس سے رسول اللہ کے بچپن اور جوانی کو نسبت رہی ہوگی۔

میں گاڑی کے اندر سے بیٹھی گرد نواح کو دیکھتی رہی، یہاں سے حرم کے اونچے مینار بلکہ مسجد الحرام کا ایک بڑا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اسی محلے میں کہیں وہ گھاٹی ہونی چاہئے جو شعب ابی طالب کہلاتی تھی۔

'پتہ کریں شعب ابی طالب کہاں ہے۔' میں نے سجاد کو پھر تنگ کیا۔ ہمارے قافلے والے اس سوال سے مشکل میں پڑ گئے تھے۔ راشد صاحب بھی اس جگہ کی نشاندہی نہیں کر سکے۔ دراصل اب بڑے پیمانے پر پہاڑیاں صاف کی جا رہی ہیں اور جدید تعمیرات سامنے آ رہی ہیں لہٰذا وہ جگہ جو کبھی گھاٹی رہی ہوگی، اب کسی تنگ سی شاہراہ کی شکل میں ہوگی جس کے دونوں طرف پہاڑوں پر مکانات بنے ہوں گے۔ یہ جبل ابوقبیس کا ایک درہ (گھاٹی) تھا۔ جس پر خاندان ہاشم کا موروثی حق تھا۔

جناب عاصم صاحب اپنے سفرنامے میں اس جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'(رسول اللہ کی جائے پیدائش) سے کچھ پہلے سڑک کی دائیں طرف چند گلیاں اور ان میں لوگوں کے مکانات اور دوکانیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ شعب ابی طالب اسی جگہ تھی اب پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے اور لوگوں نے صاف زمین پر دوکانیں اور مکانات تعمیر کر لئے ہیں۔ ان ہی گلیوں میں ایک جگہ کو حضرت علی کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے'۔

(سفرنامہ ارض القرآن۔ ص ۱۵۴)

اسلامی تاریخ کا ایک ہلا دینے والا واقعہ اسی شعب ابی طالب سے وابستہ ہے۔ وہ نبوت کا ساتواں سال تھا، قریش مکہ کے ظلم وستم کی وجہ سے نصف سے زائد مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ باقی جو مکہ میں رہ گئے تھے ان پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ قریش مکہ کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ مسلمان حبشہ میں چین کی بنسری بجائیں اور مکہ میں بھی اسلام برابر قوت حاصل کرتا رہے، کیوں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا قریش مکہ کے لئے سخت پریشانی کا باعث تھا۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ پر اپنے دباؤ کو شدید تر کرتے ہوئے قریش مکہ نے بنو ہاشم اور خاندان عبدالمطلب کے خلاف ایک معاہدہ تحریر کیا۔ جس میں یہ متفقہ طور پر طے کیا گیا کہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے نہ تو کوئی مناکحت کرے گا، نہ خرید و فروخت کرے گا، نہ کوئی ان سے بات چیت کرے گا نہ میل جول رکھے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالے نہ کر دیں۔ یہ

معاہدہ خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مکہ میں مستقل رہنے والے اور عارضی قیام کرنے والے سب افراد لازماً اس کی پابندی کریں۔

یہ ایک انتہائی صورت حال تھی جس نے مسلمانوں کو اور رسول اللہ کے اہل خانہ کو شدید ترین ذہنی کرب اور روحانی اذیت میں ڈال دیا تھا۔ میں سوچتی، یہ کس قدر ناانصافی کی بات تھی کہ چند افراد پر صرف اس لئے ظلم کیا جائے کہ وہ وحدانیت کا اقرار کیوں کرتے ہیں۔ اپنے ہی وطن کی مانوس و مہربان گلیاں اب ان پر تنگ ہو گئی تھیں، اپنے ہی ہم وطن اور ہم قوم اجنبی بن گئے تھے، صرف اجنبی ہی نہیں بدترین دشمن بن گئے تھے۔

صورت حال روز بروز بگڑتی جا رہی تھی، اس سماجی مقاطعہ کی وجہ سے بنو ہاشم کے مسلمانوں کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا، وہ کسی سے خرید و فروخت بھی نہیں کر سکتے تھے، گھروں میں چولہے ٹھنڈے ہونے شروع ہو گئے، اس بات کا خطرہ بھی برابر بڑھتا جا رہا تھا کہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ رسول اللہ ﷺ پر قاتلانہ حملہ ہو سکتا تھا۔ اس اعصاب شکن صورت حال سے نبٹنے کے لئے جناب ابو طالب، اپنے خاندان والوں اور دیگر مسلمانوں کو لے کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ پناہ گزینوں کی تعداد لگ بھگ پچاس کے قریب تھی۔

یہ سماجی مقاطعہ تین سال تک جاری رہا۔ یہ تین سال یعنی تقریباً ایک ہزار ایک سو دن اور راتیں بڑی سخت تھیں، اپنے گھروں میں آرام دہ بستروں پر سونے والے، سنگلاخ، سیاہ، چٹیل چٹانوں پر سویا کرتے، کئی کئی وقت کے فاقے گذر جاتے۔ گرمیوں کی جھلسا دینے والی دوپہروں میں آخر کون سی چیز انہیں پناہ دیتی ہو گی؟ سر کے اوپر آگ برساتا آسمان، اور ارد گرد مہیب و سیاہ چٹانیں، اور جسم کے نیچے برہنہ، سنگلاخ زمین، مکہ کی گرمی کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو گرمیوں کے موسم میں خود وہاں رہ کر آئے ہوں، چند لمحے کے لئے ننگا پاؤں زمین پر رکھیں تو پاؤں آبلوں سے ڈھک جائیں۔

ان تین سالوں میں ان محاصرین کو خوراک صرف اس صورت میں ملتی تھی کہ ان کے بعض مشرک مگر رحمدل رشتہ دار قرابتداری کا لحاظ کرتے ہوئے کھانے پینے کی چیزیں اندر بھجوا دیں بشرطیکہ قریش مکہ کی نظر نہ پڑے۔

خوراک کا بندوبست کرانے کے سلسلے میں سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔ اگر

نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی اور بچے بھوک سے بلبلانے لگتے تو سیدہ خدیجہؓ کسی آدمی کو خاموشی سے اپنے بھتیجوں کے پاس بھیج دیتیں اور وہ ازراہ قرابتداری اپنی پھوپی کے لئے کسی نہ کسی طرح خوراک بھجوا دیتے، جو پچاس محصورین پر تقسیم ہو جاتی۔

سیدہ خدیجہ کے تین بھتیجے حکیم بن حزام، ابو البختری اور زمعہ بن اسود، قریش کے روساء میں سے تھے۔ غیر مسلم ہونے کے باوجود یہ موقع ملنے پر خوراک کا بندوبست کرتے۔ ایک بار اسی طرح حکیم بن حزام نے، گیہوں کی بوری اپنے غلام پر لاد دی اور چل پڑے، ابوجہل کی نظر ان پر پڑی، اسے کچھ شک گذرا تو اس نے تعاقب شروع کر دیا جب اس نے دیکھا کہ ان دونوں کا رخ شعب ابی طالب کی طرف ہے تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ بوری کہیں اور نہیں بلکہ محصورین کو پہنچائی جائے گی لہٰذا ابوجہل نے حکیم بن حزام کو پکڑ لیا۔

"تم بنی ہاشم کے لئے کھانا لے جا رہے ہو، واللہ تم یہ سامان لے کر یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے ورنہ تمام مکہ میں تم کو رسوا کر دوں گا"۔ ابوجہل نے دھمکی دی عین اسی وقت سیدہ خدیجہ کا ایک اور بھتیجا ابو البختری (بن ہشام بن حارث بن اسد) وہاں آ نکلا۔

'کیا بات ہے۔' اس نے پوچھا

'یہ دیکھو' ابوجہل نے کہا 'یہ بنو ہاشم کے لئے خوراک لے جا رہا ہے'

"یہ تو اپنی پھوپی کے لئے خوراک لے جا رہا ہے جو محمد ﷺ کے ساتھ ہیں، انہوں نے ایک آدمی بھیج کر کھانے کا سامان منگوایا ہے، تم کیوں روکتے ہو۔ اسے جانے دو"۔

دراصل ابو البختری نے یہ دلیل دی کہ خدیجہ کا تعلق بنو ہاشم سے نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں خوراک پہنچائی جا سکتی ہے۔ مقاطعہ بنو ہاشم کا کیا گیا تھا جب کہ سیدہ خدیجہ قریش کے ایک دوسرے ممتاز خاندان اسد بن عبدالعزیٰ سے تھیں۔

ابوجہل نے اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تلخ کلامی جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی، ابو البختری نے اونٹ کی مہار سے ابوجہل کی زبردست پٹائی کر دی جس سے وہ لہولہان ہو گیا، دلچسپ بات یہ ہوئی کہ حمزہ بن عبدالمطلب، جو محصورین میں سے ایک تھے، درے کے پاس ہی کہیں موجود تھے اور یہ پورا تماشا دیکھ رہے تھے۔ بہر حال گیہوں کی وہ بوری اندر پہنچ گئی۔

اس سماجی مقاطعہ سے قبل قریش مکہ جناب ابو طالب کے پاس گئے تھے اور ان سے ان کے بھتیجے کی شکایت کی۔

"اے ابو طالب! آپ کی بزرگی اور مرتبہ کا ہمیں پورا لحاظ ہے۔ ہم نے آپ کے بھتیجے کے متعلق اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ درخواست کی کہ آپ اسے روک لیں مگر آپ اسے روک نہیں سکے۔ خدا کی قسم اب ہم زیادہ صبر نہیں کر سکتے کہ ہمارے معبودوں پر نکتہ چینیاں کی جاتی رہیں یا تو آپ محمد کو ان حرکتوں سے روک لیجئے ورنہ ہم مقابلے پر آجائیں گے۔ ہلاک ہوں گے یا ہلاک کر دیں گے" یہ دھمکی دے کر قریش مکہ واپس چلے گئے۔ ابو طالب پر اپنی قوم کی جدائی اور عداوت شاق گزری، مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ رسول اللہ کو تنہا چھوڑ دیتے سخت پریشانی کے عالم میں انہوں نے رسول اللہ کو بلا کر سارا قصہ سنایا اور کہا "بیٹا میرے اوپر اتنا ہی بوجھ ڈالو جسے میں اٹھا سکوں۔"

رسول اللہ کا دل اپنے چچا کی پریشانی پر تڑپ گیا، جس نے باپ بن کر انہیں پالا تھا اور اپنی اولاد پر انہیں ترجیح دی تھی۔ مگر زبان نے وہی کہا جو رب کا فیصلہ تھا۔ "چچا جان! اگر وہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنی دعوت و تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔"

رسول اللہ اس عالم میں اٹھ کر جانے لگے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"بیٹا بات تو سنو" ابو طالب نے پکارا۔

آپ چچا کے پاس واپس آئے۔

"جاؤ بیٹا جو تم مناسب سمجھتے ہو کرو، خدا کی قسم میں کبھی بھی تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔" اس کے بعد انہوں نے چند اشعار پڑھے۔

خدا کی قسم وہ لوگ اپنی جماعتوں کے ساتھ تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے
جب تک کہ وہ مجھے مٹی میں دفن نہ کر لیں۔
تو اپنا کام کئے جا، مجھ پر کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں ہے
خوش رہ اور اس کام سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کئے جا
تو نے مجھے دعوت دی اور تیرا خیال یہ ہے کہ تو میرا خیر خواہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے
تو نے بالکل سچ کہا، تو تو ایک امین ہے

اور تو نے جو دین پیش کیا وہ یقیناً لامحالہ دنیا کے بہترین ادیان میں سے ایک دین ہے
اگر سلامتی کا خوف اور سبکی کا اندیشہ نہ ہوتا۔
تو یقیناً تو مجھے اس دین کو قبول کر لینے میں فراخ حوصلہ پاتا۔

کفار مکہ میں ایک اور شریف انسان ہشام بن عمرو تھا جو عامر بن لوئی کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ عمرو بن ربیعہ، نضلہ بن ہاشم کا اخیافی بھائی تھا۔ رسول اللہ کے دادا، جناب عبدالمطلب، نضلہ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ہشام کو اس قرابت کا ایسا پاس تھا کہ کبھی کبھی راتوں کو قریش کی نظروں سے بچ کر اونٹ پر کھانے پینے کا سامان لاد کر لاتا اور درے کے قریب پہنچ کر اونٹ کو اندر کی طرف ہنکا دیتا۔ اونٹ اندر پہنچ جاتا تو اندر پچاس مصیبت زدہ محاصرین یہ سامان اتار لیتے اور اونٹ کو واپس ادھر ہنکا دیتے۔ ہشام خاموشی سے اپنے اونٹ کی مہار پکڑ کر رات کی تاریکی میں گھر واپس چلا جاتا۔

یہی ہشام بن عمرو تھا جس نے اس معاہدہ کو ختم کرانے کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ ایک دن وہ زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس گیا۔ زہیر، عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا تھا اس اعتبار سے رسول اللہ کا پھوپھی زاد بھائی تھا، تاہم ساتھ ہی یہ ابوجہل کا چچازاد بھائی بھی ہوتا تھا۔

"زہیر تمہیں یہ بات گوارا ہے کہ تم مزے سے کھاؤ پیو، شادیاں کرو اور تمہارے ننھیالی رشتہ داروں کی یہ گت ہو کہ ان سے نہ کوئی شخص تجارت کر سکتا ہے اور نہ مناکحت، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کے ننھیالی رشتہ داروں کے خلاف تم لوگ ایسا معاہدہ کرتے تو وہ ہرگز ہرگز تمہارا ساتھ نہ دیتا۔"

"تم درست کہتے ہو ہشام" زہیر نے جواب دیا "مگر میں تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ اگر کوئی اور بھی میرے ساتھ ہوتا تو میں اس معاہدے کو ختم کرا کے چھوڑتا۔"

"دوسرا آدمی میں ہوں" ہشام نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"میں اور تم کافی نہیں ہیں، تیسرے کا بھی بندوبست کرو۔"

چنانچہ ہشام، مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف کے پاس گیا اور اس سے کہا۔

"مطعم کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ بنی عبد مناف کے دو خاندان تباہ ہو جائیں اور تم تماشہ دیکھتے رہو بلکہ ان کی تباہی میں قریش کے ہمنوا بنے رہو؟ واللہ اگر تم نے ان کو اس کا موقع دے ہی دیا تو پھر تمہاری بھی

باری دور نہیں۔"

"مگر میں تنہا کیا کر سکتا ہوں؟" مطعم نے جواب دیا۔

"تم تنہا نہیں ہو' میں بھی ہوں اور زہیر بن ابی امیہ بھی تمہارے ساتھ ہوگا"

"یہ کافی نہیں ہے' کوئی چوتھا بھی ہونا چاہئے۔"

چنانچہ ہشام ابوالبختری کے پاس گیا جو سیدہ خدیجہ کا بھتیجا تھا اور اسے بھی اسی طرح قائل کر لیا لیکن اس نے بھی یہی کہا کہ ہم چار کافی نہیں ہیں' پانچویں کا بندوبست بھی کرو۔

پھر ہشام زمعہ بن اسود بن المطلب بن اسد کے پاس گیا یہ بھی سیدہ خدیجہ کے بھتیجے تھے اور ان سے بھی وہی گفتگو کی اور انہیں قائل کرنے کے لئے کہا کہ محاصرین میں سے کتنے ہی تمہارے قریبی عزیز ہیں یہ ان کا حق ہے کہ تم ان کی حمایت کرو۔

کیا اس کام میں کوئی میری مدد کرے گا؟ زمعہ نے سوال کیا۔

ہاں، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، ابوالبختری اور میں تمہارے ساتھ ہیں۔

اب معاملہ طے پا گیا، یہ پانچوں زعمائے قریش میں سے تھے اور اکٹھے ان پانچوں سے نمٹنا ابوجہل کے بس کی بات نہیں تھی جو اس معاہدہ کو تحریر کرانے کی تحریک کا روح رواں تھا۔ ان پانچوں کی خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں ایک مقررہ وقت پر خانہ کعبہ میں موجود ہونا اور زہیر کا گفتگو شروع کرنا طے پا گیا۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ایک ایک کر کے پانچوں حرم میں آ گئے' زہیر بن امیہ ایک خوبصورت حلہ زیب تن کئے کعبہ میں آیا اور طواف شروع کر دیا' ساتواں چکر ختم کرنے کے بعد وہ اس طرف گیا جہاں بہت سے اہل مکہ بیٹھے تھے ان میں ابوجہل بھی تھا۔ زہیر نے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہیں مخاطب کر کے کہا اے اہل مکہ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم تو مزے سے کھائیں اور شرابیں پئیں' پہنیں' اوڑھیں اور بنو ہاشم کو یوں تباہ کر دیں؟ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس ظالم اور سفاک معاہدے کو چاک نہ کر دیا جائے گا۔"

ابوجہل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تو جھوٹ بولتا ہے بخدا یہ معاہدہ چاک نہیں کیا جائے گا"

"یہ نہیں بلکہ تم جھوٹے ہو۔" زمعہ بن اسود نے کھڑے ہو کر کہا۔ "جب یہ تحریر لکھی گئی تھی ہم نے اس وقت بھی اس کو پسند نہیں کیا تھا۔" اس سے قبل کہ ابوجہل اسے جواب دیتا۔ ابوالبختری کھڑا ہو گیا۔

"بے شک زمعہ ٹھیک کہتا ہے اس معاہدے کی شرائط کو ہم پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اسے تسلیم کرتے ہیں۔"

اچانک ہی مطعم بن عدی اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔

"یہ سچ کہتے ہیں جو ان کے خلاف ہے وہ جھوٹا ہے' اس معاہدے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہم اس کی بجا آوری سے بری الذمہ ہیں"

ابوجہل اس تابڑ توڑ حملے سے انگشت بدنداں تھا' ہشام بن عمرو بھی کھڑا ہوا اور بولا ہم اس معاہدے کی تنسیخ کا اعلان کرتے ہیں۔

ابوجہل نے اپنا سر پیٹ لیا' وہ ایک ہوشیار دشمن تھا' سمجھ گیا کہ یہ جتھ بندی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہے۔ اچانک نہیں ہے' یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ لہٰذا اس نے حاضرین کی رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے کہنا شروع کیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پہلے سے یہ بات طے کر کے آئے ہیں' یہ بات ایک دم سے نہیں اٹھائی جا سکتی تھی' یہ ان لوگوں کا طے شدہ اقدام ہے۔"

لیکن مطعم بن عدی نے ابوجہل کو تقریر نہ کرنے دی اور کعبہ کی اس اندرونی دیوار کی طرف بڑھا جہاں معاہدہ لٹک رہا تھا تاکہ معاہدہ پھاڑ دے' مگر قریب جا کر دیکھنے پر پتہ چلا کہ معاہدہ دیمک چاٹ چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوطالب اس وقت خانہ کعبہ کے صحن میں ایک کونے میں بیٹھے تھے اور چپ چاپ یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔

یہاں سے یہ پانچوں ہتھیار لے کر درے کے منہ پر پہنچے اور محاصرین کو بحفاظت درے سے نکال لائے۔ یوں تین سالہ اذیت ناک شب و روز کا خاتمہ ہوا۔

مگر ان تین برسوں نے دو بزرگوں خدیجۃ الکبریٰ اور ابوطالب کی جسمانی صحت کو ہلا کر رکھ دیا تھا لہٰذا چند ماہ سخت بیمار رہنے کے بعد ابوطالب وفات پا گئے۔ رسول اللہ اسی جنت المعلیٰ میں انہیں دفنا کر آئے اور تیسرے دن خدیجہ کی بھی وفات ہو گئی۔ رسول اللہ نے انہیں بھی حجون میں عبدالمطلب کی قبر سے ذرا فاصلے پر دفن کیا۔ خود قبر میں اترے اور اپنی رفیقہ حیات کو سپرد خاک کیا۔ یہ دونوں صدمے رسول اللہ پر اس قدر سخت تھے کہ وہ اس سال کو عام الحزن کہا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

عرفات

جنت المعلیٰ، مسجد جن، مسجد الرایہ سے ہوتے ہوئے ہم منیٰ پہنچے، گو کہ منیٰ کی زیارت عید سے دو دن قبل ہم کر چکے تھے لہٰذا گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے پورے منیٰ کا چکر لگایا، مسجد خیف پہنچے، پہلی دفعہ ہمارے پاس کیمرہ نہیں تھا اس لئے اس دفعہ مسجد خیف کی تصویریں لینے کا موقع مل گیا، پھر مزدلفہ سے ہوتے ہوئے عرفات پہنچ گئے۔

یہ وسیع و عریض میدان مکہ مکرمہ سے ۲۱ کلومیٹر (تقریباً ۱۳ میل) مشرق کی جانب طائف کی راہ پر ہے۔ یہ حدود حرم سے باہر ہے اور تقریباً چار میل چوڑا اور آٹھ میل لمبا ہے۔ اسی میدان عرفات میں ہماری تینوں گاڑیاں جبل الرحمت کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ جبل عرفات سے گھرا ہوا یہ وسیع میدان اس وقت بالکل خالی تھا، ہماری طرح زائرین کی اکا دکا گاڑیاں دوڑتی نظر آ جاتیں یا راستہ میں جہاں ذرا سا سایہ ہوتا زائرین کی کوئی ٹولی آرام کرتی، یا کھاتی پیتی نظر آ جاتی۔

اسی میدان میں منیٰ کے راستے کی طرف مسجد نمرہ واقع ہے جسے مسجد ابراہیمؑ یا مسجد عرفہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد سیدنا ابراہیمؑ نے رکھی تھی۔ مستطیل شکل کی چار میناروں والی یہ انتہائی وسیع و عریض مسجد نمرہ، جو ذی الحج کی نویں تاریخ کو ہزاروں افراد کو اپنے اندر سمو لیتی ہے، اس وقت جب کہ ہم اس میں داخل ہوئے بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سچ پوچھیے تو اندر جا کر میرے اوپر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ انتہائی وسیع و عریض مسجد، بالکل خالی، فرش مسجد پر، در و دیوار پر گرد کی تہیں، اندر نیم اندھیرا۔ یہ مسجد عجیب ہے جو سال کے ایک دن، پوری قوت سے آباد ہوتی ہے، پھر اتنی ہی تیزی سے ویران ہو جاتی ہے۔

مسجد نمرہ کی زیارت کے بعد ہم جبل الرحمت کی طرف روانہ ہو گئے عرفات کے شمال مشرق میں سیاہی مائل، سرخ رنگ کی ایک مخروطی پہاڑی ہے۔ جس کی بلندی دو سو فٹ سے کچھ کم ہے۔ یہ پہاڑی عرفات کے پہاڑی سلسلے سے ذرا الگ تھلگ ہے اس پہاڑی کو عرفہ بھی کہتے ہیں لیکن اس کا زیادہ معروف

نام جبل الرحمت ہے۔ یہی وہ پہاڑ ہے۔ جس پر رسول اللہ نے آخری حج کے موقع پر خطاب فرمایا تھا۔ خطبہ حجتہ الوداع انسانیت کا منشور ہے، آج ہمیں ان تعلیمات کو دہرانے کی سخت ضرورت ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا!

"نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر
نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر
ہاں بزرگی اور فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے
ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے
اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں
اپنے غلاموں کا خیال رکھو
ہاں غلاموں کا خیال رکھو، جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ
اور جو خود پہنو وہی انہیں پہناؤ
عورتوں سے اچھا سلوک کرو، کیونکہ وہ تمہاری پابند ہیں اور اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں
میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اس پر قائم رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے اور یہ اللہ کی کتاب ہے
اور ہاں دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انہی باتوں کے سبب ہلاک کر دیئے گئے تھے"۔

جب خطبہ دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ نماز پڑھانے کے لئے وہاں تشریف لے گئے جہاں آج مسجد نمرہ بنی ہوئی ہے تو قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی جس نے دین اسلام کی تکمیل کا اعلان کر دیا۔

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے
اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے
اور اسلام کو تمہارے لئے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔
(المائدہ۔۳)

رسول اللہ نے حجتہ الوداع کے موقع پر جبل رحمت کے قریب ہی وقوف کیا تھا اور رو رو کے

مغرب کے وقت تک اپنی امت کے لئے دعائیں کی تھیں۔

میدان عرفات میں انتہائی شاندار، وسیع و عریض، مضبوط سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ سڑکوں کی شناخت نام کے بجائے نمبر سے ہوتی ہے۔ محمد عاصم صاحب کے سفرنامہ ارض القرآن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۶ء تک عرفات میں صرف دو سڑکیں تھیں ۱۹۵۹ء تک یہاں پانچ سڑکیں تھیں۔ اب تو نقشہ ہی اور تھا۔ سڑکوں کا جال تھا جو بچھا ہوا تھا۔

ہماری گاڑیاں جبل الرحمت کے نزدیک پارک ہوگئیں۔ جبل الرحمت پر زائرین کا اچھا خاصا رش تھا۔ میری شدید خواہش جبل الرحمت پر چڑھنے کی تھی لیکن وقت کی تنگی تھی، چونکہ عید کا دن تھا لہذا راشد صاحب وغیرہ کو کہیں جانا تھا وہ مغرب کے وقت تک واپس گھر پہنچنا چاہتے تھے

''فکر نہ کرو میں راستے دیکھ لوں تو کل تمہیں پھر یہاں لے آؤں گا'' سجاد نے مجھے تسلی دی۔

لہذا ہم واپس ہولیئے۔ ڈھائی ماہ بعد جب ہم حج کرنے آئے تب تو نہ ہم مسجد نمرہ دیکھ سکے اور نہ ہی جبل رحمت، ہاں اسی سال دسمبر میں جب ہم تیسری بار حرم شریف آئے تو جبل رحمت کی زیارت نصیب ہوگئی۔ لہذا وہ ''کل'' جس کا سجاد نے وعدہ کیا تھا، آٹھ ماہ بعد آگئی۔ یکم دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہم پھر میدان عرفات میں جبل الرحمت کے دامن میں تھے۔ اس دفعہ بھی ہمارے ساتھ سجاد بھائی اور ان کے تینوں بچے رابعہ، عمر اور علی تھے۔ جبل رحمت پر چڑھنا بہت آسان تھا کیونکہ یہاں خاصی چوڑی پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو چوٹی تک چلی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بارے میں تاریخ کی اطلاع یہ ہے کہ یہ اتابک زنگی کے وزیر جمال الدین الجارید نے تعمیر کرائی تھیں۔ ساٹھویں سیڑھی پر ایک چبوترہ ہے جس پر ایک منبر گڑا ہے۔ اس منبر پر کھڑے ہو کر خطیب یوم عرفہ کو بعد دوپہر خطبہ پڑھتا ہے۔

ہم سب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جارہے تھے۔ اچھے خاصے زائرین بھی تھے۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب پہاڑی پر مدور اور تراشیدہ چٹانوں کے قوی ہیکل ٹکڑے ایک دوسرے کے اوپر عجیب انداز میں ٹکے ہوئے تھے۔ بچے بھی ہمارے آگے پیچھے چڑھ رہے تھے ثنا اور رابعہ کے درمیان گرما گرم علمی بحث' یہ چل رہی تھی کہ حضرت آدم جنت سے کیوں نکالے گئے۔

'انہوں نے گیہوں کھایا تھا' ثناء کا موقف تھا

'انہوں نے جس درخت کا پھل کھایا تھا، اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس چیز کا

درخت تھا' رابعہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی

'میری امی نے مجھے ایک کتاب لا کر دی تھی' سیرت محمدؐ' اس میں میں نے پڑھا تھا کہ حضرت آدم نے گیہوں کھایا تھا' ثناء نے کتاب کے حوالے سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی تو رابعہ اپنی ٹیچر کا حوالہ لے آئی۔

'میری مس کہتی ہیں کہ جس درخت کا پھل حضرت آدم نے کھایا تھا اس کا نام نہیں معلوم''

''چلو امی سے پوچھتے ہیں'' وہ دونوں سیڑھیاں پھلانگتی میرے برابر آگئیں اور اپنا انتہائی دقیق مسئلہ پیش کیا۔

''بات یہ ہے بیٹے کہ اس بارے میں دو مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت آدم نے گیہوں کھایا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک نامعلوم درخت کا پھل کھایا تھا۔ لہذا ثناء کی کتاب بھی ٹھیک کہتی ہے اور رابعہ کی مس بھی

اس کے بعد وہ دونوں کسی دوسری ''علمی بحث'' میں پڑ گئیں

ہم جبل رحمت کی چوٹی پر پہنچے تو دو منزلہ چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک یادگار کھڑی تھی۔ چبوترے پر نمازیوں کی جماعت کھڑی ہوئی تھی، مغرب کی نماز ادا کی جارہی تھی۔ سجاد بھائی فوراً جماعت میں شریک ہوگئے۔ میں نے چبوترے کے دوسری طرف ایک کونے میں ہو کر نماز ادا کی اور پھر وہیں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں کم از کم دو سو فٹ بلندی پر تھی اور میرے چاروں طرف عرفات کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہی میدان تھا جہاں چند ماہ قبل حج کے زمانے میں کسی جگہ ہمارا خیمہ لگا رہا ہوگا تاہم وہ جگہ یقیناً جبل الرحمت اور مسجد نمرہ سے اتنی دور تھی کہ وہاں خطبے کی آواز نہیں آرہی تھی

یوم عرفہ والے دن تو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میدان عرفات میں سبزہ بھی ہوگا لیکن اس وقت بلندی سے نظارہ کرنے کی صورت میں مجھے قطار سے لگے ہوئے درختوں کی وجہ سے عرفات میں سبزے کی موجودگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں سنتے ہیں کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی پودے تحفتہً بھجوائے تھے جو عرفات میں لگائے گئے ہیں

میں اس وقت ایک انتہائی تاریخی مقام پر بیٹھی تھی۔ یہ دو اولین انسانوں (اماں حوا اور بابا آدم) کے ملنے کی جگہ تھی۔ جنت سے نکلنے کے بعد دونوں کی پہلی ملاقات اس زمین پر یہیں ہوئی تھی۔ یہاں سیدنا ابراہیمؑ بھی ٹھہرے تھے۔ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کو یوم عرفہ کے مناسک سکھائے

تھے لہذا یہاں حضرت ابراہیمؑ نے وقوف کیا ہوگا۔ بلکہ ایک مسجد کی بنیاد بھی ڈالی تھی، جو آج جدید شکل میں مسجد نمرہ کی صورت میں موجود ہے۔ پھر یہیں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جبل رحمت کے پاس ہی وقوف فرمایا تھا، اور اس چوٹی سے اپنا تاریخی خطبہ دیا تھا

چند ماہ قبل یوم عرفہ کے دن ہم بھی یہیں کسی جگہ خیمہ زن تھے اس دن قیامت کی گرمی تھی۔ جون کا تپتا ہوا سنگین مہینہ تھا۔ ہمارے معلم نے فجر کی نماز پڑھتے ہی ویگنوں میں بیٹھ جانے کی تاکید کی تھی، لہذا ہم فجر کی نماز پڑھ کر بچوں کو لے کر ویگن میں جا بیٹھے، عام دنوں میں منی سے عرفات جائیں تو شائد دس منٹ میں پہنچ جائیں، لیکن وہ لاکھوں کا رش تھا، گاڑیاں نہ بھاگ سکتی تھیں نہ چل سکتی تھی صرف رینگ رہی تھیں اور یا کافی کافی دیر کے لئے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ یہ دس منٹ کا فاصلہ ہم نے اس دن دو گھنٹے میں طے کیا تھا

یہاں آ کر ہم نے دیکھا کہ منی کی طرح الگ الگ خیمے نہیں لگے تھے بلکہ کئی کئی سو میٹر طویل کپڑے کے شیڈ پڑے ہوئے تھے، جس میں بیک وقت کئی سو افراد وقوف کر سکتے تھے۔ اس طویل پیلے خیمے میں ایک جگہ ہم نے بھی اپنا سامان ڈال دیا۔ گرمی نے ہوش گم کئے ہوئے تھے۔ نو، دس بجے دن میں ایسی وحشت ناک گرمی تھی تو بارہ ایک بجے تک کیا ہوگا۔ ہمارے نیچے پیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی اور سر پر پیلی کپڑے کی چھت تھی۔ ہم تھے اور یوم عرفہ کی ریکارڈ گرمی تھی۔ اس دن ناشتے کے نام پر لسی پی لی تھی۔ مجھے بچوں کی فکر تھی مگر خدا کا شکر تھا کہ بچوں نے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔ سعدیہ اس موقع پر بہت تعاون کر رہی تھی۔ جب بھی میں عبادت یا توبہ استغفار میں مصروف ہوتی وہ جھٹ پنکھا لے کر آ جاتی اور میری پشت کی طرف سے مسلسل مجھے پنکھا جھلتی رہتی چونکہ سر پر میں نے گیلا کپڑا رکھا ہوا تھا لہذا سعدیہ کے پنکھے کی ہوا مجھے جنت کی ہوا معلوم ہوتی

وہ سارا دن ذکر و فکر، عبادت اور استغفار کا تھا۔ گھڑی دیکھ کر ہم نے اندازہ کیا کہ خطبہ ہو رہا ہوگا۔ اب اذان ہوئی ہوگی۔ اب جماعت کھڑی ہوگئی ہوگی۔ یہاں ہم سے ایک غلطی ہوئی کہ اگر چھوٹا ریڈیو پاس ہوتا تو خطبہ باآسانی سن لیتے۔ البتہ خیمے میں چند اصحاب کے پاس ریڈیو تھا، چنانچہ سجاد کبھی کبھی ان سے جا کر پوچھ لیتے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔

ہمارے ساتھیوں میں سے دو حضرات مسجد نمرہ گئے تھے نماز پڑھنے لیکن ہم نے خیمے میں ہی

نماز ادا کی کیونکہ ایک ہی شکل کے لاتعداد خیمے ہونے کی وجہ سے راستہ بھٹک جانے کے قوی امکانات تھے۔ دوسرے بچے ساتھ تھے۔ انہیں تنہا خیمے میں چھوڑ کر نماز کے لئے چلا جانا مناسب نہیں تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد پھر لوگ توبہ استغفار اور دعاؤں میں مصروف ہوگئے۔ ہر ایک اپنی دنیا میں مگن تھا کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ دوسرا کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔

مجھے یاد ہے دوپہر میں میں تھوڑی دیر ستانے کے لئے لیٹ گئی تھی اسی میں آنکھ لگ گئی پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہر طرف آگ لگی ہو بوکھلا کر اٹھ بیٹھی

''کیا حال ہے''۔ سجاد جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے مسکرائے

''خدا کا شکر ہے''۔ زبان نے تو وہی کہا جو کہنا چاہیئے تھا مگر جسم تمازت سے پھنک رہا تھا۔ میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ اس دن کھڑے رہنے میں ہی سب سے زیادہ عافیت تھی کیونکہ کھڑے رہنے کی صورت میں صرف پاؤں گرمی وصول کر رہے ہوتے تھے اور لیٹنے والے کا حال سب سے زیادہ خراب ہوتا تھا کیونکہ لیٹنے کی صورت میں پورا جسم جھلستی ہوئی زمین سے گرمی وصول کر رہا ہوتا تھا۔ بیٹھنے کی حالت دونوں کی درمیانی حالت تھی

اس قیامت خیز گرمی میں بار بار نظر خیمے کی پیلی چھت کی طرف اٹھ رہی تھی کہ سورج کب ڈھلنا شروع ہوگا۔ کب شام اترے گی۔ اور کب دن کی حدت ختم ہوگی۔ حالانکہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ جب قیامت برپا ہوگی اسی میدان عرفات کو میدان حشر بنایا جائے گا تب سورج سوا نیزے پر ہوگا۔

سورج سوا نیزے پر!!

بے چینی اور گھبراہٹ سے میرا دل الٹنے لگا۔

ایک بار کافی دیر تک توبہ استغفار میں مصروف رہنے کے بعد جب بچوں کی طرف متوجہ ہوئی تو تینوں بچے غائب تھے۔ یقیناً خیمے سے باہر کھیل رہے ہوں گے میں خیمے سے باہر نکلی تو سماں ہی دوسرا تھا۔ بہت سے مرد حضرات اور بہت سی خواتین دھوپ میں کھڑی دعاؤں میں مصرف تھیں۔ لوگ رو رہے تھے گڑ گڑا رہے تھے۔ حال سے بے حال، دھوپ اور گرمی نے حلیہ بگاڑ رکھا تھا، کھانے پینے کی فکر نہ آرام کا ہوش، بلکہ ارد گرد کا بھی ہوش نہیں۔

خدا فرشتوں کے سامنے اسی بات پر تو فخر کرتا ہے۔ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ جب حجاج

عرفات میں ٹھہر کر دعا اور گریہ وزاری میں مشغول ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا تک آ جاتے ہیں اور فرشتوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، ”دیکھو میرے ان بندوں کو بال بکھیرے ہوئے غبار سے اٹے ہوئے۔ دیکھو یہ میرے پاس اس حالت میں آتے ہیں“۔

اسی طرح سیدہ عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ”کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زیادہ اپنے بندوں کے لئے جہنم سے آزادی اور رہائی کا فیصلہ کرتا ہو، اس دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمت و رافت کے ساتھ اپنے بندوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور ان پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہتا ہے' دیکھتے ہو میرے یہ بندے کس مقصد سے یہاں آئے ہیں'۔ (مسلم)

رسول اللہؐ نے ایک اور موقع پر کہا تھا کہ بدر کے دن کے علاوہ شیطان کسی دن بھی اتنا ذلیل و خوار، غضب ناک، روسیاہ، دھتکارا اور پھٹکارا ہوا نہیں دیکھا گیا جتنا عرفہ کے دن کیونکہ وہ اس دن اللہ کی رحمت کو موسلا دھار برستے ہوئے بڑے بڑے گناہوں کی معافی کا فیصلہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ (موطاء امام مالک)

میں بچوں کو گھیر گھار کر پھر خیمے میں لے آئی، میں چاہتی تھی کہ وہ اس غضب ناک گرمی اور دھوپ سے بچیں، کیونکہ کئی افراد لو لگ جانے کی وجہ سے ہسپتال لے جائے جا رہے تھے۔ اس دن سن اسٹروک کے حادثات بھی بہت ہوتے ہیں بچوں کو خیمے میں بھیج کر میں سجاد کی تلاش میں نکلی، تھوڑی ہی دور پر ایک سائبان کے نیچے، چند دیگر زائرین کے ساتھ گریہ وزاری اور دعاؤں میں مصروف دیکھ کر واپس آ گئی۔

ہمارا خیمہ بہت طویل تھا۔ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زائرین کے مختلف گروپ مقیم تھے، میں نے دیکھا ثناء اور سعدیہ ہم سے قریب ہی مقیم ایک پچاس پچپن برس کے صاحب سے گفت و شنید میں مصروف تھیں۔

”آپ کو پتہ ہے انکل، یہ میدان عرفات ہی میدان حشر ہے“۔ ثناء نے انہیں معلومات پہنچائیں۔

”اچھا“ انہوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا

”اور کیا آپ نے قبر کے ٹیسٹ کی تیاری کر لی ہے؟“ دس سالہ ثناء نے ان کا امتحان لیا

”قبر کا ٹیسٹ؟“

”جی ہاں۔ بس تین سوال پوچھے جائیں گے“ ثناء نے گویا انہیں تسلی دی کہ قبر کا ٹیسٹ Oral ہوگا، Written نہیں ہوگا۔

”وہ کون کون سے؟“

”پہلا سوال ہوگا، تمہارا رب کون ہے؟ دوسرا سوال ہوگا، تمہارا دین کیا ہے؟ تیسرا سوال ہوگا، تمہارا نبی کون ہے؟ جس کو ان سوالات کے جوابات نہیں آئیں گے اس کی شامت آ جائے گی، میں نے تو یہ تینوں سوالات یاد کر لئے ہیں آپ کو یاد ہیں؟“

”جی ہاں بیٹے مجھے یاد ہیں“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ”یہ سوالات آپ کو کس نے یاد کرائے؟“

”امی نے، میری امی کہتی ہیں اسکول کے امتحان کے ساتھ ساتھ قبر کے ٹیسٹ کی بھی تیاری کرنی چاہئے“۔

”ماشاء اللہ آپ تو بہت اچھی بچی ہیں“ انہوں نے ثناء کے سر پر ہاتھ پھیرا تو سعدیہ سے برداشت نہ ہو سکا

”انکل مجھے بھی سوالات یاد ہیں“

”شاباش“ انہوں نے سعدیہ کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا دونوں بچیاں قدرے مطمئن ہو کر خیمے میں موجود دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گئیں۔ اور وہ صاحب نماز کے لئے اٹھ گئے۔

اس دن معلم کی طرف سے دوپہر کا کھانا ہمیں شام پانچ بجے ملا جب پوچھئے تو کھانے کی حاجت بھی نہیں تھی، گرمی کو مارنے کے لئے لوگ زیادہ تر پتلی نمکین لسی پی رہے تھے۔ معلم نے جو کھانا منگوایا تھا، وہ ٹریفک جام میں پھنس کر اب شام میں پہنچا تھا۔ بڑی سی تھال میں کھبہ، چاول اور چکن کی بوٹیاں!

سجاد کے دوست راجہ بھائی جو ہمارے گروپ میں تھے، دوپہر کا کھانا لینے گئے تو بتایا کہ وہاں دنگا فساد اور ہاتھا پائی ہو رہی ہے، لوگ معلم کو گالیاں دیتے ہوئے کھانے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ استغفر اللہ میں نے سوچا ذرا سے حوصلے اور صبر سے کام لیا جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ پھر حج تو نام ہی صبر کا ہے۔

یوم عرفہ والے دن مغرب کی نماز پڑھ کر ہم مزدلفہ کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ واپسی کے سفر میں وہی قیامت خیز ٹریفک جام تھا۔ مجھے واپسی کے سفر کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ ہوا یوں کہ ہماری ویگن میدان عرفات سے نکل کر مرکزی شاہراہ پر آئی ہی تھی کہ ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ ساری ہی گاڑیاں پھنس

گئی تھیں لہذا مسافر اور ڈرائیور حضرات گاڑی سے اتر کر سڑک پر کھڑے ہو گئے تھے کہ ویگن کے اندر گرمی زیادہ لگتی تھی۔ ہماری ویگن کے آگے بائیں طرف ہٹ کر وہ بوڑھا زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ شکل سے پاکستانی لگ رہا تھا، ستر کے پیٹے میں رہا ہوگا، شکل پر انتہائی وحشت برس رہی تھی۔ ایک گاڑی اس کے سر پر ہارن بجا رہی تھی۔ تاکہ وہ بوڑھا سامنے سے ہٹ جائے، ہارن مسلسل بجتا رہا، اور بوڑھا اسی طرح بیٹھا رہا ڈھلتے ہوئے یوم عرفہ کا شور گاڑیوں کی ٹیں پاں، انجنوں کی جھک جھک اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک لکڑی کے سہارے بیچ سڑک پر بیٹھا تھا گاڑی ہارن بجا بجا کر پاگل ہو گئی تھی۔

میں بس کے اندر سے یہ پریشان کن صورتحال دیکھ رہی تھی۔ بوڑھے کی ضعیفی اور وحشت دیکھتے ہوئے مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے اردگرد دیکھا مجھے اپنے گروپ کے راجہ بھائی نظر آئے میں نے ان کی توجہ اس بوڑھے کی طرف کرائی۔

”پتہ تو کریں یہ کون ہے اور کیوں بیچ سڑک پر بیٹھا ہے“۔

راجہ بھائی نے سڑک پر جا کر اس بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور ایک طرف لے جا کر اس سے معلومات حاصل کرنے لگے، پھر وہ دونوں آگے کی طرف چل پڑے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بوڑھے کے ہٹنے سے گاڑی کو چند فٹ کا فاصلہ ملا تو کھسک کر آگے بڑھ گئی، ٹریفک اس طرح جام تھا کہ کہیں کوئی جنبش نہیں تھی گرمی کم تھی مگر ہوا بند تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجہ بھائی واپس آئے تو میں نے ویگن کی کھڑکی سے سر نکال کر بوڑھے کے بارے میں پوچھا۔

”مر جائے گا“ انہوں نے مایوسی سے کہا ”پاکستانی پٹھان ہے، اس کا ساتھی کہیں کھو گیا ہے، اب اسے نہ تو اپنے معلم کا نام معلوم ہے اور نہ ہی اپنی بس کا کچھ پتہ ہے، میں اسے ایک بس پر چڑھا آیا ہوں وہ لوگ بھی اسے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں ہیں، یہ بالکل اپنے حواس کھو بیٹھا ہے، اسے کچھ سنائی بھی نہیں دے رہا اگر مدد نہ ملی تو مر جائے گا“۔

میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں دل ہی دل میں اس کے لئے دعائیں کرنے لگی، مجھے وہ بوڑھا آج بھی نہیں بھولا ہے، پتہ نہیں وہ اپنے گاؤں واپس پہنچ سکا یا نہیں۔

اس طرح کے کھوئے جانے والے واقعات بہت دل ہلا دینے والے ہوتے ہیں، جدہ کے

ایک مشہور شاعر نعیم بازید پوری صاحب نے ایک موقع پر جب کہ وہ میرے گھر ریاض میں آئے ہوئے تھے۔ مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ پچھلے سال حج کے موقع پر ان کے ایک عزیز بھارت سے حج کرنے آئے ان کی بیوی ان کے ہمراہ تھیں، رمی جمرات کے موقع پر ان کی بیوی ان سے بچھڑ گئیں، اب آٹھ ماہ ہونے کو آئے ہیں ان کی کوئی اطلاع نہیں۔

رمی جمرات کے دوران ایک ایسا ہی دلدوز منظر میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک ستر بہتر برس کا منحنی سا بوڑھا تھا، جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا، فجر کے بعد کا وقت تھا، میں اور سجاد رمی سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے جب میں نے اس گھبرائے ہوئے حواس باختہ بوڑھے کو دیکھا جس کے پاس چونکہ اپنی شناخت کے لئے کچھ نہیں تھا لہٰذا اس نے زمین پر پڑا ہوا ایک خوش رنگ گتہ اٹھایا ہوا تھا اور اسے ہلا ہلا کر فضا میں لہرا رہا تھا۔ شائد اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اس کی طرف دیکھ لے۔ کاش ہم اس بوڑھے کی کوئی مدد کر سکتے۔ جو بوکھلاہٹ میں ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔

میں جبل رحمت کی چوٹی پر بیٹھی، گذرے ہوئے یوم عرفہ کو یاد کر رہی تھی وہ جون کا ایک جھلسا دینے والا دن تھا، اور ابھی اوائل دسمبر کی خوشگوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

سجاد بھائی کی آج نائٹ ڈیوٹی تھی لہٰذا جلدی گھر واپس جانے کے ارادہ سے ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبل الرحمۃ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے، دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے کئی پتھروں پر بہت سے نام لکھے ہوئے نظر آئے انگریزی میں، عربی میں، اردو میں، اشرف چوہدری، زمان خان، وغیرہ وغیرہ، شہر کے نام اور پیغامات۔

”دیکھیں جی“ سجاد بھائی کہہ رہے تھے ”اس کام کے لئے کتنی محنت کی ہے بے چاروں نے اپنی جیب میں سفید پینٹ اور برش لے کر آئے ہوں گے، پھر اصل راستے سے اتنا آگے بڑھ کر ان پتھروں پر انہوں نے اپنے نام پینٹ کئے ہوں گے“۔

”تاکہ اپنے پنڈ سے آنے والوں کو بتا سکیں کہ ہم ماؤنٹ رحمت فتح کر آئے ہیں“ سجاد نے لقمہ دیا

”اوتھے پچاسویں سیڑھی پر جے تہ ویکھنا، لکھا ہوئے گا محمد اشرف چوہدری.......“ سجاد بھائی نے مخصوص پنجابی لہجے میں کہا جس پر ہم سب ہنس پڑے۔

☆☆☆☆☆

وادی محسر

میدان عرفات سے ہمیں وادی محسر جانا تھا۔ جہاں اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت ہم تین گاڑیوں میں تھے سب سے آگے راشد صاحب کی گاڑی تھی جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ تھے دوسری گاڑی میں سجاد کبیر اوران کی فیملی اور تیسری گاڑی میں سجاد ظہیر اوران کی فیملی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہم جوالگ الگ گاڑیوں میں تھے ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم وادی محسر سے گذر رہے ہیں کیوں کہ وہاں رکا نہیں جاسکتا نہ ہی وہاں کوئی بورڈ لگا ہے۔ وادی محسر کا پتہ راشد صاحب ہی کو تھا اور وہی اس وقت ہمارے میر کارواں تھے بالآخر طے پایا کہ ہم راشد صاحب پر نظر رکھیں، جونہی ہم وادی محسر سے گذریں گے وہ گاڑی سے ہاتھ نکال کر اشارہ کریں گے۔ اس وقت گاڑیوں کی رفتار بھی بڑھانی ہوگی کہ یہی سنت ہے۔

حج الوداع کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو وادی محسر میں آپ نے رفتار تیز کردی۔ یہ معذب وادی تھی۔ ایسے مقامات سے رسول اللہ ﷺ تیزی سے گذرا کرتے تھے۔ اس وقت ہم عرفات سے مکہ جانے والی شاہراہ نمبر۲ (طریق رقم ۲) پر تھے۔ عرفات سے نکلنے والی سڑکوں کے نام نمبروں میں رکھے گئے ہیں۔ میں دائیں بائیں بھی دیکھ رہی تھی اور اگلی گاڑی پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی ہمارے دونوں جانب بہت کم سبزہ والے میدان اور پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔

اچانک راشد صاحب کا ہاتھ گاڑی سے نکلا، وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بائیں جانب اشارا کر رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں نے اپنی رفتار سنت کی پیروی میں اچانک بڑھادی۔ میں نے جلدی سے بائیں جانب دیکھا۔ یہ وادی محسر تھی، مکہ کی دوسری جگہوں کی طرح، ویسی ہی سخت، بے آب وگیاہ اور مٹیالی۔ نہ یہاں رکا جاسکتا تھا نہ اس کا تفصیلی دورہ کیا جاسکتا تھا، بس اس کو اسی قدر دیکھا جاسکتا تھا۔

....

چودہ سو پچیس سال قبل ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں یہاں عیسائیوں پر عذاب خداوندی نازل ہوا تھا۔

جس سے عبرت پکڑ کر دس سال تک مشرکین عرب نے خدائے واحد کی پرستش کی تھی اور وہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں کو بھول گئے تھے، اس رب کعبہ کی پرستش کی تھی جس نے انہیں ہاتھی والوں سے بچالیا تھا۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے

اٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو
اور مکہ ومنیٰ کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو
جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے
ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا
اور کوئی سنگسار کیا گیا تھا
(ابو قیس بن اسلت)

حجاز کے جنوب میں ملک یمن کا بہت حد تک خود مختار بادشاہ ابرہہ تھا۔ ہر چند کہ اس نے عیسائی شاہ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی تاہم وہ بہت سے معاملات میں خود مختار تھا۔ عربوں کی (خصوصاً قریش کی) بالادستی جو خانہ کعبہ کی وجہ سے قائم تھی، ختم کرنے کے لئے نیز ان کی تجارتی بالادستی بھی ختم کرنے کے لئے ابرہہ نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا اور شاہ حبش کو لکھا:

'میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑ کے رہوں گا'

اس نے اپنے اس خیال کا اعلان کیا اور بار بار منادی کرائی جس پر غضب ناک ہو کر ایک عرب نے کلیسا میں گھس کر رفع حاجت کر کے گندگی پھیلا دی۔ ابرہہ تو پہلے ہی بہانے کی تلاش میں تھا لہٰذا اس نے قسم کھائی کہ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ کعبہ کو ڈھا نہ دوں۔

اس کے بعد وہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھیوں سمیت مکہ کی طرف روانہ ہوا راستے میں دو عرب قبائل کے سرداروں نے ابرہہ کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور شکست کھائی، انہی میں خثعم کے علاقے کا عرب سردار نُفیل بن حبیب خثعمی بھی تھا جسے اپنی جان بچانے کے لئے بدرقے کی خدمت انجام دینے کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔

ابرہہ کا لشکر طائف پہنچا وہاں لات کا ایک بڑا مندر بنا ہوا تھا اور اہل طائف اس مندر میں

جاکر لات کی پوجا کیا کرتے تھے، انہوں نے اس خوف سے کہ ابرھہ لات کا مندر نہ ڈھادے ابورغال نامی ایک شخص کو بدرقہ کے طور پر ابرھہ کے ساتھ کر دیا جب مکہ تین کوس رہ گیا تو ابورغال مر گیا، عرب مدتوں ابورغال کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔

ابرھہ نے مکہ پہنچنے پر گردونواح میں چرنے والے مویشی پکڑ لئے ان میں عبدالمطلب کے دوسو اونٹ بھی تھے۔ ابرھہ نے اپنا ایک قاصد اہل مکہ کے پاس بھیجا، جس نے اہل مکہ کو یہ پیغام دیا کہ اگر وہ تعرض نہ کریں تو ان کی جان بخشی کی جائے گی اور یہ کہ ابرھہ کا مقصد صرف کعبہ کو ڈھانا ہے۔ قاصد کا یہ پیغام سن کر سردار مکہ عبدالمطلب ابرھہ سے ملنے آئے۔ وہ اس قدر وجیہہ اور شاندار شخص تھے کہ ابرھہ بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

’آپ کیا چاہتے ہیں۔‘ اس نے پوچھا۔

’آپ میرے مویشی مجھے واپس کر دیں۔‘ عبدالمطلب نے جواب دیا۔

’آپ کو دیکھ کر تو میں خاصا متاثر ہوا تھا‘ ابرھہ نے مایوسی سے کہا ’مگر آپ کی بات نے آپ کو میری نظروں میں حقیر کر دیا ہے۔ آپ کو اپنے اونٹوں کی فکر ہے، کعبہ کی نہیں۔‘

’میں اپنے اونٹوں کا مالک ہوں لہٰذا انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں جو کعبہ کا مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کرلے گا۔‘

’نہیں‘ ابرھہ نے حتمی لہجے میں کہا ’وہ اس (کعبہ) کو مجھ سے نہ بچا سکے گا‘

یہ دیکھ کر عبدالمطلب نے واپس آ کر اہل قریش سے کہا کہ وہ ابرھہ سے کوئی تعرض نہ کریں اور اپنے اہل وعیال کو لے کر پہاڑوں پر چلے جائیں تاکہ ان کا قتل عام نہ ہو سکے۔ پھر وہ چند دوسرے سرداروں کے ساتھ خانہ کعبہ میں حاضر ہوئے، کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر بڑی رقت وعاجزی سے دعائیں مانگیں:

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے
تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما
کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر
تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے

اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے
تو پھر تجھ کو اختیار ہے

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں پر چلے گئے اب مکہ ابرھہ کے لئے بالکل خالی تھا۔ اس کے پاس زبردست فوج تھی، وہ آندھی کی طرح اٹھ کر بجلی کی طرح مکے پر گر سکتا تھا وہ ایسے ہی بگولے کی طرح اٹھا، شہر مکہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا، اہل شہر پہاڑوں پر جا چکے تھے، نہ کوئی رکاوٹ تھی نہ کوئی روک ____ مگر تدبیر چلنے والا اپنی تدبیر چل چکا تھا ابرھہ کا خاص ہاتھی محمود، حدود حرم سے باہر وادی محسر میں ہی یکا یک بیٹھ گیا، اس کو اٹھانے کے ہر جتن کر لئے گئے یہاں تک کہ آنکسوں کے کچوکے دے دے کر اسے زخمی کر دیا گیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

حیرت کی بات تھی اسے مزدلفہ یا منیٰ کی طرف موڑ کے لے چلتے تو دوڑنے لگتا اور اس کا رخ جونہی مکہ کی طرف پھیرا جاتا وہ ٹھٹھک کر بیٹھ جاتا۔ ابھی ابرھہ اور اس کے لشکری اس ضمن میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ آسمان پر پرندوں کے غول نظر آئے۔

بحر احمر کی طرف سے جھنڈ کے جھنڈ میں آنے والے یہ پرندے اہل عرب نے نہ اس سے قبل دیکھے تھے نہ اس کے بعد دیکھے، نہ یہ کبوتر تھے، نہ یہ ابابیلیں تھیں، یہ نہ نجد کے پرندے تھے نہ حجاز وتہامہ کے۔ ان کی چونچیں پرندوں کی طرح اور پنجے کتے کی طرح تھے۔ ہر پرندے کی چونچ میں ایک اور پنجوں میں دو دو کنکر، مٹر کے دانے کے برابر، سیاہی مائل سرخ کنکر دبے ہوئے تھے، یہ اسی قسم کے کنکر تھے جیسے قوم لوط پر برسائے گئے تھے۔

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا
تو ہم نے اس بستی (لوط کی بستی) کو تلپٹ کر دیا
اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے
جن میں سے ہر پتھر ترے رب کے یہاں نشان زدہ تھا۔
اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے۔

(سورۃ ہود۔ ۸۲تا۸۳)

آخر کار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا

اور ہم نے اس بستی (لوط کی بستی) کو تلپٹ کر کے رکھ دیا
اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی
(سورۃ الحجرات۔۷۴)

سو بحر احمر کی جانب سے آنے والے پرندوں کے منہ میں بھی اسی طرح پکی ہوئی مٹی کے پتھر دبے ہوئے تھے۔ان اجنبی پرندوں نے ابرھہ کے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی جس پر کوئی کنکری گرتی اسے شدید کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت گلنا اور جھڑنا شروع ہو جاتا یہاں تک کہ ہڈیاں نظر آنے لگتیں۔خود ابرھہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا وہ پاگلوں کی طرح اپنا جسم کھجا رہا تھا اور اس کا جسم آہستہ آہستہ گل رہا تھا۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟
کیا اس نے ان کے داؤ کو اکارت نہیں کر دیا؟؟
اور ان پر پرندوں کے غول بھیج دیئے
جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے
پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا!
(سورۃ الفیل)

لشکریوں میں بھگدڑ مچ گئی، جو پرندوں کے ابتدائی حملے کی کنکریوں سے بچ رہے تھے انہوں نے افراتفری میں یمن کی طرف بھاگنا چاہا، مگر راہبر کے بغیر اگر وہ بھاگتے تو عرب کے صحراؤں میں بھٹک کر رہ جاتے لہٰذا انہوں نے نفیل بن حبیب خثعمی کو ڈھونڈا اور اس سے واپسی کا راستہ دریافت کیا مگر اس کا جواب تھا۔

اب بھاگنے کی گنجائش کہاں ہے؟
جب کہ خدا تعاقب میں ہے
اور نکٹا (ابرھہ) مغلوب ہے
غالب نہیں ہے

لشکریوں کی خاصی بڑی تعداد وہیں ہلاک ہو گئی تھی باقی سب راستے میں قسطوں میں ہلاک

ہوتے گئے، بھاگنے والے لاشیں چھوڑ کر بھاگتے رہے، بلاد خثعم پہنچ کر ابرھہ بھی جہنم واصل ہو گیا۔

نُفیل بن حبیب اس موقع پر اپنی محبوبہ کو پکار کر کہتا رہا
اے ردینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی
جو کچھ ہم نے وادی محصب کے قریب دیکھا
میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا
اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آ پڑیں
ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفیل کو ڈھونڈ رہا تھا
گویا کہ میرے اوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا

....

میں تاریخ کی انہی بھول بھلیوں میں تھی کہ سجاد کی آواز آئی
’یہ جبل نور ہے، اسی میں غار حرا ہے‘۔
’یہ بھی دیکھنا ہے‘۔ میرا فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا
’کل صبح ہی صبح نکلیں گے‘ سجاد نے وعدہ کر لیا۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور مسجد کی تلاش جاری تھی، بالآخر ایک قریبی مسجد کے آگے گاڑی روک کر مرد حضرات مسجد میں چلے گئے میں نے اور راحیلہ نے گاڑی میں ہی مغرب کی نماز ادا کی اور پھر گاڑیاں گھر کی طرف چل پڑیں۔

☆☆☆☆☆

جبل نور

عید کے دوسرے دن یعنی ۲ شوال (۱۴ اپریل ۱۹۹۱ء) کو صبح ہی صبح نماز فجر کے بعد جبل نور کے لئے نکلنا تھا اس صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تاہم ابھی فجر کا وقت باقی تھا میں نے سجاد کو اٹھایا اور باتھ روم چلی گئی' وضو کر کے آئی تو سجاد بدستور سوئے ہوئے تھے' میں نے پھر ہلکے سے جھنجھوڑا۔

''اٹھو سجاد' نماز پڑھ لو پھر جبل نور کے لئے نکلنا ہے۔''

''اٹھتا ہوں''

میں نماز پڑھ کر آئی تب بھی سجاد سوئے ہوئے تھے۔ اس بار میں نے ٹھیک ٹھاک طریقے سے جھنجھوڑ دیا۔ اٹھتے ہی بنی۔ سجاد نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سجاد بھائی اپنی نائٹ ڈیوٹی سے واپس آگئے۔ راحیلہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ سوئی ہوئی تھی میں نے جلدی جلدی ناشتہ بنایا۔ میری خواہش تھی کہ ہم جلد از جلد نکل جائیں' ایک تو یہ کہ گرمی کم ہوگی دوسرے یہ کہ بچوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے' ابھی وہ سوئے ہوئے تھے لہٰذا ہمیں نکلنے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا' اگر وہ اٹھ گئے اور چلنے پر ضد کی تو ایک اور مسئلہ ہوگا۔

''یہ تقریباً چار گھنٹے کا معرکہ ہے جی'' سجاد بھائی چکن بوٹی کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ''تقریباً دو گھنٹے آپ کو اوپر چڑھنے میں لگ جائیں گے اور ڈیڑھ پونے دو گھنٹے آپ واپسی کے رکھ لیں پھر آدھا گھنٹہ گھر سے جبل نور تک جانے اور وہاں سے واپس آنے کے رکھ لیں''

میں نے حیرت سے سجاد کی طرف دیکھا' انہوں نے تائید میں گردن ہلا کر سجاد بھائی کے بیان کی تصدیق کر دی کیونکہ وہ اس سے قبل غار حرا کے اندر تک جا چکے تھے۔ دو گھنٹے پہاڑ پر چڑھنا اور پھر اترنا ہم جیسے میدانی علاقے کے لوگوں کے لئے ایک دل دہلا دینے والی خبر تھی۔

گھر سے نکلتے نکلتے ساڑھے آٹھ بج گئے' سجاد تو جب باتوں پر آتے ہیں تو ان کا اٹھنا آسان

نہیں ہوتا۔ اس دوران میں دس دفعہ جلدی اٹھنے کا کہہ چکی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ سعد یہ جاگ گئی' مگر راحیلہ نے بڑی پھرتی سے اسے کمرے میں ہی گھیر لیا' شاہ اور سعود ابھی تک سوئے ہوئے تھے ہم سجاد بھائی کو خدا حافظ کہہ کر چپکے سے گھر سے نکلے۔

گھر کے نزدیکی بقالے سے رک کر ہم نے پانی کی بوتل خریدی' مجھے اس وقت پانی کی اس بوتل کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اس کا اندازہ جبل نور کی چڑھائی کے دوران ہوا جب یہ بوتل شٹل کاک کی طرح میرے اور سجاد کے درمیان گھومتی رہی۔

صبح کے وقت مکہ کی شاہراہوں پر ٹریفک کم تھا۔ جبل نور، مکہ سے شمال مشرق کی جانب تقریباً تین میل کے فاصلے پر جبل ثبیر کے بالمقابل ایک پہاڑ ہے۔ اکثر اوقات ان دونوں پہاڑوں کا تذکرہ' جڑواں پہاڑوں کے طور پر ایک ساتھ آتا ہے۔ جیسے ہمارے جڑواں شہر اسلام آباد اور راولپنڈی ہیں۔ بعض اوقات جبل نور جسے جبل حرا بھی کہتے ہیں اور جبل ثبیر کو سمندر کی دو لہروں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ دونوں پہاڑ بے آب و گیاہ ہیں اور چند خاردار جھاڑیوں کے سوا وہاں اور کچھ نہیں اگتا۔

جونہی ہماری گاڑی طائف جانے والی شاہراہ پر نکلی' جبل نور کا بورڈ نظر آ گیا۔

''وہ ہے جبل نور'' سجاد نے فاصلے پر ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کیا اور میرا دل بیٹھنے لگا یا اللہ یہ تو اونچا' لمبا' پکا پورا پہاڑ ہے اس کی چوٹی تک کیسے جایا جائے گا ہائے کوئی چھوٹی' موٹی' جبل رحمت جیسی پہاڑی ہوتی تو ٹھیک تھا۔ جبل نور کے ارد گرد بھی متعدد پہاڑ تھے تاہم ان کی بلندی جبل نور جیسی نہیں تھی البتہ جبل ثبیر جو حرا کے مدمقابل قدرے فاصلے پر تھا' بلندی میں جبل نور کا مقابلہ کر رہا تھا۔ جبل نور سطح سمندر سے دو ہزار فٹ اونچا ہے۔ اوپر اس کی شکل گول برج کی سی ہے زمانہ جاہلیت میں رات کے وقت حجاج کی رہنمائی کے لئے اس کی چوٹی پر روشنی کی جاتی تھی تاکہ عرفات سے آنے والے راستہ متعین کر لیں۔

گاڑی آہستہ آہستہ جبل نور کے دامن کی طرف بڑھ رہی تھی اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے سوچ رہی تھی سجاد کو کچھ وصیتیں ہی کر جاؤں ''کیا بات ہے؟ نہیں جانا؟'' میرے چہرے اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھ کر سجاد نے پوچھا ''سوچ لو'' میری خاموشی پر سجاد نے کہا ''کوئی ضروری نہیں پورے پہاڑ کی چڑھائی چڑھ کر غار حرا تک جانا واقعی مشکل کام ہے۔''

اچانک مجھے پہاڑ پر ایک مخصوص راستے پر سیاہ اور سفید چیونٹیوں کی قطار نظر آئی جو دامن سے چوٹی تک چلی گئی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے آنکھوں کو سکیڑ کر دیکھا۔

''اوہو...... اس قدر رش؟'' سجاد نے حیرت سے کہا تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ سیاہ چیونٹیاں زائر عورتیں تھیں اور سفید چیونٹے زائر مرد تھے جو غار حرا کی زیارت کے لئے یا تو اوپر جا رہے تھے اور یا واپس آ رہے تھے گاڑی آہستہ آہستہ جبل حرا کے دامن پر جا کر رک گئی۔ اب یہ سفید اور سیاہ چیونٹیاں سفید و سیاہ بونوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ان میں بوڑھی عورتیں بھی تھیں اور بعض مردوں نے بچے بھی اٹھا رکھے تھے یہ دیکھ کر کافی حوصلہ ہوا۔

''ہاں بھئی بیگم صاحبہ کیا ارادے ہیں؟ یہیں سے تصویریں وغیرہ کھینچ کر واپس چلیں''

''نہیں اب تو ضرور جانا ہے' دیکھو بعض بوڑھی عورتیں بھی اتر رہی ہیں''

''تو گویا آپ کو اپنی جوانی پر اصرار ہے''

''بالکل' ابھی ہم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے' غار حرا تک تو دیکھا نہیں'' میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں نے کیمرے سے جبل حرا کی دو تین تصویریں لیں اور پھر کیمرے کو عبایا میں چھپا لیا یہاں تصویریں اتارنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے' شرطوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ کیمرہ توڑ دیتے ہیں اور زیادہ تر ریل نکال کر ضائع کر دیتے ہیں چنانچہ اس پورے سفر میں کیمرہ سنبھالنا میری ذمہ داری تھی کیونکہ وہ عبائے میں چھپ جاتا تھا۔

گاڑی میں سے پانی کی بوتل نکالی اور اللہ کا نام لے کر جبل نور کی چڑھائی شروع کر دی ابتدائی دس منٹ کی چڑھائی آسان تھی لیکن اس کے بعد سانس پھولنے لگا۔ اب سجاد کو بھی احساس ہوا کہ ہم دیر سے نکلے' ہمیں فجر کی اذان کے ساتھ ہی نماز پڑھ کر نکلنا چاہئے تھا تاکہ دس بجے تک واپسی ہو جاتی' مکہ میں تو دس بجے بھی سورج میں کافی حدت آ چکی ہوتی ہے۔ اب جب کہ ہم نے پونے نو بجے چڑھائی شروع کی ہے تو واپسی میں بارہ ساڑھے بارہ بج جائیں گے' جبکہ سورج نصف النہار پر ہوگا اور گرمی اپنے شباب پر' گرمی بھی مکہ کی گرمی۔

اس وقت بھی اترنے والوں کا رش زیادہ تھا' چڑھنے والے کم تھے۔

آخر رسول اللہؐ کو اس غار کا علم کیسے ہوا ہوگا؟

یہ عقدہ لانیحل تھا لہٰذا سفر سے واپسی پر جب میں نے کچھ تاریخی کتب کھنگالیں تو ''الانساب الاشراف'' میں بلاذری کا یہ بیان نظر سے گزرا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو قریش کے بعض افراد تعبد و تحنث کی خاطر حرا میں خلوت گزین ہو کر ذکر فکر اور عبادت و تحنث میں مہینہ بھر مشغول رہتے اور جو مساکین ان کے پاس جاتے انہیں کھانا کھلاتے اور شوال کا چاند طلوع ہونے پر حرا سے باہر نکلتے' بیت اللہ کا طواف کرتے اور گھروں کو واپس آتے۔

لیکن بلاذری کے اس بیان پر میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں مکہ میں گنتی کے چند لوگ ہی ایسے سلیم الفطرت تھے جو رمضان کے مہینے میں ذکر و فکر کرتے مگر کسی کے بارے میں یہ روایت نہیں ملتی' یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے کہ وہ بھی غار حرا جاتے تھے .... دوسرے یہ کہ مساکین کو کھانا کھلانے والی بات ماننا بھی خاصا دشوار ہے کیونکہ جس غار تک جانے میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی مشقت ہو اور جس کا عام راستہ لوگوں کو بالعموم معلوم بھی نہ ہو' جو مکے سے میلوں کی مسافت پر ہو وہاں تک مساکین کیا کرنے جاتے ہوں گے جب کہ انہیں ان کے علاقوں کے نزدیک سے ہی کھانا مل سکتا ہو .... پھر غار اندر سے رقبے میں اتنا چھوٹا ہے کہ دو افراد سے زیادہ کا وہاں قیام کرنا بھی دشوار ہے' ان باتوں کو دیکھتے ہوئے بلاذری سے اتفاق کرنا دشوار تھا۔

البتہ ابن حزم نے ''جمہرۃ الانساب العرب'' میں جو بات کہی ہے وہ دل کو لگتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ غار حرا میں ارادہ الٰہی کے تحت تشریف لے جاتے' نہ تو آپ کو کسی نے اس امر کا مشورہ دیا' نہ آپؐ نے وہاں کسی کو جاتے دیکھا کہ آپؐ اس کی تقلید کرتے۔

رمضان المبارک کا مہینہ چونکہ عمرے کے لئے آنے والوں کا شدید رش ہوتا ہے لہٰذا جبل نور پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دامن سے چوٹی تک جگہ جگہ شیڈ پڑے ہوئے تھے' چار پائی ہوٹل تو آپ نے دیکھے ہوں گے یہ کھوکھا ہوٹل تھے دامن سے چوٹی تک ہمیں ایسے آٹھ دس شیڈ ملے۔ ان میں قالین کا کوئی پرانا سا ٹکڑا زمین پر پڑا ہوتا۔ سر پر ایک چھپر پڑا ہوتا' ایک عدد دیوہیکل ڈیپ فریزر رکھا ہوتا' مشروبات کی بوتلیں' پانی کی بوتلیں دوگنے داموں فروخت ہو رہی ہوتیں' جب ہم ایسے ہی پہلے شیڈ پر پہنچے تو میرا سانس

پھول چکا تھا میں فوراً ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی' شیڈ میں ایک دو کھوکھے بھی پڑے تھے مگر اس پر لوگ بیٹھے تھے۔ سجاد نے تیم کے دوٹن لئے دگنی قیمت ادا کی' میں تیم پیتی اور شیڈ کا جائزہ لیتی رہی۔ پہاڑ جہاں بھی ذرا سا مسطح اور ہموار ہے وہاں قائم کرنے والوں نے دکانیں سجالیں' یہ دکان چلانے والا انڈین لگ رہا تھا۔

تازہ دم ہو کر ہم پھر اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر سے اترنے والوں میں اکثریت پاکستانیوں' ہندوستانی مسلمانوں اور انڈونیشیا اور فلپائین کے زائرین کی تھی' اترنے والے زائرین کے چہرے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ گرمی اور دھوپ کی شدت میں آہستہ آہستہ تیزی آ رہی تھی۔ تیسرے شیڈ پر پہنچے تو میں پھر گرنے کے سے انداز میں لکڑی کے ایک ٹوٹے پھوٹے کھوکھے پر جا بیٹھی ہمیں چڑھتے ہوئے نصف گھنٹہ ہو چکا تھا۔

''کچھ پیئو گی؟'' اس دفعہ سجاد بھی ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔

''نہیں'' میں نے صرف پانی کے دو گھونٹ لے لئے البتہ سجاد نے پیپسی کا ٹن چڑھا لیا۔

سانسوں کا اتار چڑھاؤ ذرا کم ہوا اور جان میں جان آئی تو ہم پھر چل پڑے چند قدم چلے ہوں گے کہ پھر ایک فقیرنی آ ٹکرائی' یہ چھٹی فقیرنی تھی اور افسوس کی بات یہ تھی کہ یہ سب پاکستانی تھیں۔ اس نے مجھ سے سندھی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

''اردو آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہا'' اس بوڑھی عورت نے اقرار میں سر ہلایا۔

''پاکستانی ہو؟''

''کیا؟'' شاید میرا سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''تمہارا ملک پاکستان ہے؟''

''ہمارا ملک سندھ ہے''

مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔

''جئے سندھ کی معلوم ہوتی ہے'' سجاد کو بھی ہنسی آ گئی۔

''تمہارا نام کیا ہے'' میں نے پھر اس سے پوچھا۔

''جیون''

''تم یہاں کیسے آئی ہو؟''

''عمرہ کرنے''

''اور کون کون آیا ہے؟''

''میرا بیٹا اور اس کی بیوی ہے''

''تو تمہارے بیٹے نے تمہیں اس دھندے سے لگا دیا ہے''

''پیسے ختم ہیں...... اپنے ملک جانا ہے۔''

اس نے اتنا طویل انٹرویو بغیر پیشانی پر بل ڈالے دیا تھا لہٰذا سجاد نے جیب سے چند ریال نکال کر اسے تھما دیئے۔

چڑھتے چڑھتے دم اکھڑنے لگا تھا' سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی بعض جگہ چڑھائی اتنی خطرناک تھی کہ سجاد پہلے خود اوپر چڑھتے پھر مجھے سہارا دے کر چڑھاتے' مجھے اپنا عبایا بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا اور کیمرہ بھی' سر پر سیاہ اسکارف اور سیاہ عبائے کی وجہ سے مجھے گرمی بھی زیادہ لگ رہی تھی۔ پانی کی بوتل ختم ہو چکی تھی جو جبل نور کی بلندیوں سے نیچے کی طرف اچھال دی گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور میں اگلے شیڈ کے انتظار میں جلدی جلدی اوپر چڑھ رہی تھی۔ ایک دو اور سندھی بولنے والے پاکستانی فقیر اور فقیرنیاں ٹکرائیں مگر میں ان سے کوئی سوال و جواب کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی سانس اس قدر بے قابو تھا کہ الفاظ منہ سے نکل ہی نہیں سکتے تھے لہٰذا ان کے ہاتھوں پر ریال رکھتے ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جب ذرا بلندی پر ایک شیڈ نظر آیا تو میری جان میں جان آئی۔ سجاد نے یہاں سے پانی کی بوتل دوگنے داموں خرید کر میری طرف بڑھا دی میں نے جلدی سے اس کا ڈھکن اتار کر منہ سے لگا لیا۔

''میں پندرہ منٹ سے پہلے یہاں سے نہیں ہلوں گی'' میں نے بوتل سجاد کو واپس کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے تم آرام کر لو'' سجاد بھی وہیں بیٹھ گئے۔

ابتدائی چند منٹ تو سانس درست کرنے میں لگ گئے ذرا ہوش آیا تو شیڈ کا جائزہ لیا۔ دس بارہ انڈونیشی لڑکوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی' شیڈ میں پرانا سا گندا سا سبز قالین پڑا ہوا تھا۔ ایک بڑا سا ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا' یہ بات میری ابھی تک سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ اتنی خطرناک چڑھائیوں پر ڈیپ فریزر کس

طرح لایا گیا ہوگا؟

بہر حال دس بارہ منٹ ستانے کے بعد ہم پھر اٹھے۔

پھر وہی جبل نور کی چڑھائیاں تھیں اور ہم تھے۔

چند قدم چڑھے ہوں گے کہ بائیں جانب ایک چٹان نظر آئی جس پر سفید پینٹ پھیر کر کالے رنگ سے لکھا تھا خان ڈاہا........ خانیوال۔ چٹان کے سائے میں ایک پٹھان ایک کپڑے پر بہت سارے نگینے اور پتھر رکھے بیچنے میں مصروف تھا اس کے پاس تین چار گاہک بیٹھے ہوئے مختلف پتھروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

ذرا ہی دور گئے تھے کہ بائیں جانب ایک چھوٹا سا درخت نظر آیا۔ جبل نور پر سبزہ بالکل نہیں ہے۔ ایک دو چھوٹے پودے نظر آجاتے تھے البتہ یہ درخت تقریباً تین چار فٹ بلند تھا' خدا جانے کس چیز کا تھا البتہ اس درخت پر چند خواتین اور حضرات کو ہم نے کپڑا باندھتے دیکھا' غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ رنگ برنگے کپڑوں کی ہزار ہا دھجیاں درخت کی ٹہنیوں سے بندھی ہوئی تھیں' ہر گیٹھ میں کسی کی دعا' کوئی آرزو' کوئی خواہش پڑی تھی۔ چند لوگ اس درخت کے ناکافی سائے میں بیٹھے ہوئے تھے شاید ان کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہے ہوں۔ ہم عجیب عجیب حرکات اور بدعات کرنے سے باز نہیں رہ سکتے حرم میں شرطہ کچھ نہیں کرنے دیتا تو جبل نور کی چڑھائیوں پر سہی جہاں شرطہ تھا نہ شرطے کی ذات۔ میرا خیال ہے سعودیوں کو اس درخت کے ساتھ کی جانے والی حرکات کا علم نہیں ورنہ یہ درخت اپنی جڑوں سمیت یہاں سے غائب کر دیا جائے۔

ہمیں چڑھائی چڑھتے ہوئے گھنٹے سے اوپر ہو رہا تھا۔ اب پھر سانس پھولنے لگا اور پاؤں کانپنے لگے تھے۔ اب پھر اگلے شیڈ کا انتظار شروع ہو گیا تھا۔ میرا حال کچھ زیادہ ہی خستہ ہو گیا تھا میں ہر آٹھ دس قدموں کے بعد چند ثانیہ کے لئے کسی چٹان کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ ایک جگہ میں نے ذرا سا سایہ دیکھا جو دو چٹانوں کے باہم ملنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا لیکن اس دو ڈھائی فٹ کی سایہ دار جگہ میں میرے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں پہلے ہی ایک سندھی جوان عورت اپنے ڈیڑھ دو سالہ بیٹے کو لئے بیٹھی تھی۔ آگے ایک گتہ پڑا ہوا تھا جس پر چند ریال اور چند ہلالے پڑے تھے۔ اس نے میری طرف بھی بڑی آس سے دیکھا لیکن سجاد آگے نکل چکے تھے اور میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ تاہم مجھے خاصا دکھ تھا' اب

غار حرا، مکہ

جبل نور، جس میں غار حرا واقع ہے

تک ملنے والے سارے فقیر پاکستانی سندھی تھے۔

میں نے رک کر نیچے دیکھا، ہم نصف سے زائد چڑھائی چڑھ چکے تھے۔ اگلا شیڈ دیر سے آیا میں دھم کر کے آلتی پالتی مار کے زمین پر بیٹھ گئی' سجاد نے ڈرنک لی مگر میں نے پانی سے حلق کو تر کیا۔ پانی کی طلب پانی ہی سے بجھ سکتی ہے قیمتی سے قیمتی مشروب بھی پانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جب اوسان بحال ہوئے تو میں نے شیڈ کا جائزہ لیا۔ چھ سات ہندوستانی مسلمان بیٹھے ہوئے مشروب پی رہے تھے۔ یہ بھی واپسی کے سفر میں تھے۔ اسی وقت دس بارہ انڈونیشی خواتین اوپر سے اترتی ہوئی نظر آئیں' چھوٹے قد اور ہلکے پھلکے جسموں والی یہ لڑکیاں بھاگتے ہوئے اتر رہی تھیں۔ ان کے چہرے لال بھبھوکا ہو رہے تھے مگر ہر چہرہ مسکراتا ہوا اور بشاش تھا' ان کی سانسیں بھی ایسی نہیں پھول رہی تھیں جیسا میرا حال تھا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اترنے کا عمل چڑھائی کے عمل سے قدرے آسان ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں شیڈ میں ستانے کے لئے بھی نہیں رکیں بلکہ بھاگتی چلی گئیں۔

"ارے ان کو دیکھو" ہندوستانی لڑکوں میں سے ایک نے ان انڈونیشی عورتوں کی طرف اشارہ کیا" یہ چھوٹے ٹانگوں والی بکریاں ہم سے اچھی ہیں' ایسے اتر رہی ہیں جیسے اپنے گھر کی سیڑھیاں اتر رہی ہوں۔ ارے یہ تو اڑی جا رہی ہیں"

جس لہجے میں بات کی گئی تھی' کوئی اور وقت ہوتا تو شاید ہم بھی ہنستے مگر ابھی تو حال یہ تھا کہ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتے تو حلق سے کچھ عجیب قسم کی آواز برآمد ہوتی شیڈ میں رش بڑھنے لگا تھا لہٰذا نئے آنے والوں کے لئے جگہ چھوڑ کر ہم پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر وہی ہم اور وہی جبل نور کی چڑھائیاں .... اگر دور سے دیکھا جائے تو جبل نور کی چوٹی مکعب نما ہے۔ یہ مکعب نما حصہ بڑا خطرناک ہے کیوں کہ یہاں چٹانیں بالکل سیدھی ہیں اسی وجہ سے یہاں کی چڑھائی بھی خطرناک ہے۔ اچھا ہوا مجھے اس بات کا علم ابتداء میں نہیں تھا ورنہ شاید ڈر کے مارے ہمت ہی نہ کرتی مگر اب تو اتنے اوپر آ گئے تھے اب تو جو بھی ہو سفر کا انجام ....

پانی کی بوتل میں دو تین گھونٹ پانی بوتل کے پیندے میں ہچکولے لے رہا تھا۔

"اگلے پوائنٹ پر پانی لے لیں گے" سجاد نے مجھے تسلی دی۔ میں نے گھڑی دیکھی ہمیں چڑھائی چڑھتے تقریباً سوا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ایک چٹان کے پیچھے سے ہم نکلے تو چند فٹ کی سطح جگہ نظر آئی'

جبل نور کی چوٹی پر غار حرا (مکہ مکرمہ ۱۹۹۶ء)

جبل نور کے دامن میں (مکہ مکرمہ ۱۹۹۶ء)

آثار سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں شیڈ تھا' کیونکہ سائبان ڈلا ہوا تھا جو کہ تار تار ہونے کو تھا' زمین پر کپڑا بچھا ہوا تھا اور خالی پانی کی بوتلیں اور مشروبات کے ڈبے پڑے ہوئے تھے میں نے سجاد کو چھو کر اس جگہ کی طرف اشارہ کیا اور ان کا جواب لئے بغیر دھم سے ایک چٹان پر بیٹھ گئی جس پر سایا تھا۔ بول اس لئے نہیں سکتی تھی کہ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر دو گھونٹ پانی میں نے اور دو گھونٹ سجاد نے پئے اور پھر وہ خالی بوتل بھی جبل حرا کی اونچائیوں سے نیچے لڑھکا دی لوگ ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کچھ اوپر سے نیچے آرہے تھے' کچھ نیچے سے اوپر جا رہے تھے۔ اسی وقت ایک بزرگ جوڑا ہانپتا کانپتا چٹانوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور مزید اوپر جانے سے پہلے ہمیں ادھر بیٹھے دیکھ کر ستانے کے لئے ادھر ہی چلا آیا۔

سجاد نے بزرگ صاحب سے باتیں شروع کر دیں' پتہ چلا پنجاب کے علاقے کے رہنے والے ہیں' آج کل لندن میں مقیم ہیں' دونوں میاں بیوی عمرہ کرنے آئے تھے اب غار حرا کی زیارت کرنے جا رہے تھے۔ خاتون کی عمر پچپن' ساٹھ کے درمیان تھی' لیکن چھریرے بدن کی چست خاتون تھی' البتہ بزرگ ساٹھ' پینسٹھ کے پیٹے میں تھے اور ان میں بزرگی والا مخصوص دھیما پن تھا۔ ان دونوں نے بھی پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پئے۔

''ذرا سوچئے'' خاتون پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولیں'' رسول اللہؐ ادھر آتے تھے زاد راہ کا وزن بھی ساتھ ہوتا ہوگا' آخر چڑھتے ہی تھے۔''

اس جملے کے ساتھ ہی وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئیں'' چلئے'' انہوں نے اپنے ساتھی کا شانہ ہلایا جو شاید ابھی چند منٹ اور دم لینا چاہتے تھے'' بیٹھے تو پھر بیٹھے ہی رہ جائیں گے'' وہ دونوں پھر تیزی سے لپکتے ہوئے اوپر چڑھنے لگے۔

سجاد نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں' تم سے دوگنی عمر کی خاتون ہے مگر پھرتی دیکھو' لیکن میں نے دیکھی ان دیکھی کرتے ہوئے داہنے جانب پہاڑ سے نیچے کا نظارہ شروع کر دیا۔ جہاں چھوٹے بڑے پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خیال بہت اچھا تھا کہ جن راستوں سے رسول اللہؐ گزرا کرتے تھے بالکل انہی راستوں کے ہم بھی مسافر تھے۔ مزید چند منٹ بیٹھ کر ہم پھر اٹھے پھر وہی جبل نور کی چڑھائیاں تھیں اور وہی ہم۔

چند قدم چڑھے ہوں گے کہ ایک چٹان پر ایک ساٹھ ستر برس کا بوڑھا بیٹھا نظر آیا۔ دھوپ کی

تمازت سے خود کو ایک گتے کی اوٹ سے بچا رہا تھا اس کا ہاتھ ہر آنے جانے والے کے آگے پھیلتا تھا۔ میں نے اپنی تفتیش شروع کی تو پتہ چلا کہ پاکستانی ہے' سرائیکی بولتا ہے سجاد نے ایک ریال کا سکہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

دس قدم بھی نہیں اٹھائے ہوں گے کہ ایک عورت دو بچوں کے ساتھ چلچلاتی دھوپ میں ننگی چٹان پر بیٹھی تھی، سندھی کپڑے پہنے ہوئے تھی، بچوں کی عمریں تین سال اور ایک سال رہی ہوں گی دونوں لڑکیاں تھیں اس نے اردو میں ہم سے مدد مانگی۔

''ان بچیوں کو سائے میں کرو'' میں نے سخت لہجے میں اس کو ڈانٹا۔

''سایہ کہاں ہے؟'' اس نے اپنے چاروں طرف ہاتھ پھیلا کر سندھی لہجے میں اردو بولی۔

''تو کیوں ان معصوم جانوں کو لے کر یہاں بیٹھی ہو۔'' میں دوبارہ اس پر الٹ پڑی۔

''کیوں غصہ کر رہی ہو'' سجاد جو چند قدم اوپر جا چکے تھے پلٹ کر واپس آئے'' یہی لڑکیاں تو اس کا ذریعہ معاش ہیں''

مجھے غصے میں دیکھ کر اس نے دونوں بچیاں اپنی طرف سمیٹ لیں، سجاد نے اس کے ہاتھ پر بھی ریال کا نوٹ رکھ دیا اس نے بڑی منت سے میرے پاؤں کو چھوا

ہم پھر بوجھل دل سے اوپر چڑھنے لگے'' اب تک ہمیں چالیس سے زائد فقیر نیاں مل چکے ہیں'' میں نے سجاد سے کہا'' چند سرائیکی تھے اس کے علاوہ سب کا تعلق سندھ سے ہے' سندھی بولنے والے' غریب ترین عوام.........''

''یہاں یہ لوگ عمرے کے ویزے پر آتے ہیں'' سجاد نے بتایا'' پھر غیر قانونی طور پر رک جاتے ہیں اور پھر بھیک مانگ کر اتنا کما لیتے ہیں کہ نہ صرف ٹکٹ کے پیسے نکل آئیں بلکہ واپس جا کر بھی سال دو سال آرام سے گزار لیں''

یہ صورتحال' ہر پاکستانی کے لئے اک لمحہ فکریہ ہے' ہمارے دیہی علاقوں کو زمینداری اور جاگیرداری نظام چاٹ گیا ہے وہاں غریب ہاری، غلاموں کی طرح زندہ ہیں جن کے پاس پھانکنے کے لئے ریت اور مٹی ہی ہے اور پینے کے لئے خون جگر اور وہ بھی اپنا

ان جاگیرداروں کا ملک کی ترقی میں آخر کیا حصہ ہے؟ ٹیکس کے نام پر یہ حکومت کو کیا دیتے

ہیں؟ لیکن ان کے لئے دھرتی ماتا، دودھ دینے والی گائے ہے تاحد نظر ان کی زمینیں ہیں، ان کی کیٹیاں ہیں، حرم ہیں، اپنے اپنے غنڈوں اور بدمعاشوں پر مبنی اپنا اپنا جتھا ہے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی بادشاہت ہے، عوام کا خون چوس کر کی جانے والی کمائی پر سیاست کرتے ہیں اور لیڈر بن جاتے ہیں۔ مگر کس لیڈر نے ہاریوں، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے دن پھیرے ہیں؟ کسی نے بھی نہیں، تب ہی تو پاکستانی دوسرے ملکوں میں بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔

اب ہم مکعب نما حصہ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے' سیدھی چڑھائی تھی اور خاصی دشوار اور خطرناک' دو جگہ میں گرتے گرتے بچی' گرمی کی شدتوں اور چڑھائی کی مشقتوں کی وجہ سے میرا دل' دماغ میں دھڑک رہا تھا۔ بالآخر ہم چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سب سے بڑا شیڈ ایک کشمیری کا تھا جہاں ایک لمبی سی چوبی بینچ پڑی ہوی تھی جس پر حسب سابق ہم بیٹھ کر سانسیں درست کرنے لگے' ہم خاصی بلندی پر تھے' یہاں کی ہوا خوشگوار تھی اور گرمی کی تیزی کو کاٹ رہی تھی۔ شیڈ کے اندر دو قوی ہیکل ڈیپ فریزر رکھے ہوئے تھے۔

''یا اللہ ہم تو کسی نہ کسی طرح یہاں آ گئے مگر یہ کنگ سائز ڈیپ فریزر جبل نور کی چوٹی تک کیسے آ گئے؟'' میں نے سخت حیرت سے سجاد سے پوچھا۔

''یہ اپنے پٹھان اور کشمیری بھائیوں کے کارنامے ہیں'' سجاد نے جواب دیا اور اٹھ کر پانی کی بوتل لینے چلے گئے۔

''چائے آ رہی ہے۔'' واپس آ کر سجاد نے خبر دی اور پانی کی بوتل مجھے پکڑا دی' یہاں پکنک کا سا سماں تھا' لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے' جو ہماری طرح سستا رہے تھے وہ مشروبات اور چائے سے شغل کر رہے تھے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک کشمیری نے اسٹوڈیو کھولا ہوا تھا جہاں لوگ تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ اس کے پاس پولورائڈ کیمرہ تھا۔ پس منظر میں خانہ کعبہ کا پوسٹر تھا' جو تصویر کھنچوانا چاہتا' فوٹوگرافر اس کے سر پر سعودی رومال بھی ٹکا دیتا' اس طرح لوگ پورے عرب بن کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔

''غار حرا کہاں ہے؟'' میں نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''دوسری طرف'' ہم جدھر سے آئے تھے سجاد نے اس کے برعکس اشارہ کیا۔ ''اس کے لئے

تھوڑا اترنا پڑے گا پھر دو پتھروں کے درمیان کی جگہ سے گزر کر غار کے منہ پر پہنچ سکیں گے' مگر رش بہت ہے پتہ نہیں ہم اندر جا سکیں گے یا نہیں۔''

چائے ختم کر کے ہم چوٹی کے دوسری طرف پہنچے' یہاں سے راستہ نیچے اترتا تھا اور چند گز کے فاصلے پر غار حرا تھا۔ غار حرا کے منہ پر کسی نے سفید پینٹ سے بڑا بڑا ''غار حرا'' لکھ دیا تھا۔ غار کا دہانہ تنگ تھا اور ایک وقت میں ایک آدمی ہی اندر جا سکتا تھا۔ غار کے منہ پر لوگوں کا اژدھام تھا' عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی' تھوڑی بہت دھکم پیل بھی تھی' زیادہ دھکم پیل کی گنجائش نہیں تھی ورنہ پیروں کو تکلیف دیئے بغیر سیکڑوں فٹ کی بلندی سے بلا روک ٹوک نیچے واپس پہنچنے کے روشن امکانات تھے۔ حرا کی چوٹی پر کھڑے ہم چند گز نیچے غار کے دہانے پر لوگوں کا رش دیکھ رہے تھے۔

''رش بہت ہے' ہم اندر نہیں جا سکیں گے'' سجاد نے اطلاع دی تو مجھے سخت مایوسی ہوئی دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے۔ سجاد پچھلے سال جب عمرے پر آئے تھے تو غار حرا کے اندر نصف گھنٹہ گزارا تھا۔ لیکن مجھے اس کے لئے شاید ایک دفعہ پھر محنت کرنی پڑے۔

''اندر سے غار کافی تنگ ہے'' سجاد مجھے تفصیلات بتانے لگے۔ ''دو آدمیوں سے زیادہ کے سمانے کی گنجائش نہیں''

غار اندر سے تقریباً چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا ہے اونچا اتنا کہ آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ فرش مسطح ہے جس پر آرام سے پاؤں پھیلا کر سویا جا سکتا ہے۔ غار کے منہ پر قدرتی طور سے پتھر کی سلیں اس طرح مل گئی ہیں کہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو جاتا ہے اور سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ غار کا رخ قدرتاً بیت اللہ کی طرف ہے۔ اب جب کہ میں اچھی طرح جان چکی تھی کہ غار میں داخل ہونا قریب قریب ناممکن ہے تو میں نے حرا کی چوٹی پر کھڑے کھڑے مکے کا نظارہ شروع کر دیا۔ یہاں سے مسجد الحرام کے مینار بھی نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں فضائے بسیط تھی' جہاں ۲۷ رمضان المبارک کی شب رسول اللہؐ نے جبریل امین کو دیکھا تھا۔ پیغام لانے والے نے اللہ کا پیغام آپ کو دیا۔

پڑھ۔ اپنے رب کے نام کے ساتھ' جس نے پیدا کیا۔
جس نے انسان کو جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔
پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔

جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

(علق ۔۵۔۱)

کافی دیر ہم جبل حرا کی چوٹی پر کھڑے رہے۔ یہاں کھڑے رہنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شاید رش کم ہو تو ہم بھی قسمت آزمائی کر سکیں، لیکن ہمارے ارد گرد بھی متعدد لوگ شاید اسی انتظار میں تھے اور رش تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ رش کے بڑھنے کے ساتھ ہی میری مایوسی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر ہمیں واپسی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ حالانکہ واپس جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نے بھرپور نظر غار پر ڈالی اور واپس ہو لئے۔

مختلف شیڈ پر رکتے، ستاتے ہم اترتے رہے۔ وہی فقیر اور فقیرنیاں ہمیں دوبارہ ملتے رہے، وہی درخت اور اس پر بندھی ہوئی ہزار ہا رنگین دھجیاں، وہی خان ڈھابا آف خانیوال، وہی پیاس کے عالم میں بوتل کو بار بار منہ سے لگانا۔ کاش غار حرا میں داخل ہونے کا موقع مل جاتا تو آج کا سفر کتنا مکمل ہوتا۔

سوا گھنٹے ہمیں اترنے میں لگ گئے، جب ہم جبل نور کے دامن میں کھڑی اپنی گاڑی میں پہنچے تو میں نے پلٹ کر جبل نور کو دیکھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس کی چوٹی کو چھو کر آئے ہیں۔ چودہ سو سال سے زائرین اس پہاڑ پر چڑھ اور اتر رہے ہیں جس کی وجہ سے راستہ سا بن گیا ہے جب یہ راستہ سا نہیں ہوتا ہوگا تب چڑھائی کتنی دشوار ہوتی ہوگی۔

پھر ہم تو اپنے گھروں سے جبل نور کے دامن تک گاڑیوں میں آئے تھے جب کہ رسول اللہؐ اپنے گھر سے (جو کہ حرم کے پاس تھا) جبل نور کے دامن تک پیدل آتے تھے اور پھر پورے پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے تھے۔ ''شب جائے کہ من بودم'' میں شورش کاشمیری صاحب نے سہواً یہ کہہ دیا ہے کہ ''نبوت سے قبل حضورؐ چالیس برس تک اس چوٹی پر آتے اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہے۔'' (شب جائے کہ من بودم۔۶۴)

یہ بات درست نہیں ہے۔ رسول اللہ کو چالیس برس کی عمر میں نبوت ملی ظاہر ہے پیدائش کے فوراً بعد تو آپؐ نے اس پہاڑ پر جانا شروع نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ پینتیس سال کی عمر سے آپ کا غار حرا میں جا کر تعبد و تحنث میں مشغول ہونا پتہ چلتا ہے۔

اسی سفرنامے میں شورش کاشمیری صاحب نے علامہ مشرقی کا یہ جملہ بھی نقل کیا۔

''اس پہاڑ (جبل حرا) پر چڑھنا عام انسان کے بس میں نہیں اللہ تعالیٰ کا اولی العزم پیغمبر ہی آ جا سکتا تھا اور یہ صرف انہی کی ہمت کا معجزہ تھا۔'' (شب جائے کہ من بودم۔۶۵)

یہ بیان بھی تاریخی طور پر درست نہیں لگتی، جبل حرا پر چڑھنے والے ہمارے جیسے عام لوگ ہی تھے بات صرف جذبے اور شوق کی ہے، پھر ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ جس شہر میں پیدا ہوئے تھے یعنی مکہ میں، وہ سارا کا سارا شہر ہی پہاڑی ہے۔ اس قدر تعمیرات کے باوجود آج بھی آپ پیدل مکے کی گلیوں اور سڑکوں پر پھریں تو آپ کو لگے گا کہ یا تو آپ اوپر چڑھ رہے ہیں یا نیچے اتر رہے ہیں۔ مکہ میں مسطح زمین کتنی ہے؟

لہٰذا رسول اللہؐ ایک پہاڑی شہر کے مضبوط اور باہمت نوجوان تھے جو کئی کلومیٹر پیدل چل کر جبل حرا تک پہنچتے اور پھر پہاڑی کی چوٹی تک جاتے۔ چند دن قیام کرتے اور پھر واپس آ جاتے۔

میرے خیال میں اس سے زیادہ تعجب انگیز واقعہ جبل ثور سے متعلق ہے مکہ مکرمہ کے جنوب میں تقریباً چھ میل دور جبل ثور ہے۔ یہ پہاڑ جبل حرا سے زیادہ اونچا ہے۔ اسی پہاڑ کے ایک غار میں رسول اکرمؐ نے ہجرت کے موقع پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تین دن قیام کیا تھا۔ اس دوران سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے عبداللہؓ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے ہر روز ان کے پاس غار میں آتے اور انہیں کافروں کی سرگرمیوں کی خبر دیتے، ان کے پیچھے سیدنا ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہؓ ریوڑ چراتے ہوئے پہنچتے، رسول اللہؐ اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو تازہ دودھ دیتے اور واپس آ جاتے، عبداللہؓ کے قدموں کے نشانات بھی ریوڑ کی وجہ سے مٹ جاتے۔ غار ثور تک ہر روز جانا اور واپس آنا میرے نزدیک سخت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس طرح کے کئی اور واقعات تاریخ میں ملتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ صحراؤں میں پلنے والے اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے یہ عرب جسمانی طور پر خاصے مضبوط اور توانا تھے۔ پہاڑوں پر چڑھنا اور اترنا معمولی واقعہ نہ سہی تاہم اتنا غیر معمولی بھی نہیں ہوتا ہوگا۔

ہم گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑے، پیر جبل حرا کی مٹی اور گرد و غبار سے آلودہ تھے، پنڈلیوں میں درد تھا، دل و دماغ میں دھڑک رہا تھا مگر اس کے باوجود جبل حرا کا سفر زندگی کا انتہائی اچھوتا تجربہ ثابت ہوا، جو بھولتا نہیں۔

زندہ لڑکیوں کا مدفن

جبل نور سے واپسی کے بعد جی چاہ رہا تھا کہ پیروں کو نیم گرم پانی میں ڈال کر کم از کم گھنٹہ بھر بیٹھے رہیں، لیکن اس کی گنجائش نہیں تھی دوپہر کے کھانے کے بعد پروگرام یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جہاں لڑکیاں دفن کی جاتی تھیں وہ جگہ دیکھی جائے اور موقع ملے تو غار ثور بھی دیکھ لیا جائے۔ کھانا کھاتے اور نکلتے کافی دیر ہوگئی۔ سجاد بھائی کے گھر میں پینے کے لئے آب زم زم استعمال ہوتا ہے جب کہ دیگر گھریلو امور کے لئے نلکے کا پانی۔ لہٰذا وہ سات آٹھ کنٹینرز مسجد حرام کے پاس سے بھر لاتے ہیں اور جب یہ پانی ختم ہو جاتا ہے تو پھر کنٹینرز بھر لئے جاتے ہیں۔

آج بھی پانی بھرنے کا دن تھا سجاد بھائی نے ایک ایک خالی Container ایک ایک بچے کو پکڑا دیا اور یوں آن واحد میں سات آٹھ Container نیچے پہنچ گئے۔ پہلے ہم مسجد الحرام گئے، وہاں باہر ہی نلکوں میں سے پانی بھرا گیا، ایک نیا Container سجاد بھائی نے ہمارے لئے بھی آب زم زم کا بھرا کہ زائرین کے لئے یہ تبرک بڑا اہم ہوتا ہے اس کے بعد مسجد الحرام سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر پل سے ذرا آگے سجاد بھائی نے گاڑی روک دی۔ گاڑی سے اتر کر ہم واپس پل کی طرف آئے، ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے نیچے کی طرف اشارا کیا۔

'یہاں وہ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا کرتے تھے'

'یہ کس کی اطلاع ہے۔' میں نے پوچھا۔

'مقامی لوگوں کا کہنا یہی ہے۔'

میں نے پل کی ریلنگ پر سے جھانک کر نیچے دیکھا، یہ ایک مثلث نما مستطیل سا قطعہ زمین تھا۔ جس کے تین اطراف، یعنی سامنے، دائیں اور بائیں طرف دیواروں سے احاطہ بنا دیا گیا تھا جب کہ پچھلی سمت چٹانوں کی بلندیاں تھیں، اسی کے اوپر وہ پل تھا جہاں سے ہم اس وحشی جگہ کا نظارہ کر رہے تھے۔

سعودی کسی جگہ کو خالی نہیں چھوڑتے حیرت ہے اس جگہ پر کوئی پلازا یا کوئی ہوٹل کیوں نہ قائم کیا گیا۔ یہ جگہ اب بھی خالی پڑی ہے، بلکہ اس کے اردگرد دیواریں بھی بنی ہوئی ہیں ایسے جیسے اس جگہ کو محفوظ کیا گیا ہو اس جگہ کے سامنے سے مکہ کی مصروف شاہراہ گذر رہی تھی اور اس کے بائیں جانب کثیر المنزلہ عمارتیں تھیں۔

''میری امی کو یہ جگہ بالکل پسند نہیں ہے''۔ رابعہ، ثناء سے کہہ رہی تھی ''میری امی کو یہاں سے لڑکیوں کے چیخنے کی آوازیں آتی ہیں''۔

میں نے کیمرہ نکال کر اس جگہ کی دو تصویریں لیں۔

''امی وہ لوگ لڑکیوں کو کیوں دفن کر دیتے تھے''۔ ثناء نے مجھ سے سوال کیا اور یہ سوال تو قیامت کے دن خدا بھی زندہ گاڑی گئی لڑکی سے پوچھے گا۔

''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا
اور جب تارے بکھر جائیں گے
اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے
اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی
اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکھٹے کر دیئے جائیں گے
اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے
اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی
اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔
اور جب نامہ اعمال کھولے جائیں گے
اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا
اور جب جہنم دہکائی جائے گی
اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی
اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

(التکویر۔ ۱ تا ۱۴)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ زندہ درگور کیے جانے کا سوال شقی القلب باپ سے نہیں بلکہ بے گناہ بچی سے کیا جائے گا، اس انداز بیان سے قاتل کے خلاف انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا ہے، یعنی وہ اس بات کا مستحق ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف دیکھا جائے اور اس سے خطاب کیا جائے۔

عربوں میں یہ رسم بہت عام نہیں تھی اگر ایک باپ اپنی بیٹی کو ہلاک کر دیتا تھا تو دس چھوڑ بھی دیا کرتے تھے۔ قریش میں اس کا رواج بنو تمیم، ربیعہ اور کندہ میں تھا۔ اس کا رواج اس طرح پڑا کہ بنو تمیم، نعمان بن منذر کو خراج ادا کیا کرتے تھے ایک بار انہوں نے خراج ادا نہ کیا تو نعمان کی فوج بنو تمیم کے چوپائے ہانک کر لے گئی اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔ بنی تمیم کا وفد نعمان بن منذر کے پاس آیا اور اپنی عورتوں اور بچوں کی رہائی کی درخواست کی۔ نعمان نے یہ فیصلہ کیا کہ عورتوں کو اختیار دے دیا جائے جو عورت اپنے خاندان میں واپس جانا چاہے تو اسے اس کے خاندان کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ان میں بنو تمیم کے سردار قیس بن عاصم کی بیٹی بھی تھی۔ اس نے اپنے قید کرنے والے کے پاس رہنے کو ترجیح دی اس پر قیس بن عاصم نے یہ عہد کرلیا کہ اس کے پاس جو بچی بھی پیدا ہوگی وہ اسے زندہ دفن کر دے گا۔ چنانچہ اس نے دس سے کچھ اوپر بیٹیاں زندہ دفن کر دیں۔

تاریخ میں ایک دوسری روایت بھی ملتی ہے جس کے تحت عربوں میں سب سے پہلے قبیلہ ربیعہ نے لڑکیوں کو زندہ دفن کیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک بار ان پر حملہ ہوا جس میں حملہ آور ان کے امیر کی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔ صلح کے بعد امیر نے اپنی بیٹی کو واپس مانگا تو لڑکی کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ قید کرنے والے اور اپنے باپ میں سے جسے چاہے اختیار کرلے۔ لڑکی نے اسی شخص کو پسند کیا جس کے پاس وہ قید تھی اور اسے اپنے باپ پر ترجیح دی، اس پر باپ کو سخت غصہ آیا اور اس نے اپنی قوم کے لئے بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم جاری کر دی۔

بعض اوقات تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے گڑھا کھود دیا جاتا تا کہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ بعض عرب ایسے تھے جو صرف ان لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے جو نیلی آنکھوں، کالے رنگ والی ہوتیں، یا جن کے جسم پر سفید داغ ہوتے یا وہ جسمانی طور پر معذور ہوتیں کیوں کہ ان صفات کو عرب منحوس سمجھتے تھے۔

بعض عرب وہ تھے جو خرچ کے ڈر اور محتاجی کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے وہ

چاہتے تھے کہ روٹی توڑنے والے ہاتھ کم ہوں، روٹی کما کر لانے والے ہاتھ زیادہ ہوں، چنانچہ روٹی توڑنے والے ہاتھوں کو وہ دفن کر دیتے اور رزق کمانے والے ہاتھوں کو وہ سنبھال لیتے۔ جس پر قرآن نے کہا:

'اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو
ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی
درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے'۔
(بنی اسرائیل۔۳۱)

لیکن بالکل تاریکی تو کہیں نہیں ہوتی، روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن، کہیں نہ کہیں سے در آتی ہے لہٰذا اسی عرب معاشرے میں ایسے بھلے لوگ بھی تھے جو اس قبیح رسم کو سخت ناپسند کرتے تھے چنانچہ زید بن عمرو بن نفیل ہر اس شخص کے پاس پہنچ جاتے تھے جو اپنی بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیتا تھا اور اس کی لڑکی کو مانگ لیتے کہ میں اس کی کفالت کروں گا، اور جوان ہونے پر تمہیں اختیار ہے کہ تم اپنی بیٹی مجھ سے واپس لے لو یا میں ہی اس کے باقی فرائض بھی ادا کر دوں گا۔

اسی سنگدل معاشرے میں صعصعہ بن ناجیہ المجاشی (مشہور شاعر فرزدق کا دادا) بھی تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک تین سو ساٹھ لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا تھا۔ اسی پر فخر کرتے ہوئے فرزدق کہتا ہے

ہمیں میں سے وہ شخص بھی تھا جس نے زندہ دفن ہونے والیوں کو روکا
اور بچیوں کو زندگی بخشی، اور پھر انہیں دفن نہیں کیا گیا

صعصعہ ایسی بچیوں کو کہ جن کے قتل کا فیصلہ کر لیا جاتا تھا فدیہ ادا کر کے اسے بچالیا کرتا تھا۔ یہ فدیہ ایک اونٹ اور دو گابھن اونٹنیاں ہوتیں۔

اللہ، زید بن عمرو اور صعصعہ بن ناجیہ جیسے رحم دل انسانوں کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے جنہوں نے بے آسرا بچیوں کی زندگیاں ان کے باپوں سے خرید لیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ ان لڑکیوں کے لئے رحمت بن کر آئے جن کی تعلیمات نے اس جنس بے مایہ کو ایک بیش بہا دولت بنا دیا، جس کی تمنا کی جانی چاہئے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر

کے رکھے، نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا (ابوداؤد)

گویا لڑکیاں، والدین کے لئے جنت کی بشارت ہوگئیں، کیوں کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ ہی کا فرمان ہے کہ جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے، اور اپنی وسعت کے مطابق ان کو اچھے کپڑے پہنائے وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی (بخاری، ابن ماجہ)

یہی بشارت ایک بیٹی یا ایک بہن کے لئے بھی ہے شرح السنہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی پرورش کی، ان کو اچھا ادب سکھایا اور ان سے شفقت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں تو اللہ اس کے لئے جنت واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اور دو لڑکیاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اور دو بھی، حدیث کے راوی ابن عباس کہتے ہیں اگر لوگ اس وقت ایک لڑکی کے متعلق پوچھتے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

خود رسول اللہ ﷺ کے یہاں چار بیٹیاں تھیں، سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ ام کلثوم، اور سیدہ فاطمہ، ان کے حق میں رسول اللہ ﷺ انتہائی رحیم و کریم تھے۔ اس زمانے میں کسی عرب کے لئے یہ کافی سبب ہوتا تھا کہ وہ ایسی بیوی کو چھوڑ دے جو اس کے لئے بیٹے پیدا نہیں کرتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آخر وقت تک حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ مثالی خوشگوار زندگی گذاری۔

اس زمانے میں یہ ضروری نہیں تھا کہ لڑکیوں کو زمین میں ہی دفن کیا جائے، انہیں دوسرے ذرائع سے بھی ہلاک کیا جا سکتا تھا مثلاً کسی پہاڑ سے نیچے پھینک دیا جائے، یا کسی کنویں میں دھکا دے دیا جائے، ڈبو دیا جائے یا ذبح کر دیا جائے۔ سنن دارمی میں ایک بڑا ہی دل ہلا دینے والا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک شخص نے ایک دفعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی، جب بھی میں اس کو پکارتا وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آتی، ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا، راستہ میں ایک کنواں آیا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا، آخری آواز جو میری بیٹی کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی۔

'ہائے ابا..... ہائے ابا______' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رو دیئے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا۔

'اے شخص تو نے رسول اللہ کو غمگین کر دیا'

'اسے مت روکو' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا 'جس بات کا اسے سخت احساس ہے اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو'۔

پھر آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ اپنا قصہ پھر بیان کر، اس نے دوبارہ اسے بیان کیا آپ ﷺ سن کر اس قدر روئے کہ آپ ﷺ کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا (اسلام لانے والوں کے لئے) اللہ نے اسے معاف کر دیا اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو۔

بلوغ الارب میں اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ سے کہا 'یا رسول اللہ! بخدا جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا، جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے مجھے کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی، جاہلیت میں میری ایک بیٹی تھی، ایک روز میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے آراستہ کر دو، پھر میں اسے باہر لے گیا اور ایک جگہ پہنچ کر میں نے اسے پہاڑ پر سے نیچے گہری وادی میں دھکا دے دیا اس وقت میری بیٹی چلائی تھی

'ہائے ابا آپ نے مجھے مار ڈالا'

اب جب بھی مجھے اپنی بیٹی کے الفاظ یاد آتے ہیں مجھے کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقیناً سخت دلگرفتہ ہوئے ہوں گے تاہم انہوں نے فرمایا 'جو کچھ عہد جاہلیت میں ہو چکا اسے اسلام نے فنا کر دیا، اور جو کچھ اسلام میں ہوگا اسے استغفار فنا کر دے گی'۔

افسوس تو اس امر کا ہے کہ ہم اب بھی عہد جاہلیت میں زندہ ہیں، لڑکیوں کی پیدائش پر منہ لٹک جاتے ہیں، لڑکوں کی پیدائش پر لڈو بانٹتے ہیں______ حالانکہ بخدا ہمیں کیا معلوم کہ کون بہتر ہے، بہت سی بیٹیاں گھر والوں کے لئے بیٹوں سے بڑھ کر بہتر ثابت ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی کھلی کھلی بشارت کے باوجود اگر ہم اپنی جنتوں کو سمیٹنے کے بجائے، دھتکاریں، اور ان سے دور بھاگیں تو ہم واقعی بد نصیب ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اگر کوئی بیٹی بیوہ ہو کر یا مطلقہ ہو کر واپس اپنے ماں باپ کے گھر آ بیٹھتی ہے تو ایک واویلا مچ جاتا ہے، حالانکہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراقہ بن جعشم سے

فرمایا تھا:

''میں تمہیں بتاؤں صدقات میں سب سے بڑا صدقہ کیا ہے''؟

'ضرور بتائیے یا رسول اللہ ﷺ' انہوں نے عرض کیا

'تیری وہ بیٹی' رسول اللہ نے فرمایا' جو تیری طرف لوٹائی گئی (طلاق پا کر یا بیوہ ہو کر) اور تیرے سوا کوئی اس کے لئے کمانے والا نہ ہو'۔ (ابن ماجہ: بخاری)

....

ہم نے اپنی جنتوں (ثناء، سعدیہ اور رابعہ) کو سمیٹا اور بوجھل دل کے ساتھ گاڑی میں واپس آ بیٹھے۔ غار ثور کا راستہ سجاد بھائی کو معلوم نہیں تھا، کئی جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی، شام ہونے لگی تھی، رش کی وجہ سے ڈرائیونگ بھی مشکل تھی لہٰذا گاڑی کا رخ پھر گھر کی طرف پھیر دیا گیا۔

مجھے اس بات کا سخت افسوس رہا اور آج تک ہے کہ ہنوز غار ثور نہ دیکھ سکی۔ یہ غار مکہ معظمہ کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم زمانے میں مکہ سے یمن کو جو راستہ جاتا تھا وہ اس کے قریب سے ہو کر گذرتا تھا۔ جبل ثور مکہ سے تقریباً نو میل باہر ہے جبل نور کی نسبت اس کی اونچائی زیادہ ہے، اور اس پر چڑھنے کا راستہ بھی بہت خطرناک ہے جبل ثور کی چوٹی پر غار واقع ہے۔ جبل نور پر تو پھر بھی لوگ چڑھنے کی ہمت کر لیتے ہیں مگر جبل ثور پر بہت ہی کم لوگ چڑھتے ہیں اور جو لوگ چڑھتے ہیں وہ پانی اور کھانا ساتھ لے کر علی الصبح چڑھنا شروع کرتے ہیں تو دوپہر تک غار تک پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں ستاتے اور آرام کرنے کے بعد اترتے ہیں تو شام پڑنے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے زائرین کی کمی کی وجہ سے جبل نور کی طرح جگہ جگہ شیڈز بھی نہیں بنے ہوں گے۔ جہاں پانی بھی مل جاتا ہے، اور سایہ بھی لہٰذا جبل ثور پر چڑھنا جان لیوا عمل ہو سکتا ہے، اگر آپ کا پانی درمیان راستے میں ختم ہو جائے تو.........سنا ہے کہ کچھ لوگ نیچے گر کر جاں بحق ہو چکے ہیں اور سعودی حکومت وہاں جانے سے روکتی ہے لیکن پھر بھی غار ثور کو اندر سے دیکھنے کی تمنا آج بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

طائف

عید کے تیسرے دن ہماری واپسی تھی۔ ۵ اپریل یعنی ۳ شوال کو براستہ طائف ہم ریاض کے لئے روانہ ہوئے۔ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے جب ہم راحیلہ اور سجاد بھائی کو خدا حافظ کہہ کر ان کے گھر سے چلے انہوں نے ایک ہفتہ ہماری میزبانی کی تھی اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ راحیلہ نے اپنی طبیعت خرابی کے باوجود ہمارے آرام کا خیال رکھا اور سجاد بھائی نے اپنی نائٹ ڈیوٹیز کے باوجود ہمیں آثار مکہ کی زیارتیں کرائیں

مکہ سے طائف کئی راستے جاتے ہیں، ان میں سب سے مشہور سیل الکبیر ہے، یہ تقریباً وہی راستہ ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ ۱۰ ہجری کو طائف تشریف لے گئے تھے تاکہ بنوثقیف کے آگے اسلام پیش کریں اس سفر میں آپ ﷺ کے جانثار مولیٰ زید بن حارثہؓ آپ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ یہ راستہ عرفات، شداد، کرا اور ہدا سے ہوتا ہوا طائف جاتا ہے، ابتدائی راستہ میدانی ہے مگر کرا کے بعد بلند پہاڑی سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔

دوسرا راستہ، جس کا ہمیں نام نہیں معلوم تھا انتہائی پہاڑی علاقہ تھا، یہ راستہ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان سے گول گول چکر کھاتا اوپر ہی اوپر چلا جاتا تھا۔ یہاں سے ریاض کا فاصلہ بھی یک لخت بہت بڑھ جاتا تھا ہم غلطی سے اسی راستے پر آ گئے تھے۔ ہمیں اپنی غلطی کا اندازہ اس وقت ہوا جب ہمیں نیلے بورڈ پر یہ لکھا نظر آیا کہ 'ریاض ۱۰۲۶ کلو میٹر' یعنی ریاض مکہ سے ایک ہزار چھبیس کلو میٹر دور ہو گیا تھا۔ اگر ہم سیل الکبیر سے آتے تو مکہ سے ریاض کا فاصلہ ۸۷۰ کلو میٹر ہوتا۔

طائف کو وادی فاران کی جنت کہا جاتا ہے، یہ چھوٹا سا شہر سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ بلندی پر کوہ سراۃ میں ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ سردیوں میں یہاں خاصی سردی پڑتی ہے سنتے ہیں کہ سردیوں میں یہاں پانی جم جاتا ہے۔ طائف مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں ۸۸ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع

ہے طائف اور مکہ قبل از اسلام سے ہی توام شہر رہے ہیں قرآن میں بھی ان کے لئے قریتین (دو شہر) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں اسلام آباد اور راولپنڈی جڑواں شہر کہلاتے ہیں۔

پہلے اس شہر کا نام وج تھا، جب اس کے گرد فصیل بن گئی تو اس کا نام طائف پڑ گیا، وج نام کی ایک وادی غالباً اب بھی طائف میں موجود ہے کیوں کہ محمد عاصم صاحب نے اپنے سفرنامے میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ طائف میں بنوثقیف آباد تھے۔ زمین کی زرخیزی، اور شادابی نے ان باشندوں کو خاصا مغرور بنا دیا تھا۔ یہ لوگ لات، کے پرستار تھے اور اس دیوی کو خدا کی بیٹی کا مقام دیتے تھے، انہوں نے لات کا بڑا شاندار مندر بنا رکھا تھا۔ وہ اسے بیت اللہ کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ جب ابرہہ کعبہ ڈھانے کی غرض سے یمن سے مکہ جا رہا تھا تو طائف سے گذرا تھا اور اس شرط پر کہ اہل طائف اس کی مکہ تک راہنمائی کریں اس نے لات کے مندر سے تعرض نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا اہل طائف نے ابرہہ کو ایک راہبر دے دیا جو اس کے لشکر کو عرفات کے راستے سے مکہ تک لے آیا۔ (کہتے ہیں کہ طائف کا موجودہ سرکاری مہمان خانہ اس بت خانہ کی جگہ تعمیر ہوا ہے۔)

اہل طائف خاصے مالدار تھے، ان کی پیداوار مکہ کی منڈی میں بھی آتی تھی۔ اگر ایک طرف مالدار اہل مکہ بالخصوص بنوامیہ، طائف میں زمینیں خریدنے اور گرمیاں گذارنے آتے تھے تو طائف کے بہت سے امیر باشندے بھی تجارتی کاروبار کے سلسلے میں مکے میں بودوباش رکھتے تھے۔

خاندان بنوہاشم کی طائف میں رشتہ داریاں تھیں۔ بنوعبدہ یالیل کو رسول اللہ ﷺ کے ماموؤں کا خاندان کہا جاتا ہے۔ ابولہب کی بیٹیوں کی اہل طائف سے شادیاں ہوئی تھیں۔ حضرت عباسؓ کا بھی طائف میں کاروبار تھا۔ تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اہل مکہ سے مایوس ہوئے تو انہوں نے طائف کا رخ کیا۔

۱۰ نبوی کو جب آپ ﷺ شعب ابی طالب سے باہر آئے اور بنوہاشم کا تین سالہ محاصرہ اور سماجی مقاطعہ ختم ہوا تو چونکہ خدیجۃ الکبریٰؓ اور جناب ابوطالب خاصے بیمار اور کمزور ہو چکے تھے لہٰذا رمضان کے مہینے میں دونوں کی وفات ہوگئی۔ اس صدمے سے سنبھلنے کے بعد ۲۷ شوال ۶۱۹ء کو آپ ﷺ اپنے مولیٰ زید بن حارثہؓ کے ساتھ عازم طائف ہوئے۔ قدیم مسافت کے اعتبار سے طائف، مکہ سے تین منزل پر واقع تھا عرفات اور وادی نعمان کے پہاڑی راستے سے ایک رات کی مسافت تھی۔

اس زمانے میں یالیل (جن سے رسول اللہ ﷺ کی ننھیالی رشتہ داری تھی) مسعود ثقفی اور حبیب، بنی ثقیف کے سردار تھے آپ ﷺ نے ان تینوں سے ملاقات فرمائی آپ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ یہ لوگ اسلام قبول کرلیں تو طائف اسلام کا گڑھ اور مرکز بن جائے گا کیوں کہ اہل مکہ سے تو رسول اللہ ﷺ خاصے مایوس ہو چکے تھے؛ وہاں قبولیت اسلام کی شرح بہت مایوس کن تھی، دس سالوں میں ڈھائی، تین سو سے زائد افراد اسلام نہیں لائے تھے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا، اہل طائف کا رویہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بنوثقیف کے زعماء سے ملاقات کی مگر ان کا رویہ بڑا سرد اور ان کے جوابات انتہائی گستاخانہ تھے۔

یہی نہیں جب رسول اللہ ﷺ اہل شہر کو وعظ دینے کھڑے ہوئے تو شہر کے اوباش لوگوں نے آپ ﷺ کا مذاق اڑایا، اور اتنا شور کیا کہ آپ ﷺ وعظ نہ کہہ سکے، سرداروں کی شہ پر اوباش لڑکوں نے آپ کو اس باغ سے نکال دیا، جہاں آپ ﷺ وعظ کے ارادے سے گئے تھے، پھر آپ ﷺ کا پیچھا کیا، آوازیں کسیں، سیٹیاں بجائیں، یہاں تک کہ آپ کو پتھر مارے۔ آپ ﷺ کے جسم سے اتنا خون بہا کہ جوتے ایڑیوں سے چپک کر رہ گئے۔ یہی حال ان کے جانثار زید بن حارثہؓ کا ہوا۔ انہوں نے بھی اپنے آقا ﷺ کے دین کی خاطر گالیاں سنیں، اور پتھر کھائے اور زخم اٹھائے۔ اس وقت کے مخصوص قبائلی نظام کی وجہ سے آپ دونوں کی جان کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا آپ دونوں عتبہ بن ربیعہ کے باغ میں پناہ کے لئے داخل ہو گئے۔ اگر عتبہ چاہتا تو دونوں کو اپنے باغ سے نکال سکتا تھا۔ مگر اس کی عرب غیرت آڑے آگئی۔ عربوں کے اندر پناہ کے انعقاد کی ایک خاص اہمیت ہے اگر کوئی کسی سے پناہ کا طالب ہوتا ہے تو وہ ہر قیمت پر پناہ دیتا ہے۔ چاہے اس کو اس انعقاد پناہ کی بھاری سے بھاری قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ گو کہ رسول اللہ ﷺ نے عتبہ سے باضابطہ پناہ تو نہیں مانگی تھی۔ مگر جب آپ ﷺ اس کے باغ میں داخل ہو گئے تو عتبہ نے اپنے نصرانی حبشی غلام کے ہاتھوں آپ کو پانی اور کھانے کے لئے تازہ انگور کے خوشے بھیجے۔ عتبہ کا غلام یہ چیزیں لے کر آیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے صبر و استقامت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اسلام قبول کرلیا۔ وہ حبشی نصرانی غلام، سیدنا عداسؓ تھے۔

عتبہ کے اسی باغ میں جبرئیل حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر آپ ﷺ کہیں تو یہ پہاڑ ان کے اوپر اوندھا دیئے جائیں۔

"نہیں"، رسول اللہ ﷺ نے کہا "یہ سمجھتے نہیں ہیں"۔

اور انتہائی دلسوزی سے ان کی ہدایت کے لئے دعا کی۔

....

ہم انہی بلند وبالا پہاڑوں کے بیچ میں سے گذر رہے تھے۔ طائف کے پہاڑ، مکہ اور مدینہ کے پہاڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند و بالا ہیں تاہم ان میں مکہ کے پہاڑوں جیسی سنگلاخی، اور پتھریلا پن نہیں ہے۔

ترکوں نے اپنے دور حکومت میں اس جگہ جہاں رسول اللہ ﷺ نے پناہ لی تھی ایک خوبصورت سی مسجد بنادی تھی۔ جسے مسجد علی کہتے تھے۔ تاہم مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ خستہ حال ہو چکی ہے اور بند پڑی رہتی ہے۔

اگر رسول اللہ ﷺ اہل طائف سے بدلہ لینے کے لئے ان کی بستی پر ان کے پہاڑ اوندھا دیئے جانے کے امکان کو رد نہ کرتے تو آج یہ بستی، وادی محسر کی طرح، عذاب الٰہی کا نشانہ ہوتی۔ اس بستی کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ جاتا اور یہ صرف ایک نشان عبرت ہوتی مگر رسول اللہ ﷺ منتقم المزاج نہیں تھے، وہ تو تھے ہی سراپا رحمۃ العالمین۔

جس سڑک پر ہم جارہے تھے وہ جابجا پہاڑوں کو ہموار کر کے یا کاٹ کے بنائی گئی تھی اور گولائی میں بل کھاتی ہوئی بلندی تک چلی جاتی تھی یہ انتہائی خطرناک چڑھائی تھی۔ میں سجاد کو طائف کی تاریخ پر لیکچر دے رہی تھی، تا کہ وہ جاگتے رہیں اور ہوشیار رہیں۔ جگہ جگہ 'خطرناک موڑ' اور 'اندھے موڑ' کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور کی ذراسی بے احتیاطی مسافروں کو ہزاروں فٹ نیچے لا پٹخے، پھر نہ ہڈی ملے نہ چمڑا۔

خدا خدا کر کے یہ خطرناک سفر ختم ہوا اور ہم حدود طائف میں داخل ہونے لگے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں، سائن بورڈ، اور ٹریفک نظر آنے لگا۔ ہوا خوشگوار ہوگئی تھی۔ طائف میں داخل ہونے پر ہم نے اسے ایک جدید طرز کی خوبصورت سی بستی پایا۔ اب سعودی دور میں اس شہر نے گرمائی قیام گاہ کے طور پر بڑی ترقی کر لی ہے۔ یہاں کثرت سے یورپی اور امریکی بھی نظر آتے ہیں۔ یہ طائف کی وہ بستی نہیں تھی جو چودہ سو سال قبل رسول اللہ ﷺ اور زید بن حارثہؓ کے لئے بخت نامہربان

ثابت ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں محمد عاصم صاحب قابل قدر معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"موجودہ طائف سے ڈھائی، تین میل کے فاصلے پر جنوب مغرب کی سمت ثنیاۃ ایک چھوٹی سی بستی ہے اور طائف ہی کا ایک حصہ شمار ہوتی ہے یہ بستی اس جگہ واقع ہے جس کے قریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانہ میں اصل طائف آباد تھا۔ اس لئے ہماری دلچسپی کے آثار بھی یہیں تھے۔ ایک خاص چیز جو ہم نے یہاں پہنچ کر محسوس کی وہ یہ کہ اگرچہ یہاں اچھی خاصی آبادی تھی اور باغ، مکان، اور گلیاں نہایت شاندار بنی ہوئی تھیں لیکن یہاں کوئی آدمی ہمیں نظر نہ آیا۔ گویا پوری بستی شہر خموشاں تھی۔ یہ چیز ہم نے ہی محسوس نہ کی بلکہ بعد میں جب میں ہیکل کی کتاب 'فی منزل الوحی' دیکھی تو انہوں نے بھی اس میں اس بستی کی بے رونقی اور سنسان پن کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ ایک نبی اور وہ بھی خاتم النبیین ﷺ اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ٹھکرانے اور انہیں اذیت پہنچانے کی پھٹکار تو نہیں ہے"۔ (سفر نامہ ارض القرآن۔ ص ۱۷۹)

ہمارے پاس طائف شہر کا نقشہ نہیں تھا ورنہ سجاد بغیر کسی گائڈ کے ہمیں گھما دیتے، بدقسمتی سے ہمارا کوئی واقف کار بھی طائف میں رہائش پذیر نہیں تھا ورنہ اس سے آثار طائف دکھانے کی دردمندانہ درخواست کی جاتی۔ لہٰذا ہم یونہی طائف کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور جدید طائف کا نظارہ کرتے رہے۔

....

فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن رسول اللہ ﷺ سے مقابلے پر آئے تو بنو ثقیف ان کے ہمراہ تھے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا، ۱۰ نبوی کے واقعہ کے بعد سے اہل طائف نے قدم قدم پر مسلمانوں سے مقابلہ کیا اور ان کے حق میں قریش مکہ ہی کی طرح سنگدل ثابت ہوئے۔ مکے اور مدینے کی جنگوں میں اہل طائف ہمیشہ اہل مکہ کی تائید کرتے رہے تھے فتح مکہ پر اہل طائف بگڑ اٹھے، انہیں مکے کی منڈی اپنے ہاتھ سے جاتی نظر آئی لہٰذا وہ بنو ہوازن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے دو دو ہاتھ کرنے آ گئے۔

جب بنو ہوازن کو شکست ہوئی تو اہل طائف بھی پسپا ہو کر اپنے شہر میں محصور ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس محاصرے میں مسلمانوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ طائف کی فصیل بڑی مضبوط اور شاندار بنی ہوئی تھی۔ یہ کسی ایرانی انجینئر نے بنائی تھی۔ ایران کے کسی کسریٰ نے ایک طائفی تاجر کی درباداری سے خوش ہو کر اس کی منہ مانگی مراد پوری کی اور اس کی خواہش پر ایک ماہر

مہندس (انجینئر) اس غرض سے بھیجا کہ اس کی بستی کے اطراف میں ایک فصیل تعمیر کرادے۔ (تاہم شہر طائف کی موجودہ فصیل ترکی دور کی ہے) محاصرہ طائف کے دوران جہاں رسول اللہ ﷺ کا خیمہ تھا وہاں بعد میں ایک مسجد بنادی گئی جو مسجد ابن عباسؓ کہلاتی ہے اس کے بارے میں محمد عاصم صاحب معلومات دیتے ہیں۔

"یہ ایک نہایت وسیع اور پرانی بنی ہوئی مسجد ہے اس کے دائیں طرف ایک حجرے میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی قبر ہے۔ جس پر تالا لگا ہوا ہے اور کوئی شخص اسے جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مسجد کے بالکل سامنے جنوب مغرب میں ان صحابہ کرام کی قبریں ہیں جو غزوہ، طائف میں شہید ہوئے۔" (سفرنامہ ارض القرآن۔ ص ۱۸۱)

رسول اللہ ﷺ نے محاصرہ میں ناکام ہونے پر ان پہ معاشی دباؤ بڑھا دیا جس سے وہ پریشان ہوکر خود رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک وفد لے کر آئے اور اسلام قبول کیا جب رسول اللہ ﷺ طائف سے محاصرہ اٹھا کر مکہ واپس جارہے تھے تو راستے میں بنوثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفیؓ ملے اور اسلام لے آئے۔ محاصرہ کے وقت وہ جرش میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے اپنی قوم میں تبلیغ کرنے کی اجازت مانگی۔ طائف پہنچ کر بنی ثقیف کو جمع کیا اور بالا خانے پر کھڑے ہوکر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ چاروں طرف سے تیر برسے اور انہیں شہید کردیا گیا۔

سنہ ۹ ھ میں غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد رمضان کے مہینے میں بنوثقیف کا وفد مدینے حاضر ہوا۔ ان کا امیر وہی عبد یا لیل تھا، جو رسول اللہ ﷺ کا رشتہ میں ماموں ہوتا تھا۔ اور جس نے ۱۲ برس قبل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بڑا افسوسناک معاملہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعا کے نتیجے میں یہ لوگ مدینے آکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور واپس جاکر تمام اہل طائف کو دائرہ اسلام میں لے آئے۔

مجھے طائف کے ان تمام تاریخی آثار کو دیکھنے کی شدید خواہش تھی مگر کچھ ایسے مسائل تھے کہ ہم طائف میں رک نہ سکے۔ طائف کے آثار کا مشاہدہ کرنے کے لئے ایک دن کا قیام کافی ہوتا ہے۔ کیوں کہ وادی ثنیاۃ میں وہ تمام تاریخی آثار مل جاتے ہیں باقی جدید شہر بھی چھوٹا سا ہے جسے مختصر وقت میں گاڑی میں گھوما جاسکتا ہے۔

۱۹۹۳ء کے رمضان المبارک میں جب ہم چوتھی بار حرم شریف گئے تب بھی طائف سے گئے

تھے، یہاں اہل نجد کا میقات ہے جو قرن المنازل کہلاتا ہے۔ میقات جس وادی میں ہے اسے وادی محرم بھی کہتے ہیں۔ اس وادی کا یہ نام اس لئے پڑا کہ محاصرہ طائف کے بعد مکہ معظمہ جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ میقات کی یہ انتہائی وسیع وعریض مسجد ہے اور انتہائی شاندار بھی۔

شہر طائف کی سڑکوں پر ہم گھومتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سر سبز اور خوبصورت بستی ہے۔ پھلوں کے باغات، جدید عمارات، کشادہ سڑکیں، پر رونق بازار، انتہا درجے کی صفائی، اور سب سے بڑھ کر انتہائی خوشگوار اور آلودگی سے پاک آب وہوا۔ دن کے دس بج رہے ہوں گے جب ہم نے طائف کے ایک پیٹرول پمپ سے ٹنکی بھروائی اور ریاض جانے کے لئے ہائی وے پر آگئے۔ یہاں سے ریاض نوسو کلومیٹر تھا۔ سارے دن کا سفر کرکے ہم رات گئے ریاض پہنچ گئے۔ حرم سے آنے کے باوجود دل وہیں اٹکا رہا۔ مکے سے نکلتے ہوئے ہم نے دعا کی کہ ہمیں جلد ہی دوبارہ آنا نصیب ہو۔ قبولیت کی گھڑی تھی۔ سوا دو ماہ بعد ہم حج کرنے کے لئے پھر حرم پہنچے۔ حج کی ادائیگی کے بعد واپسی پر پھر وہی دعا خشوع و خضوع سے مانگی کہ ہمیں پھر حرم آنا نصیب ہو۔ میرے دل کی خواہش یہ تھی کہ کسی ایسے مہینے میں یہاں آکر عبادت کی جائے جب رش نہ ہو، تھوڑی تنہائی، تھوڑی یکسوئی نصیب ہو، پانچ ماہ بعد پھر ہم تھے اور پھر وہی جنت نظیر حرم کی گلیاں۔

نومبر۔ دسمبر کے مہینے میں عمرہ کا اپنا مزہ آیا۔ رش کم تھا، موسم بہت اچھا تھا۔ بلکہ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ چار پانچ دن کا یہ مختصر سا وقت حرم میں گذار کر جب ہم واپس جانے لگے تو پھر وہی دعا مانگی، لہٰذا پھر رمضان میں بلاوا آگیا۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے نصیب پر رشک آنے لگتا۔ حرم کا یہ سفر نامہ میں اس دعا پر ختم کرتی ہوں کہ خدایا مجھے بار بار اپنے اور اپنے حبیب کے شہر میں بلانا، ان جنت نظیر گلیوں میں پھرانا اور وہیں کے کسی قریے یا کوچے میں میری جان سلب کرلینا اور جنت البقیع یا جنت المعلیٰ کی مٹی میرے نصیب میں لکھ دینا۔ (آمین۔ ثم آمین)

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد

اضافہ

پانچواں سفر ۱۹۹۷ء

وہی راستے وہی مرحلے

(مکہ......جدہ......مدینہ)

۳ جولائی ۱۹۹۷ء بروز جمعرات ہم ایک بار پھر سفر کے لئے نکلے' اصل مقصد تو عمرہ کی ادائیگی ہی تھا مگر یہ بھی ذہن میں تھا کہ کچھ آثار جو ابھی تک نہیں دیکھ سکے تھے' دیکھنے کی کوشش کی جائے اور ممکن ہو تو مدینہ سے آگے بڑھا جائے۔ خیبر اور مدائن صالح تک جایا جائے۔ سجاد کے پاس صرف ایک ہفتے کی چھٹی تھی البتہ ٹریول لیٹر جس کے بغیر سعودی عرب کے ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جایا جاسکتا' وہ انہوں نے پوری مملکت کا لے لیا تھا اور دورانیہ بھی ایک سال کا تھا یعنی اب ایک سال تک ہم پوری مملکت سعودی عرب کے جس شہر میں جانا چاہیں جاسکتے تھے۔

جمعرات کو سجاد ایک گھنٹہ قبل ہی دفتر سے آگئے اور کھانا کھا کر سو گئے چونکہ انہیں ساری شام اور پھر ساری رات ڈرائیونگ کرنی تھی لہٰذا اس وقت ان کا سونا بہت ضروری تھا۔ میں سفر کا تقریباً سارا انتظام کرچکی تھی' چھوٹے موٹے جو کام رہ گئے تھے ان کو سمیٹتی رہی اور یوں شام پونے چھ بجے ہم مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ دن شدید گرم تھے' اس دن بھی ریاض کا درجہ حرارت 44C تھا لہٰذا سفر کے لئے شام کا وقت رکھا گیا۔ ہمارے ابتدائی تین گھنٹے ریاض ہی میں صرف ہوگئے۔ پہلے بینک سے رقم نکلوائی گئی چونکہ مکہ میں ہمیں سجاد بھائی اور راحیلہ کے یہاں ٹھہرنا تھا لہٰذا انہیں فون کرکے اطلاع دی گئی۔ کچھ وقت گاڑی کے چیک اپ میں لگ گیا اور کچھ وقت درست شاہراہ کی تلاش میں۔ بہرحال رات کے ساتھ ہائی وے پر ہمارا سفر شروع ہوا۔ رات میں صحرا کا سفر کیسا ہوتا ہے؟! اس کی تفصیل آپ اس سفرنامے کے ابتدائی ابواب میں پڑھ ہی چکے ہیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہم رات بھر سفر کرتے رہے' صبح فجر کی نماز کے بعد سجاد کو باقاعدہ نیند آنے لگی لہٰذا طے کیا گیا کہ ہائی وے پر بنے ہوئے کسی ہوٹل میں ایک کمرہ چند گھنٹوں کے لئے کرایہ پر لے کر تھوڑا سویا جائے اور

اماں حوا کا مقبرہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ شہر زمانہ قبل اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام سے کئی سو برس قبل بنوخزاعہ کا عمرو بن لحی جو مکے میں بت پرستی کا بانی تھا جدے ہی سے بت لے کر مکہ آیا تھا۔

جدہ کی حقیقی اہمیت کا آغاز سیدنا عثمانؓ کے عہد خلافت میں ہوا جب سیدنا عثمانؓ نے پرانی بندرگاہ الشعیبہ کی جگہ جدہ کو مکہ کی بندرگاہ قرار دیا۔ اسلامی دنیا کا مرکز ہونے کی وجہ سے مکہ ایک عظیم درآمدی شہر بن گیا تھا جس کا سامان تجارت' جدے کے راستے مصر اور ہندوستان سے آنے لگا۔

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں جدہ ایک خوشحال تجارتی شہر تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں ابن جبیر اس شہر کی تصویر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں گھانس پھونس کے جھونپڑے' پتھر کی بنی ہوئی سرائیں اور مسجدیں ہیں۔

عباسی خلافت کے زوال کے بعد جو تجارت بصرہ کے ذریعے ہوتی تھی اس کا رخ اب جدے کی طرف مڑ گیا۔ بحری جہاز مصر سے سونا' معدنیات اور یورپ سے اونی کپڑے لے کر جدے میں ان جہازوں سے ملتے تھے جو ہندوستان سے عطریات، رنگ، چاول، شکر، چائے، غلہ اور قیمتی پتھر لے کر آتے تھے۔ جدہ کو اس سامان تجارت سے دس فیصد محصول وصول ہوتا تھا نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں مصر کے مملوک سلاطین جدہ کی خوشحالی پر للچانے لگے اور وہاں کے محاصل کی وصولی اپنے ہاتھ میں لے لی اور یوں سیاسی اور معاشی طور پر جدہ' مصر کا دست نگر ہو گیا۔

اس کے بعد جب مشرقی سمندروں میں پرتگیزوں کی آمد شروع ہوئی تو جدہ کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا لہٰذا مملوک سلطان کی طرف سے ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں جدہ شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کی گئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پرتگیزوں کے دو حملے ناکام ہوئے۔ جدہ صدیوں تجارت کا اہم مرکز بنا رہا یہاں ہر عہد میں مقامی لوگ کم اور غیر ملکی زیادہ ہوتے تھے آج بھی یہی صورت حال ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۳۳۴/۱۹۱۶ء میں جب شریف حسین نے عربوں کی خودمختاری کا اعلان کیا تو جدہ پہلا شہر تھا جو اس کے قبضہ میں آیا۔ عربوں کی بغاوت کے دوران' شریف کی افواج کے لئے جو کہ ترک افواج سے لڑ رہی تھیں جدہ سب سے بڑی رسدگاہ بن گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جدہ کی تجارت زوروں پر ہے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں شہر کی فصیل گرادی گئی تھی اور شہر کو تین اطراف میں وسعت دی گئی۔ شمال میں مدینہ جانے والی سڑک کے ساتھ جنوب

میں بندو والی سڑک کے ساتھ اور مشرق میں مکہ جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ

☆☆☆☆

ہم اسی جدہ کی طرف عازم سفر تھے آج کا جدہ ایک انتہائی جدید' خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے جس کے مغربی کونوں سے بحر احمر (Red Sea) کی موجیں سر ٹکراتی ہیں اس وجہ سے جدہ کا موسم، کراچی کے موسم جیسا ہے جہاں نمی خاصی ہوتی ہے اور پسینہ خشک نہیں ہوتا۔

جدہ میں پہلے ہم سجاد کے دوست خورشید کے گھر گئے۔ کچھ دیر ان کے ساتھ گزار کر فاروق لاکھانی صاحب کے ساتھ رات کے کھانے کے لئے چلے گئے یہ بھی سجاد کے دوست ہیں اور سعودی فرانسیسی بینک جدہ سے وابستہ تھے۔ ان کی فیملی پاکستان گئی ہوئی تھی لہٰذا وہ ہمیں ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ کھانا پرتکلف اور مزیدار تھا جب ہم کھانا کھا کر باہر نکلے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کراچی میں گلشن اقبال کے کسی ریسٹورنٹ سے باہر آ رہے ہوں۔ سامنے جو گاڑیاں کھڑی تھیں ان میں سے پاکستانی یا انڈین ہی اتر رہے تھے۔ قطار سے جو دکانیں اسنیک بار اور ریستوران تھے ان میں کام کرنے والے سب کے سب یا اہل شلوار قمیض تھے یا اہل پاجامہ۔ اور تو اور کونے میں جو موچی بیٹھا تھا وہ بھی اپنا پٹھان بھائی تھا۔ شہر جدہ کے اس سارے منظر میں جو چیز اجنبی تھی وہ دیوار کے ساتھ کھڑا ایک شخص تھا جس نے سعودی لباس میں سفید توپ اور غترہ پہنا ہوا تھا۔

اتنے ٹھیٹھ پاکستانی ماحول میں یہ سعودی کیا کر رہا ہے؟'' میں نے سجاد سے پوچھا۔''

''یہ سعودی نہیں ہے' غور سے دیکھو' پاکستانی ہے' بس بات اتنی ہے کہ آج اس کا شلوار قمیض پہننے کا موڈ نہیں تھا۔'' سجاد نے جواب دیا

''یہ سارا علاقہ پاکستانی ہے'' فاروق لاکھانی صاحب نے وضاحت کی ''یہیں پاکستانی ایمبسی اسکول ہے اس کی وجہ سے ہی زیادہ تر پاکستانی خاندان یہیں کی رہائش کو ترجیح دیتے ہیں۔'' اس کے بعد لاکھانی صاحب کی معیت میں رات گئے ہم قمر حمید قمر کے گھر پہنچے۔ یہ پہلے ریاض میں ہوتے تھے۔ وہیں سید ابوظفر صاحب کے یہاں منعقد ہونے والی ادبی نشستوں میں ان سے اور ان کی بیگم پروین سے ملاقات ہوئی جو دوستی میں بدل گئی۔ قمر خوبصورت شعر کہتے ہیں اردو کے حوالے سے ان کا ایک نمایاں کام یہ بھی رہا کہ ''مشرق وسطیٰ میں اردو'' کے مرتبین میں شامل ہیں۔ یہیں نعیم بازید پوری بھی آئے ہوئے

تھے۔ یہ بھی جدہ کے اہم شعرا میں سے ہیں۔ سعودی عرب کے واحد اردو اخبار ''اردو نیوز'' سے وابستہ ہیں۔

قمر بھائی جدہ میں میری موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایک ادبی نشست رکھنا چاہتے تھے لیکن ہمارا شیڈول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ہم دوبارہ جدہ آتے۔ کل ہماری مدینہ روانگی تھی۔ اس کے بعد خیبر، مدائن صالح اور پھر واپس ریاض کہ ہفتہ کو سجاد کو ڈیوٹی پر بھی جانا تھا۔

''بس تو ایک مختصر سی نشست ہم ابھی کر لیتے ہیں'' قمر بھائی نے فیصلہ سنا دیا ایک چھوٹی سی شعری نشست دیر تک جمی رہی۔ جس میں نعیم بازید پوری نے اپنی نظمیں، (ان کی نظمیں لاجواب ہوتی ہیں) قمر حیدر قمر نے اپنی غزلیں اپنے مخصوص اتار چڑھاؤ کے ساتھ سنائیں۔ ایک غزل ایک نظم اور کچھ ماہیئے مجھے بھی سنانے پڑے۔ چائے کے دور بھی چلتے رہے اور گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ یوں ہم قمر بھائی اور پروین بھابی کی پر لطف صحبت سے رات گئے ہی اٹھ سکے۔ جب ہم گھر (مکہ) واپس پہنچے تو ڈھائی بج چکے تھے چونکہ سجاد بھائی سے ایک چابی ہم نے لے لی تھی لہٰذا گھر والوں کو تنگ کئے بغیر اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔

پیر ے جولائی کو ہم مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمارا ارادہ صبح ہی نکلنے کا تھا لیکن راحیلہ نے دوپہر کے کھانے کے لئے روک لیا گرمی کی شدت کو دیکھتے ہوئے ہم نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ کم از کم بارہ ایک بجے کے بعد ہی سفر شروع کریں لہٰذا دوپہر کا کھانا کھا کر اور ظہر کی نماز پڑھ کر ہم عازم مدینہ ہوئے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان چار سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے جو باآسانی پانچ گھنٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے لیکن اس دفعہ ہماری گاڑی ہمیں برق رفتاری کی اجازت نہیں دے رہی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم رات گیارہ بجے کے قریب مدینہ پہنچے۔ جہاں ادریس بھائی حسب سابق مسجد نبوی کے سامنے والے ٹیلی فون بوتھ کے قریب تقریباً گھنٹہ بھر سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میری خواہش تھی کہ ادریس بھائی ہمیں کسی مناسب ہوٹل کا راستہ بتا دیں جہاں سے حرم اتنا نزدیک ہو کہ ہم باآسانی جب دل چاہے اٹھ کر مسجد نبوی میں جا سکیں لیکن انہوں نے بتایا کہ چوہدری جان محمد صاحب انتظار کر رہے ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ میں آپ لوگوں کو لے کر انہی کے پاس پہنچوں۔ یوں ہم چوہدری جان محمد صاحب کے یہاں جا پہنچے جو رات نو بجے سے ہمارا انتظار کر کر کے اب سو چکے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر جگائی ہو گئی۔ اور ان کی بہو ہمارے کھانے کے بندوبست میں لگ گئیں میں نے ان سے دست بستہ عرض کی کہ ہمیں مسجد نبوی کے قریب کسی ہوٹل میں

ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔

''یہ جگہ بھی مسجد سے نزدیک ہی ہے سات منٹ میں آپ مسجد پہنچ سکتی ہیں۔'' چودھری صاحب نے کمال اطمینان سے کہا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ یہ فاصلاتی جمع تفریق، چودھری صاحب نے اپنے حلیہ جثے کے اعتبار سے بتائی تھی ورنہ میرے لئے یہ راستہ سات کے بجائے چودہ منٹ کا نکلا کیونکہ چوہدری صاحب کا ایک قدم ہمارے دو قدموں کے برابر تھا۔ بہر حال جس خلوص، محبت سے وہ ہمیں اپنے یہاں رُکنے پر اصرار کر رہے تھے اس کو رد کرنا سوء ادب اور بدتمیزی ہوتا لہٰذا ہم نے وہیں ڈیرا ڈال دیا۔ رات کے کھانے پر چوہدری صاحب کی فیملی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی بیگم تو پاکستان گئی ہوئی تھیں البتہ ان کے بیٹے شفیق جوانہی کی طرح بن لادن کمپنی سے وابستہ ہیں کی بیوی اور بیٹی طاہرہ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں میں مدینہ آئے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ بھی انہوں نے دو تین ماہ کے لئے کرایہ پر لیا تھا سارا سال وہ بن لادن کمپنی کی طرف سے فراہم کی گئی رہائش گاہ میں رہتے ہیں جب فیملی آتی ہے تو وقتی طور پر کوئی فلیٹ کرایہ پر لے لیا جاتا ہے۔

''پانچ دفعہ میں یہ پانچواں گھر ہے باجی'' چوہدری صاحب کی بہو نے صبح ناشتہ کی میز پر مجھے بتایا ''ہر دفعہ ہم ایک نئے گھر میں آتے ہیں بس مسافروں کی طرح رہنا پڑتا ہے۔'' ٹھیک ہی ہے اس خود ساختہ ''جلاوطنی'' کے دکھ تو ہوتے ہیں، خاندان تقسیم ہو جاتے ہیں۔ مالی ''آسودگی'' کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

اس دن ظہر کی نماز ہم نے مسجد نبوی میں ادا کی وہاں پہنچنے پر مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب آخری بار ۹۳ء میں یہاں آئی تھی تب ہر طرف تعمیرات ہو رہی تھیں اب وہ تعمیرات کافی حد تک مکمل ہو چکی تھیں جس کے نتیجے میں وسیع و عریض دو منزلہ انڈر گراؤنڈ پارکنگ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ مسجد نبوی کی دیواروں سے لے کر جنت البقیع تک کا پورا علاقہ ماربل کے پختہ فرش کے نیچے آ چکا تھا' خواتین اور مردوں کے لئے الگ الگ وضو گاہیں بن چکی ہیں جن کا فاصلہ مسجد نبوی سے خاصا کم تھا۔ خود جنت البقیع کے چاروں طرف سرخی مائل' خوبصورت جالی دار دیواریں اٹھ چکی تھیں اردگرد کی ساری سابقہ سڑکیں' ماربل کے پختہ فرش کے نیچے دفن ہو چکی تھیں۔ ہم پارکنگ میں پہنچے جہاں سیکڑوں گاڑیوں کو کھڑا کرنے کی گنجائش ہے چونکہ پارکنگ کی اجرت لی جاتی ہے لہٰذا یہ ایک مستقل ذریعہ آمدنی ہوگا کیونکہ آنے والے

زائرین کی تعداد میں کمی کا کوئی امکان نہیں۔

یہاں گاڑی پارک کر کے ہم اوپر پہنچے۔ اوپر جانے کے لئے خواتین اور مردوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں اوپر پہنچے تو اذان ہو رہی تھی میں اور سعدیہ باب النساء کی طرف بڑھ گئے جو یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا جبکہ سجاد اور سعود سامنے والے دروازے سے مسجد نبوی میں داخل ہو گئے۔ مسجد نبوی میں یہ میری تیسری حاضری تھی۔ اس بار مسجد میں رش بہت کم تھا ہم با آسانی اگلی صفوں تک پہنچ گئے جس کے آگے لکڑی کا Barrier رکھا گیا تھا اور دوسری طرف مردوں کی صفیں تھیں۔ دو رکعت تحیۃ المسجد کے بعد چار رکعت فرض جماعت کے ساتھ ادا ہوئی۔ نمازوں سے فارغ ہو کر میں نے مسجد کے صفائی کے عملہ کی ایک پاکستانی لڑکی سے پوچھا! تو پتہ چلا کہ خواتین کے لئے ریاض الجنۃ کے لئے دروازہ ڈیڑھ بجے کھلے گا۔

ڈیڑھ ہی بجے میں نے سجاد کو باہر ملنے کا وقت دیا تھا لہٰذا اس وقت تو میں باہر آ گئی باہر نکلتے ہی سجاد مل گئے ان کے ہاتھوں میں چپلوں کا ایک جوڑا تھا۔ ''سعود کہاں ہے؟'' سجاد کو اکیلے دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔

''وہ دروازے پر بیٹھا ہے اس کی چپل کھو گئی، نئی خرید کر لا رہا ہوں''

ہم جب مسجد کے دوسرے دروازے پر پہنچے تو سعود سیڑھیوں پر ننگے پاؤں بیٹھا نظر آیا زمین اتنی گرم تھی کہ اس پر پاؤں رکھنا' پیروں کو آبلوں سے بھرنے کے مترادف ہوتا۔ باب جبرئیل نزدیک ہی تھا وہاں خواتین کا غیر معمولی رش نظر آیا۔

''یہ عورتیں ریاض الجنۃ میں داخلے کے لئے کھڑی ہیں' تم بھی چلی جاؤ' دیکھو شائد آج موقع مل جائے۔'' سجاد نے اطلاع دی۔ میں خود اسی فکر میں تھی لہٰذا سعدیہ کے ساتھ خواتین کی بھیڑ میں شامل ہو گئی دروازہ کھلا تو میں تیز تیز قدم اٹھاتی ریاض الجنۃ میں پہنچ گئی' میرے سامنے جب لکڑی کا Barrier آ گیا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ سامنے چند فٹ کے فاصلے پر منبر رسول تھا، مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال میں پلٹی تو خواتین کی صفیں بن چکی تھیں مجھے دوسری صف میں جگہ ملی اور میں عبادت میں مصروف ہو گئی۔ یہ موقع مجھے بڑی مشکل سے اور بار بار کی حاضری کے بعد ملا تھا۔ ضائع کیوں جانے دیتی............؟

☆☆☆☆☆☆

بدر کی بستی

وہ ۸/جولائی ۹۷ء کا ایک گرم دن تھا۔ وقت بھی دوپہر کا تھا۔ جب ہم بدر کی بستی دیکھنے کے لئے نکلے۔ اس دن مدینہ کا درجہ حرارت ۴۶°c تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم لوگوں نے چودھری صاحب سے اجازت لی، اس سفر میں ادریس بھائی ہمارے ساتھ تھے۔ اس سے قبل ہم تین دفعہ مدینہ آئے تھے مگر بدر جانے کا موقعہ نہ مل سکا تھا

بدر کی بستی مسجد نبوی سے تقریباً ایک سو پچپن (۱۵۵) کلومیٹر کے فاصلے پر ہے یہ اندازا ہم نے اپنی گاڑی کی میٹر ریڈنگ سے لگایا، شہر مدینہ سے باہر نکلے اور اس سڑک پر آئے جو بدر کو جاتی تھی، ابتداء ہی میں چیک پوسٹ پر ہماری گاڑی رکوالی گئی۔ سجاد اور ادریس بھائی قریبی ٹریفک پولیس کے دفتر میں بات چیت کے لئے گئے۔ چونکہ ہمارے پاس پوری مملکتِ سعودی عرب میں کہیں بھی جانے کا اجازت نامہ تھا اس لئے قدرے بے فکری تھی، اس کے باوجود دونوں خاصی دیر لگا کر آئے، اتنی سخت چلچلاتی دھوپ میں بھی مرور (ٹریفک پولیس) کو نہ کوئی جھنجھلاہٹ تھی نہ کوئی جلدی۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

''نماز پڑھ رہے تھے'' سجاد نے جواب دیا

''ہیں!'' ہم اچھل پڑے۔ ''یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، یہاں گرمی میں ہمارا حشر ہو گیا''

''بس انہیں ہمارے اسلام پر شبہ تھا، لہٰذا اپنے ساتھ عصر پڑھوائی''

سجاد اور ادریس بھائی دونوں محظوظ ہو رہے تھے

بہر حال بدر کی طرف سفر شروع ہوا۔ یہ سڑک بہت چوڑی نہیں تھی۔ سڑک کے بیچ میں فٹ پاتھ بھی نہیں تھا۔ تیز رفتاری خطرناک ہو سکتی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں جلدی جلدی منظر بدل رہے تھے۔ کبھی صرف سنہری ریت ہی ریت نظر آتی، کبھی پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، کبھی نخلستانوں کا، ابتداء

مزارات شہدائے بدر (بشکریہ تسبیحہ شفیق)

قدیم مسجد عریش

میں کئی جگہ تعمیراتی کاموں کا سلسلہ بھی نظر آیا۔

ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے دراصل بحر احمر کی طرف جارہے تھے یہ سفر مدینہ سے مغرب کی طرف کا تھا۔ اگر آپ نقشہ دیکھیں گے تو آپ کو صحیح اندازا ہو جائے گا۔ بدر، یمن سے شام جانے والی تجارتی شاہراہ پر پڑتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اسکی اہمیت تھی۔

راستے میں ہمیں دائیں اور بائیں چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آئیں، سڑک پر ان بستیوں کے نام کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ یہ سب بستیاں ایک جیسی ہی تھیں، وسیع گھنے کھجوروں کے باغات، پیلی مٹی کے بنے ہوئے مکانات اور بس۔ ایسی بستیاں مجھے بڑی رومانوی لگتی ہیں، رہنے والوں سے اس رومانویت کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ مگر اب صورت حال یہ ہے کہ یہ بستیوں سے زیادہ باغات اور کھیت کی حیثیت میں رہ گئے ہیں۔ سعودی عرب میں تیل کی دریافت کے بعد آنے والی دولت نے شہروں کو آباد اور ان دیہی بستیوں کو ویران کر دیا ہے۔ اب ان بستیوں میں آبادیاں نہیں ہیں، زیادہ تر شہروں میں منتقل ہو گئی ہیں، البتہ باغات جن کی جائیداد ہیں، انہوں نے اپنے ملازمین وہاں رکھ چھوڑے ہیں جو ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔

ہمارے دائیں بائیں طیبہ، الحمراء، خرما اور حسینیہ نامی بستیاں گزرتی رہیں، اگر اس راستے سے سڑک کو غائب کر دیں تو وہ ایک سخت پتھریلا اور دشوار گزار راستہ رہ جاتا ہے میں سوچتی اور بچوں کو بتاتی رہی کہ یہی وہ دشوار گزار راستہ تھا جس پر رسول اللہ اپنے تین سو سے کچھ اوپر ساتھیوں سمیت گزرے تھے، اور انتہائی بے سروسامانی سے گزرے تھے، ان میں صرف دو گھوڑے تھے اور بار برداری کے لئے کچھ اونٹ، زیادہ تر پا پیادہ تھے، انہی میں رسول اللہ بھی تھے، ان کے جانثار مہاجرین بھی، اور دیوانہ وار فدا ہونے والے انصار بھی۔

تاریخ کے صفحات میرے ذہن میں پلٹنے لگے۔ مکہ میں تیرہ سال کی انتھک جدوجہد کے باوجود اسلام کو وہ قبولیت نہ ملی جو مدینہ میں حاصل ہوئی جہاں دو سال کے اندر اندر قابل ذکر تعداد مسلمان ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ یہ صورت حال قریش کے لئے قطعی قابل قبول نہیں تھی۔ ہجرت کے نتیجے میں مسلمانوں کو ایک وسیع و سرسبز علاقے میں ایک محفوظ ٹھکانہ ہی میسر نہیں آرہا تھا بلکہ قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو
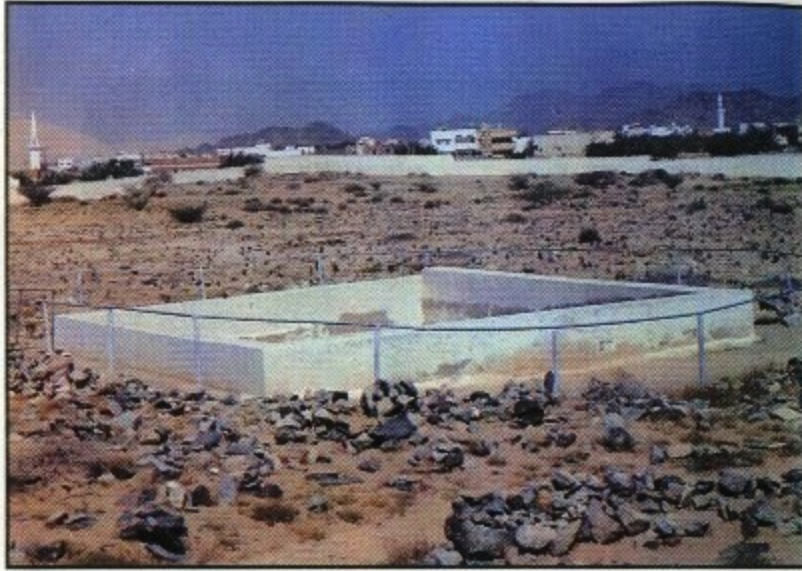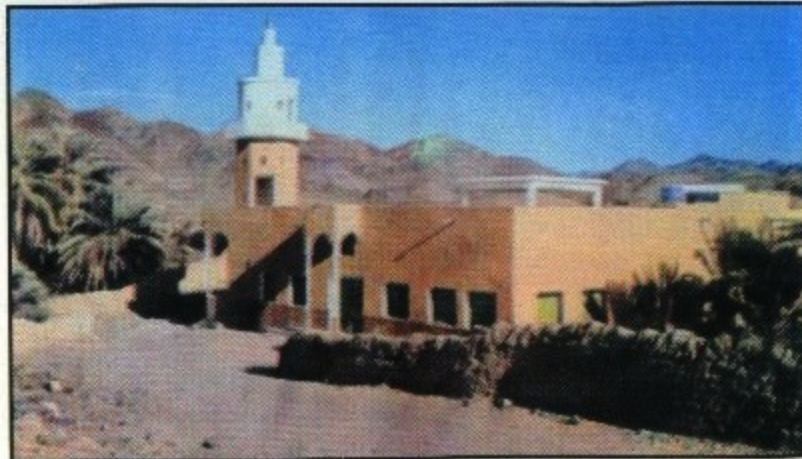
بدر میں واقع مسجد عریش۔ جس کی تعمیر ۱۹۹۶ء میں مکمل ہوئی
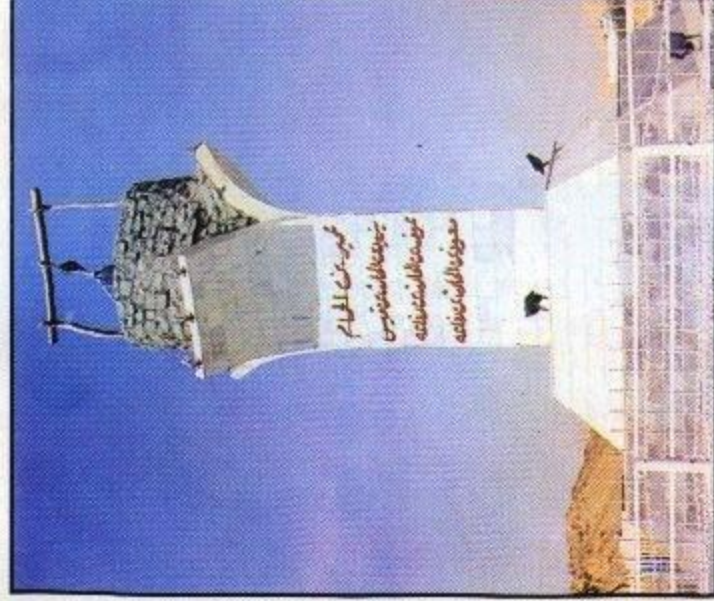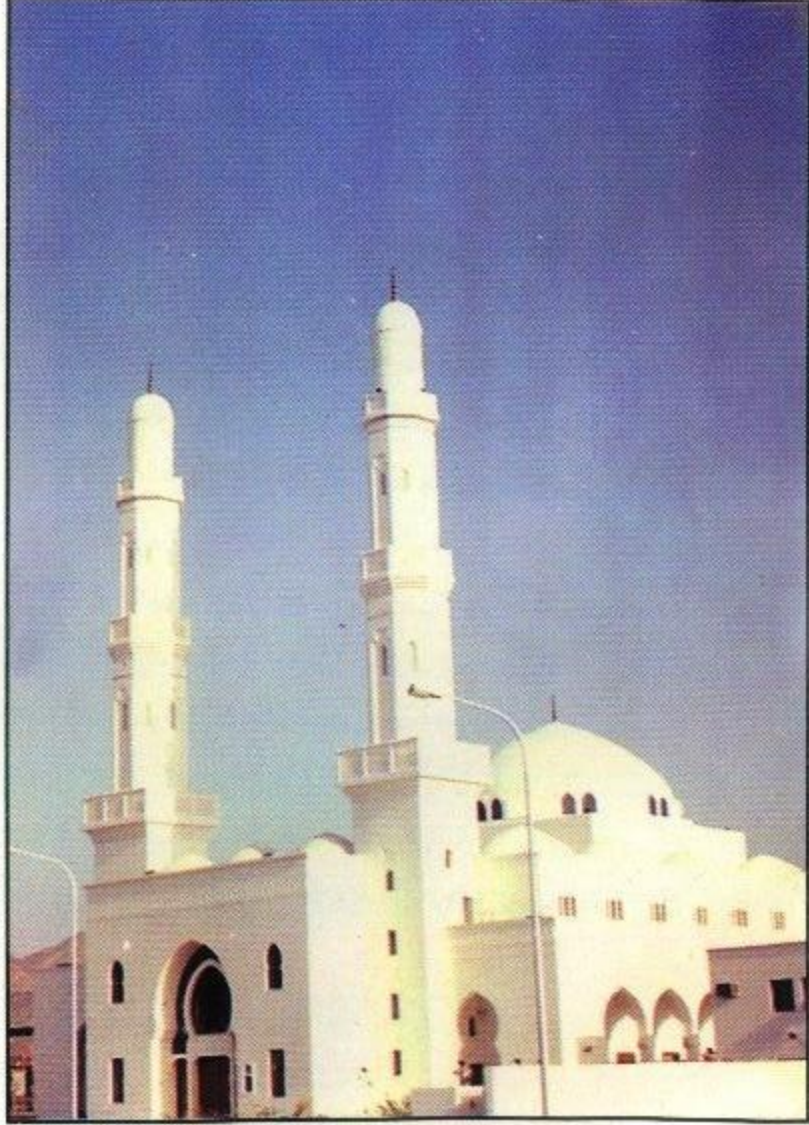
شہدائے بدر کی جدید یادگار کے سامنے (۸ جولائی ۱۹۹۷ء)

پرانی یادگار شہدائے بدر (بشکریہ تحقیق)

تجارتی شاہراہ، بحر احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی، جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا وہ مسلمانوں کی زد میں آجاتی تھی۔ صرف اہل مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی، طائف اور دوسرے مقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔ مسلمانوں کے مدینہ میں جم جانے کا مطلب یہ تھا کہ قریش کی معاشی شہ رگ مسلمانوں کی گرفت میں آجاتی۔

یہ صورت حال قریش کے لئے قطعی نا قابل برداشت تھی لہذا رسول اللہ کو مدینہ جانے سے روکنے کے لئے وہ انتہائی حربے یعنی ان کے قتل تک پر آمادہ ہو گئے، لیکن اللہ تعالی نے ان کی تدبیر انہی پر پلٹ دی اور رسول اللہ، اپنے رفیق سیدنا ابوبکر صدیق کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔

رسول اللہ کی ہجرت کے ساتھ ہی دونوں شہروں کے درمیاں گویا جنگی حالات پیدا ہو گئے، قریش نے عبداللہ بن ابی سے ساز باز کی کہ اہل مدینہ کسی طرح ان مسلمانوں کو مدینہ سے نکال دیں، مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی، بلکہ اہل مدینہ نے رسول اللہ کو اپنا قائد اور سربراہ بنا لیا۔ منشور مدینہ بھی ہوا اور وقت ضائع کئے بغیر رسول اللہ نے اردگرد کے قبائل سے بھی عدم جارحیت کے معاہدے کئے۔

اس معاملہ میں رسول اللہ نے انتہا درجہ کی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ وہ تجارتی شاہراہ کی اہمیت سے واقف تھے لہذا اس ضمن میں انہوں نے دو اہم تدابیر اختیار کیں ایک تو یہ کہ مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیاں اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم کسی جنگ کی صورت میں غیر جانبداری کے معاہدے کر لئے۔ لہذا سب سے پہلے جُہینہ سے جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقہ میں ایک اہم قبیلہ تھا، معاہدہ ناطرفداری طے ہوا۔ یعنی جنگ کی صورت میں اگر وہ مسلمانوں کی مدد نہیں کرتے تو نہ سہی، کفار مکہ کی بھی نہیں کریں گے۔ پھر ۱ھ کے اواخر میں بنی ضمرہ سے، جن کا علاقہ ینبوع اور ذوالعشیرہ سے متصل تھا دفاعی معاہدہ (Defensive alliance) کی قرارداد ہوئی۔ پھر دو ہجری کے وسط میں بنی مدلج بھی اس قرارداد میں شریک ہو گئے کیونکہ وہ بنی ضمرہ کے ہمسائے اور حلیف تھے۔

دوسری تدبیر آپ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس تجارتی شاہراہ کی طرف پیہم چھوٹے دستے بھیجنے شروع کئے اور بعض دستوں کے ساتھ آپ خود بھی

تشریف لے گئے ۔ ان دستوں کو مغازی کی کتابوں میں سریہ اور غزوہ کہا گیا ہے، تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان چھاپہ مار کاروائیوں میں نہ کوئی کشت وخون ہوا نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا مگر ہجرت کے پہلے ہی سال چار مہمات بھیج کر اور دوسرے سال مزید دو تاختیں کر کے رسول اللہ نے قریش مکہ کو گویا سمجھا دیا کہ اب ہوا کا رخ کیا ہے؟؟

یہی وہ بات تھی جس کے ہو جانے سے قریش مکہ خائف تھے بلکہ اسی بات پر ابو جہل کی سعد بن معاذ سے تکرار بھی ہو چکی تھی۔

سعد بن معاذ، مدینہ کے قبیلہ اوس کے سردار تھے، ہجرت واقع ہونے کے بعد یہ عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ گئے، وہ اُمیہ بن خلف کے مہمان بن کر گئے تھے ۔ عین حرم کے دروازے پر ان کی ابو جہل سے مڈ بھیڑ ہو گئی ابو جہل اکھڑ مزاج اور ترش رو آدمی تھا اُس نے سعد کو وہیں ٹوک دیا

''تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو اپنے ہاں پناہ دو، اور ان کی امداد واعانت کا دم بھرو، اور ہم تمہیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں؟؟ اگر تم امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔''

سعد بن معاذ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

''بخدا اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اُس چیز سے روکوں گا جو تمہارے لئے اس سے زیادہ شدید تر ہے یعنی مدینہ پر سے تمہاری رہ گزر۔''

گویا اہل مکہ نے یہ دھمکی دی کہ مسلمانانِ مدینہ کو زیارت کعبہ کے لئے نہیں آنے دیا جائے گا ،اس کے جواب میں اہل مدینہ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ ٹھیک ہے پھر اپنی تجارتی شاہراہ کی خیر مناؤ۔

اور پھر یوں ہوا کہ شعبان ۲ھ کے اواخر میں یعنی مارچ ۶۲۳ء میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار اشرفی کا مال تھا جبکہ تیس چالیس سے زائد محافظین نہیں تھے، شام سے تجارتی مال لے کر مکہ جانے کے لئے روانہ ہوا۔ سالار قافلہ ابو سفیان تھا۔ اگر آپ یہاں رک کر نقشہ دیکھیں تو آپ کو قریش کے تجارتی قافلہ کا راستہ واضح نظر آئے گا وہ شام سے جنوب کی طرف پہلے ینبع کی بندرگاہ پر پہنچتے تھے، یہاں سے بئر سعید سے ہوتے ہوئے بدر سے گزرتے تھے۔

بدر، بیضوی شکل کا ایک ساڑھے پانچ میل لمبا اور ساڑھے چار میل چوڑا وسیع میدان تھا، جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا، اس کا زیادہ حصہ ریتیلا ہے اور جو چٹانیں ہیں وہ بھی ریتیلے پتھروں کی ہیں۔ میدانِ بدر کے شمال اور جنوب میں دو سفیدی مائل پہاڑیاں ہیں جو ریت سے ڈھکی ہوئی ہیں، شمالی پہاڑی ''العدوہ الدنیا'' کہلاتی ہے، معرکہ بدر میں مسلمانوں کی فوج اسی طرف تھی ۔ جنوبی پہاڑی ''العدوہ القصویٰ'' کہلاتی تھی قریش مکہ کا جنگی کیمپ اسی طرف تھا۔

اس جگہ کا نام بدر پڑنے کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس کی نسبت بدر بن مخلد بن نضر بن کنانہ کی طرف ہے جس نے یہاں ایک کنواں کھدوایا تھا جس کا پانی اس قدر شفاف تھا کہ اس میں چاند کا عکس نظر آتا تھا۔

بدر کا میدان جس وادی میں تھا اُسے یلیل کہتے تھے۔ اس وادی میں بدر کے کنویں کے علاوہ بھی کئی چشمے تھے جن کی وجہ سے علاقہ سر سبز تھا۔ یہاں کھجور کے باغات بھی تھے اور آبادی بھی۔ عہدِ نبوی میں یہاں بنی ضمرہ آباد تھے، وہی بنی ضمرہ جن سے رسول اللہ نے دفاعی اعانت کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اسلام سے قبل بدر میں سالانہ میلہ لگتا تھا جس میں شرکت کے لئے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ یہاں ایک بڑا بت خانہ بھی تھا جو بت پرستوں اور مشرکوں کا مرکز تھا، مگر اس بستی کی زیادہ اہمیت میلے کی وجہ سے تھی۔ لوگ سامانِ تجارت لے کر آتے اور بھیڑ، بکری، اونٹ، اون، اونی کپڑے وغیرہ کے تبادلہ میں سامانِ خوراک اور دوسری ضرورت کی چیزیں لے جاتے تھے اس کی وجہ سے یہاں بڑی رونق اور چہل پہل ہوتی تھی۔

ابو سفیان کی سربراہی میں آنے والا تجارتی قافلہ ینبوع سے گذر کر دن بدن بدر سے قریب ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کی سابقہ مہمات کی روشنی میں، بدر سے گذرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اُس نے حفظِ ما تقدم کے طور پر ضمضمہ بن عمرو کو مکہ کی طرف دوڑایا تا کہ وہ اہل مکہ کی مدد لے آئے، اس نے کہلا بھیجا کہ اہل مکہ اس کو بدر کے قریب مل جائیں۔ ضمضمہ نے مکہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدہ کے مطابق اپنے اونٹ کے کان کاٹے، اس کی ناک چیر دی، کجاوے کو الٹ دیا، اپنا لباس آگے پیچھے سے پھاڑ کر دہائی دینی شروع کی:

''اے قریشیو! اپنے کاروانِ تجارت کی خبر لو۔ تمہارے اموال جو ابو سفیان کے ساتھ ہیں، محمد

اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہوگیا ہے ، مجھے امید نہیں کہ تم انہیں پا سکو گے دوڑو۔۔۔۔دوڑو۔۔۔۔مدد کے لئے۔"

اس دہائی پر سارے مکہ میں کھلبلی مچ گئی۔

اس سے قبل ماہ رجب (حرام مہینہ) کی آخری شب وادی نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں عمرو بن حضرمی کے قتل کا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ جس پر اہل قریش صلاح ومشورہ کر ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ ضمضمہ واویلا مچاتا آدھمکا، اب تو کوئی سوال نہ تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے پر نہ نکلا جائے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور بڑے ساز وسامان کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہوئے تا کہ اپنے قافلہ کو بچا کر نکال لائیں۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی، جن میں چھ سو زرہ پوش تھے، اور دو سو گھڑ سوار تھے۔

جب سے رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے، کفار مکہ کی سازشوں سے آگاہ رہنے کے لئے ان کی جاسوسی کی ٹیمیں گردونواح کے چکر لگاتی رہتی تھیں، جن سے رسول اللہ کو پل پل کی خبر ملتی رہتی تھی، جب انہیں ابوسفیان کے قافلہ تجارت کی خبر ملی کہ وہ شام سے چل چکا ہے اور چند دن میں بدر پہنچ جائے گا تو رسول اللہ نے قریش پر دباؤ بڑھانے کے لئے اُسے روکنے کا فیصلہ کیا۔ اس تجارتی قافلہ کو روکنا بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا، کیونکہ قافلہ کے ساتھ تیس چالیس محافظ ہی تھے اور بس۔

رسول اللہ ابوسفیان کے قافلے کو روکنے کے لئے ۳ ررمضان کو نکل پڑے، ابھی چند منزلیں ہی طے کی تھیں کہ ذفران نامی وادی میں آپ کو اطلاع ملی کہ قریش کا لشکر، بدر کی طرف چلا آرہا ہے تا کہ کاروانِ تجارت کو بچا سکے۔ اب رسول اللہ کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ کس سے نبٹا جائے؟ شمال کی طرف سے آنے والے تجارتی قافلے سے جو کہ دن بدن بدر سے قریب آرہا تھا۔ یا ایک ہزار کے مسلح لشکر سے جو جنوب کی طرف سے دھاوے مارتا ہوا بدر کی طرف آرہا تھا؟؟

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے وعدہ کیا کہ وہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کردے گا۔

"یاد کرو وہ موقعہ جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے

مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

(انفال۔۷،۸)

اس صورت حال میں مسلمان یہ چاہتے تھے کہ کمزور گروہ یعنی قافلہ ابوسفیان سے نبٹ لیا جائے، ایک تو یہ کہ بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، دوسرے جنگ بھی ہلکی رہے گی کیونکہ مسلمان خود بہت زیادہ مسلح نہیں تھے اور جب مدینہ سے چلے تھے تو کسی بڑی جنگ کا خیال نہیں تھا۔

لیکن رسول اللہ اور خود خدا کا فیصلہ بھی یہ تھا کہ لشکرِ قریش سے بھڑا جائے اور ایک فیصلہ کن جنگ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اس فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کر کے آپ نے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ساری صورت حال ان کے سامنے بیان کی کہ ایک طرف شمال سے قریش کا تجارتی قافلہ آرہا ہے، اور دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر آرہا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر تم کو غلبہ عطا کرے گا، بتاؤ تم کس کے مقابلے پر نکلنا چاہتے ہو؟

جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے۔ لیکن رسول اللہ کے پیش نظر کچھ اور تھا لہذا آپ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ مہاجرین نے آپ کا مطلب سمجھ لیا ان کی طرف سے مقداد بن عمرو نے کھڑے ہو کر کہا:

"یا رسول اللہ جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے، اسی طرف چلیے ہم آپکے ساتھ ہیں، ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، نہیں، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم بھی آپ کے ساتھ جان لڑائیں گے جب تک کہ ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔"

مہاجرین کی رائے رسول اللہ کی رائے کے موافق ہوئی تو یقیناً رسول اللہ نے تقویت محسوس کی ہوگی، مگر یہ تو مہاجرین تھے جو گزشتہ کئی سالوں سے آزمائے جا رہے تھے، اور وہ ہر آزمائش میں پورے اترتے چلے آرہے تھے، انہوں نے تو اپنا گھر بار، عزیز واقارب شہر و کاروبار چھوڑ کر رسول اللہ کے لئے اپنی

جاں نثاری ثابت کر ہی دی تھی، امتحان تو انصار کا تھا، ان کی رائے اور شرکت کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہجرت کے بعد سے اب تک کے درمیانی عرصہ میں جتنی جنگی مہمات روانہ کی گئی تھیں وہ سب مہاجرین پر مبنی تھیں۔ ان فوجی اقدامات میں ابھی تک انصار سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی۔ ان کے لئے آزمائش کا یہ پہلا موقع تھا کہ بیت عقبہ کے موقع پر اسلام کی حمایت کا جو عہد انہوں نے کیا تھا اسے وہ کہاں تک وفا کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اس لئے رسول اللہ نے انصار کو براہ راست مخاطب کئے بغیر پھر اپنا سوال دہرایا، اس پر سعد بن معاذ اٹھے اور کہا:

''شائد حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟''

''ہاں'' رسول اللہ نے فرمایا

''ہم آپ پر ایمان لائے ہیں'' سعد نے مضبوط لہجے میں کہنا شروع کیا ''آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے، ہم آپ سے سمع واطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول، آپ نے جو کچھ ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے حق کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ کود یں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہی ہم کو لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ میں سچی جان نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہمارے واسطے سے وہ کچھ دکھادے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔''

رسول اللہ ﷺ اس تقریر سے خوش اور مطمئن ہوئے اور گویا یہ فیصلہ ہو گیا کہ تجارتی قافلہ کے بجائے لشکر قریش کے مقابلے پر نکلا جائے گا۔ مسلمانوں کے کچھ لوگ اس فیصلہ سے گھبرا گئے تھے، کیونکہ تعداد کے اعتبار سے اور اسلحہ کے اعتبار سے قریش ان سے کہیں بڑھ کر تھے۔

بہر حال فیصلہ ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر ''فوج'' پر نظر ڈالی گئی، جو کم عمر بچے اور کمزور لوگ تھے انہیں مدینہ واپس بھیج دیا گیا کیونکہ پہلے معاملہ ایک تجارتی قافلہ کو دھمکانے کا تھا اور اب معاملہ جدال وقتال کا ہو گیا تھا دو کم سن انصار بچے معاذ اور معوذ کو بھی ان کی کم عمری کی وجہ سے رسول اللہ نے مدینہ واپس بھیجنا چاہا، اس پر وہ دونوں سخت

دلگرفتہ ہوئے اور رسول اللہ کے سامنے سینہ پھلا کر اور پنجوں کے بل اچک کر کھڑے ہوئے تا کہ نوجوان لگیں۔

انصار کے دو خوبصورت بچے

معاذ اور معوذ.........کم سن.........قد میں چھوٹے مگر جذبوں اور عزائم میں بڑوں سے بڑے۔

اور جنگیں صرف مادی وسائل سے ہی نہیں جیتی جاتیں، ''جذبہ'' بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی جذبہ کو دیکھ کر رسول اللہ نے انھیں جہاد کی اجازت دے دی۔ میدان جنگ میں یہ دونوں بچے ابوجہل کو تاڑتے رہے، اور اسی کا پیچھا پکڑ لیا، تا آنکہ اُسے جہنم واصل کر دیا۔ ابوجہل کو بھی وقت مرگ افسوس ہی رہا کہ بچوں اور وہ بھی انصاری بچوں کے ہاتھوں مارا جا رہا ہے، کسی قریشی سورما کے ہاتھوں مارا جاتا تو کوئی بات بھی تھی۔

بہر حال کانٹ چھانٹ کے بعد اب جو رسول اللہ کا لشکر تیار ہوا تو وہ صرف تین سو تیرہ تھے۔ اُن کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، اور بار برداری کے لئے ستر کے قریب اونٹ تھے۔ صرف ساٹھ آدمیوں کے پاس زرہیں نکلیں، باقیوں کو دشمن کی تلواروں کا مقابلہ ننگے سر اور کھلے جسم کے ساتھ کرنا تھا۔

جانثاروں اور سرفروشوں کا وہ مختصر سا گروہ، اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے، مزید کئی دن کا سفر کر کے بدر پہنچ گیا۔

....

ہم بھی اپنی ائیر کنڈیشن گاڑی میں دو ڈھائی گھنٹے کا سفر طے کر کے بدر پہنچ چکے تھے۔ مرکزی شاہراہ سے شہر میں داخل ہوتے ہی دور سے سفید رنگ کی خوبصورت سی صاف ستھری، مسجد عریش نظر آ گئی۔

''وہ ہے مسجد عریش'' میں نے سجاد کی توجہ اُدھر مبذول کرائی،

''کیسے پتہ کہ یہ مسجد عریش ہے؟'' سجاد نے میرا امتحان لیا،

ظاہر ہے مسجد پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نہیں تھا جسے دور سے پڑھا جا سکے، نہ ہی میں اس قبل بدر آئی تھی، خود سجاد کا بھی بدر کے لئے یہ پہلا سفر تھا۔

"ان مقامات کی تصویریں بارہا دیکھی ہیں۔ اور یہ تصاویر اب تصویر بتاں کی مانند، دل پہ نقش بلکہ کندہ ہو چکی ہیں، شبہ ہے تو قریب چل کر دیکھ لو۔" ہم نے بڑے وثوق سے کہا

مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم اُس مسجد کے سائے میں آ پہنچے۔

اس پر مسجد عریش کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

وہ مسجد عریش ہی تھی۔

گویا ہم اس جگہ کھڑے ہوئے تھے جہاں جنگ بدر والے دن رسول اللہ کے لئے سائبان (عریش) لگایا گیا تھا۔

مسجد عریش میں ہم نے عصر اور ازاں بعد مغرب کی نمازیں پڑھیں۔ مسجد عریش بدر کی سب سے خوبصورت مسجد ہے، اس میں تقریباً گیارہ سو مردوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے جبکہ اوپر مصلی النساء بھی خاصا وسیع و عریض ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اوپر نہ پنکھا تھا نہ اے۔ سی، لہذا میں ثناء اور سعدیہ جب نماز پڑھ کر اترے تو پسینہ پسینہ ہو رہے تھے جبکہ سجاد، ادریس بھائی اور سعود اے۔ سی کی ٹھنڈک سے مستفید ہو رہے تھے۔

موجودہ مسجد عریش دو میناروں اور ایک گنبد کی سفید رنگ اور سرخی مائل کتھی دروازوں کی خوبصورت مسجد ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۹۲ء میں ہوئی، اس سے قبل یہاں کتھئی اینٹوں، سبز دروازوں اور کھڑکیوں کی بالکل سادہ سی ایک مینار کی مسجد تھی۔ مسجد کے ارد گرد قدرتی نشیب و فراز میں کھجور کے باغات نظر آتے رہے، جبکہ کئی فرلانگ کے فاصلے پر سامنے وہ وسیع ریتیلا میدان تھا جہاں ۱۷ رمضان کو حق و باطل کا پہلا فیصلہ کن معرکہ لڑا گیا تھا۔

....

مسلمان جب بدر پہنچے تو انہیں اطلاع ملی کہ کفار کا لشکر آ چکا ہے اور عقنقل نامی ریتیلی پہاڑی کے عقب میں ہے۔

ادھر قریش کے تجارتی قافلے کے سردار ابوسفیان نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے قافلے کو ساحل کے راستے پر ڈال دیا اور خود حصول معلومات کے لئے بدر کی طرف آیا۔ جب وہ بدر کے چشمہ پر آیا تو ایک شخص مجدی بن عمرو سے دشمن کے بارے میں سوال کیا۔

مجدی نے جواباً کہا "میں نے صرف دو مشتبہ شتر سواروں کو دور سے دیکھا ہے، وہ ٹیلے پر اونٹ بٹھا کر اور اپنے مشکیزوں میں پانی بھر کر چلے گئے ہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان کے کان کھڑے ہو گئے اُس نے خطرے کو بھانپ لیا اور فوراً اُس جگہ پہنچا جہاں اونٹ بٹھائے گئے تھے۔ اُس نے ان کی مینگنیاں توڑ کر دیکھیں اور چلا اٹھا

"بخدا یہ تو مدینہ کا چارہ ہے"

اس کا مطلب تھا کہ مسلمان بدر کے گردونواح میں پہنچ چکے تھے۔ تجارتی قافلے کو یہاں سے لے کر جانا انتہائی خطرناک بات تھی لہذا ابوسفیان نے اپنا راستہ بدل دیا اور واپس بحر احمر کے ساحل کی طرف نکل گیا اور کنارے کنارے چلتا رہا۔ یہ ساحلی راستہ ریت کی کثرت اور پانی کی قلت کی وجہ سے سخت دشوار گذار تھا۔ اور عام طور پر قافلے والے ادھر سے نہیں گذرا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ابوسفیان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے جب جحفہ پہنچا تو اسے تسلی ہوئی کہ وہ اپنا قافلہ بچا لایا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنا ایک قاصد قریش کے لشکر کی طرف واپس بدر بھیجا اور کہلا دیا کہ جس مال و متاع اور جن عزیز و اقارب کی سلامتی کے لئے آپ مسلمانوں سے لڑنے آئے تھے، اب وہ محفوظ ہیں لہذا آپ واپس آ جائیں۔

ابوجہل کے لشکر میں اس سے پھوٹ پڑ گئی۔ عتبہ بن ربیعہ، واپس جانا چاہتا تھا، جبکہ ابوجہل جنگ پر آمادہ تھا، اور اس کے لئے اس نے عمرو بن حضرمی کے قتل کا بہانہ لیا کہ اُس کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ عتبہ نے بہت کہا کہ مسلمانوں سے خون بہا لے لیتے ہیں اور واپس چلتے ہیں۔ اس جنگ کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن ابوجہل نے جنگ پر اصرار کیا بلکہ عتبہ بن ربیعہ کو بزدلی کا طعنہ دیا، اس کے گھوڑے پر الٹی تلوار ماری جیسے کہہ رہا ہو،

بزدل شخص، تم میری طرف سے دفع ہو جاؤ۔

بزدلی کا طعنہ عرب برداشت نہیں کرتا، لہذا عتبہ بھی بالآخر جنگ پر آمادہ ہو گیا اور صرف آمادہ ہی نہیں ہوا بلکہ مبارزت طلبی میں پہلے اپنے دو بیٹے بھیجے، تاکہ آئندہ کوئی اسے یا اس کے خاندان کو بزدلی کا طعنہ نہ دے سکے۔

رسول اللہ کی جنگی حکمت عملیوں کے بارے میں سوچیں تو حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے لشکر

قریش کی نقل وحرکت سے پہلے ہی تیزی سے آگے بڑھ کر بدر کے چشمے پر قبضہ کرلیا، یہ سارا علاقہ بلندی پر تھا۔ مجاہدین نے چشمے پر پہنچ کر رسول اللہ کے حکم سے تمام کاریزوں کے منہ بند کردیئے، اور چشمہ کے منبع کے قریب تالاب بنا کر قریش کے پاس پانی پہنچنے سے روک دیا۔

وہ بڑی اعصاب شکن رات ہوسکتی تھی مگر اللہ نے ان مٹھی بھر جانثاروں پر رحمت کی اور انہیں سکون کی نیند سلا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔ہوسکتا ہے پریشانی کی وجہ سے مسلمان ساری رات جاگتے رہتے اور صبح جب جنگ ہوتی تو تھکاوٹ کی وجہ سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکتے۔ ایسے میں اللہ نے مسلمانوں کے ساتھ بڑے کرم کا معاملہ کیا۔

''اور وہ وقت یاد کرو جبکہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان اور
بے خوفی کی کیفیت طاری کررہا تھا۔
اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا۔
تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے۔
اور تمہاری ہمت بندھائے
اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمادے۔''

(انفال۔۱۱)

لہٰذا وہ رات مسلمان بہت آرام سے سوئے، یہ نیند ایک نعمت تھی اُن کے رب کی طرف سے، دوسری نعمت بارش تھی، جس کی وجہ سے ایک فائدہ تو مسلمانوں کو یہ ہوا کہ انہیں پانی کا ذخیرہ مل گیا، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ چونکہ وہ بلندی پر تھے لہٰذا وہاں کی ریت جم گئی اور زمین مضبوط ہوگئی، جبکہ لشکر قریش نشیب میں تھا اس لئے وہاں اس بارش کی بدولت زمین دلدلی ہوگئی جس میں ان کے باربردار اونٹ پھنس گئے اور نقل وحرکت دشوار ہوگئی، لہٰذا لشکر قریش کو مجبوراً وادی کی دلدل سے نکل کر ریتلے علاقے میں آنا پڑا اور یہاں ایک نخلستان میں پڑاؤ کیا۔

۱۷ رمضان کا دن تھا جب فریقین میں جنگ ہوئی، جس وقت دونوں لشکر ایک دوسرے کے مدمقابل آئے، تو فرق ظاہر ہوگیا، ایک مسلمان کے مقابلے پر تین کافر پڑ رہے تھے، پھر مسلمان پوری

طرح مسلح بھی نہیں تھے۔ اس چیز نے رسول اللہ کو مضطرب کردیا، وہ عریش میں ہی انتہائی خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ سے دعا میں مصروف ہوگئے۔

''خدایا! یہ ہیں قریش، اپنے سامان غرور کے ساتھ آئے ہیں،
تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں، خداوندا، بس اب آجائے تیری وہ
مدد جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اے خدا اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک
ہوگئی تو روئے زمین پر پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی التجا سن لی۔

ھبل، لات ومنات، کے جے کاروں کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا، ستر کافر موت کے گھاٹ اتر گئے، اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ ۱۴ مسلمان شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر تھے اور آٹھ انصار۔

....

ہم اُس میدان بدر میں چل پھر رہے تھے، قیاسات سے اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ لشکریوں کا پڑاؤ کہاں رہا ہوگا۔ جنگ کہاں ہوئی ہوگی۔ اب میدان کے ایک حصے کو پختہ کر کے ان چودہ شہیدان بدر کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ یہ یادگار انتہائی سادہ مگر باوقار ہے، اور مسجد عریش سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ سیاہ سنگ مرمر کے تین، ساڑھے تین فٹ اونچے چبوترے پر سنگ سفید کے فریم میں، سفید ہی سنگ مرمر کا جڑا ہوا تختہ جس پر شہدائے بدر کے نام کندہ کئے گئے ہیں۔ یہ یادگار ۱۹۹۲ کے بعد کی ہے، اس سے قبل جو یادگار تھی (اس کی تصویر بھی دی جارہی ہے) وہ تین یا چار پنکھڑی کے ایک پھول کی طرح تھی۔ اس کے بعد کسی وقت یہ یادگار بنائی گئی، جو ہم نے دیکھی۔ اس یادگار سے کچھ فاصلے پر وہ احاطہ ہے جہاں یہ شہداء دفن کئے گئے۔

ہم نے پورے احاطے کا چکر لگایا کہیں سے اندر جانے کا راستہ نہ ملا ایک جگہ احاطے کی دیوار قدرے کم اونچی تھی وہاں سے ہم نے احاطے کے اندر دیکھا، ہمارے سامنے ایک غیر مسطح میدان تھا، پتھریلا، ریتیلا، کہیں کہیں جھلسی ہوئی پیلی جھاڑیاں، اور بس احاطے کے سامنے ہی تین بورڈ لگے ہوئے تھے۔ دو عربی میں تھے، ایک اردو میں۔ عربی کے پہلے بورڈ پر ان اعمال کی تفصیل لکھی تھی جن کا کرنا قبروں کے پاس حرام تھا۔ دوسرے بورڈ پر 'الغرض من زیارۃ القبور' کے تحت لکھا گیا تھا کہ قبروں کی زیارت کا مقصد کیا

ہے۔اسی تحریر کو اردو میں ترجمہ کر کے تیسرا بورڈ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ سعودی عرب میں اردو فہم طبقہ کافی بڑی تعداد میں موجود ہے صرف پاکستانی ہی نہیں ہندوستانی اور بنگالی بھی اردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم نے بدر کی جدید بستی کا گاڑی سے چکر لگا کر جائزہ لیا۔ وہیں ایک کیفے سے چائے پی۔ آج کا بدر ایک چھوٹا مگر جدید شہر ہے۔ اس شہر کے پہلو میں تیل سے قبل کا بدر بھی نظر آجاتا ہے، اصل میں جب سعودی عرب نے عہد جدید میں قدم رکھا اور تیل کی دولت سے خوشحالی آئی تو جدید ترین سہولیاتِ زندگی کے حصول کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ لہٰذا تیل سے آنے والی اس خوشحالی سے قبل کا سعودی عرب محض ایک کتھئی، پیلا گاوں تھا۔ جیسے ہمارے یہاں کے کتھئی، پیلے گاؤں ہوتے ہیں۔

دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم واپس مدینے پہنچے تو گھر کے قریب کی مارکیٹ سے کچھ شاپنگ کی اور گیارہ بجے گھر پہنچے تو اہل خانہ نے ابھی ہمارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ چوہدری صاحب کی بہو نے ہمارے لئے دسترخوان چنا، انواع واقسام کے لذیذ کھانے دیکھ کر بھوک چمک اٹھی۔ ہم سب نے گفتگو کے دوران کھانا ختم کیا۔ کھانا سمیٹنے میں خاتون خانہ کی مدد کے بعد میں اپنے کمرے میں سونے چلی گئی جہاں پہلے ہی بچوں اور ہمارے لیے بستر لگے ہوئے تھے۔ کل صبح خیبر روانگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆
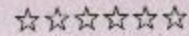
سقیفہء بنوساعدہ

بدر سے واپسی کے اگلے دن یعنی بدھ، ۹ جولائی ۱۹۹۷ء کو ہمیں صبح خیبر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ جب ہم سو کر اٹھے تو چودھری صاحب اور ان کے بیٹے شفیق اپنے دفتر جا چکے تھے، شفیق کی بیوی نے ہمارے لئے پرتکلف ناشتہ تیار کیا تھا۔ ابھی ہم ناشتے کی میز پر تھے کہ چودھری صاحب واپس آئے ان کے ہاتھ میں ایک اہم کتاب ''بیوت الصحابہ حول المسجد النبوی الشریف'' تھی۔ اس کتاب میں مسجد نبوی کے گرداگرد اصحاب رسول کے مکانات کی تفصیل تھی جو توسیع مسجد کے بعد مسجد میں ضم ہو چکے تھے۔ ان مکانات کا کھوجنا تو اب ناممکن ہو چکا تھا مگر جس اہم مقام کی طرف چودھری جان محمد صاحب اشارہ کر رہے تھے وہ سقیفہ بنوساعدہ تھا۔ جہاں رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی گئی تھی۔

''اب صحابہء کرام کے یہ سارے مکانات تو توسیع مسجد کی زد میں آچکے ہیں'' چودھری صاحب اطلاع دے رہے تھے ''البتہ سقیفہ بنوساعدہ کو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، حکومت اس کی خاصی دیکھ بھال کرتی ہے۔''

یہ اطلاع میرے لئے بہت اہم تھی، اس سے قبل میں تین دفعہ مدینہ آئی تھی مگر تینوں دفعہ معلومات کرنے کے باوجود اس جگہ کی نشاندہی نہیں ہو سکی تھی۔ اب جو موقع مل رہا تھا اُسے کون ہاتھ سے جانے دیتا لہٰذا چودھری صاحب سے درخواست کی گئی کہ ہمیں یہ مقام ضرور دکھائیں۔ ہم نے اپنا سامان گاڑی میں رکھا، گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور چودھری صاحب کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی ڈال دی۔ تھوڑی دیر میں گاڑیاں رُک گئیں، اردگرد تعمیراتی کام جاری تھا۔ مسجد نبوی کے مینارے دور سے نظر آرہے تھے۔

''یہ ہے سقیفہ'' چودھری صاحب نے ایک مثلث احاطے کی طرف اشارہ کیا، اس احاطے کے چاروں طرف لوہے کے جنگلے تھے اور اندر ایک گھنا باغ تھا۔ گویا سقیفہ کی جگہ اب میونسپلٹی کا لگایا ہوا باغیچہ

ہے، باغیچہ میں بعض درخت اتنے طویل القامت تھے کہ کیمرہ ان درختوں کی طوالت کو سمیٹ نہیں سکا۔
ہم اس بستان میں گھوم پھر رہے تھے، تصاویر اتار رہے تھے، اس کے ایک حصہ پر اب پاور ہاوس تعمیر ہو گیا ہے۔ یہ سقیفہ 'طریق ابوبکر صدیق' پر واقع ہے۔ اس کے ایک جانب کئی منزلہ 'فندق الشرق' اس وقت تعمیر کے مراحل میں تھا، اب تک تو یہ یقیناً ایک معروف ہوٹل ہوگا۔ اگر آپ مدینہ جائیں اور آپ کا قیام فندق الشرق میں ہو تو اس کی مشرقی جانب کی کھڑکیوں یا بالکونی سے آپ سقیفہ بنوساعدہ کا نظارہ کر سکتے ہیں۔
فندق الشرق کے برابر ہی مکتبۂ ملک عبدالعزیز کی عمارت ہے۔

جب ہم سقیفہ کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو ایک مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ پودوں اور درختوں کی تراش وخراش انتہائی محنت اور خوبصورتی سے کی گئی تھی، باغ کے اندر ہی پانی کا پمپ لگا ہوا تھا، پانی افراط سے تھا، مدینہ کی زمین یونہی زرخیز ہے لہذا بستان خوب لہلہا رہا تھا۔ شائد چودہ سو سال قبل کیے گئے تاریخی فیصلے پر نازاں ہو۔

....

عہد نبوی میں سقیفہ (سائبان یا چوپال)، پتھروں اور اینٹوں سے بنا تین دیواروں والا احاطہ ہوتا تھا جس کی چھت کھجور کے پتوں اور لکڑی سے بنی ہوتی تھی۔ یہ سائبان عموماً اہل مدینہ کے مجلسی اجتماعات کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بنی ساعدہ کا یہ سقیفہ، مدینہ کا واحد سقیفہ نہیں تھا، مختلف قبائل کے اپنے سقیفے ہوتے تھے جہاں وہ اپنی اجتماعی محفلیں منعقد کرتے تھے۔

جس دن رسول اللہ کا انتقال ہوا، مسلمانوں پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ہر شخص دلگرفتہ اور ہر آنکھ اشک بار تھی، حضرت عائشہ صدیقہ کے حجرے میں رسول اللہ کی قبر تیار کی جا رہی تھی اور تجہیز و تکفین کے مراحل طے کیے جا رہے تھے، مسجد نبوی میں سوگواروں کا خاموش اجتماع تھا کہ دو بدری صحابہ عویم بن ساعدہ اور معن بن عدی نہایت عجلت میں مسجد نبوی میں آئے اور ابوبکر صدیق سے کہا:

"فتنہ کا دروازہ، اگر اسے آج اللہ نے آپ کے ہاتھوں بند نہ کیا تو
وہ کبھی بند نہ ہوگا یہ سعد بن عبادہ انصاری بنوساعدہ کے سقیفہ میں موجود ہیں اور
لوگ ان کی بیعتِ خلافت کرنے والے ہیں۔"

اس اطلاع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ کو لے کر سقیفہ کی جانب تیز رفتاری سے

روانہ ہوئے، راستے میں ابوعبیدہ بن الجراح بھی مل گئے، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو ایک ہنگامہ سا بپا تھا انصار کا ایک خطیب تقریر کر رہا تھا:

"ہم انصار اور اسلام کا لشکر ہیں، اور اے جماعت قریش! تم ہمارے نبی کی قوم
سے ہو۔ اور تمہاری قوم میں سے کچھ لوگ ہماری جانب آہستہ آہستہ نقل مکانی کر
کے آ گئے"

سیدنا ابوبکر صدیق نے اس تقریر کو کاٹ کر کہا

"اے گروہ انصار! تم اپنے جن شرف و فضل کا ذکر کرو گے تم اس کے اہل ہو،
لیکن عرب امارت و خلافت کو قریش ہی میں دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے شہر و نسب کے اعتبار سے سارے عرب میں صاحب شرف ہیں اور عرب انہی کی اطاعت کریں گے، تمہارے سامنے عمر اور ابوعبیدہ موجود ہیں، ان میں سے جس کو پسند کرو اس کی بیعت کر لو۔"

اس موقع پر انصاریوں کی طرف سے یہ تجویز آئی کہ ایک امیر مہاجرین میں سے ہو اور ایک انصار میں سے، یہ تو ملت مسلمہ کو دولخت کرنے والی بات تھی پھر انصار میں بھی دو طاقتور قبائل تھے۔ اوس اور خزرج۔ اوس کا امیر خزرج کے لئے اور بنوخزرج کا امیر اوس کے لئے قابل قبول نہ ہو سکتا تھا پھر تو اس تقسیم در تقسیم کو روکنا ممکن ہی نہ رہتا۔

لہذا سیدنا عمر نے فیصلہ کن انداز میں ابوبکر صدیق سے کہا "ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے کیونکہ آپ ہم سب سے بہتر ہیں اور رسول اللہؐ سب سے زیادہ آپ ہی سے محبت کرتے تھے۔"

یہ کہہ کر سیدنا عمر نے ابوبکر صدیق کی بیعت کر لی، اس کے ساتھ ہی وہاں موجود مہاجرین اور انصار نے آپ کی بیعت کر لی، سوائے حضرت سعد بن عبادہ انصاری کے! اور سعد ابن عبادہ انصاری مدینہ کی کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) کے مرنے کے بعد بنوخزرج کے سردار تھے، ان کا عالیشان مکان محتاجوں، بھوکوں اور مسافروں کے لئے بہت بڑی پناہ گاہ تھی۔ ان کی مکان کی منڈیر سے ہر شام آواز لگانے والا آواز لگاتا تھا کہ اگر کوئی مسافر ہے جس کے پاس رات گزارنے کا ٹھکانہ نہیں تو یہاں چلا آئے، اگر کوئی بھوکا ہے تو کھانے کے لئے ادھر چلا آئے، سعد بڑے متمول تھے اور دریا دل بھی۔ رسول اللہ کے بھوکے صحابہ کرام کو، خصوصاً اہل صفہ کو وہ اپنے ساتھ گھر لے جایا کرتے تھے تاکہ

انہیں کھانا کھلائیں، بعض اوقات ایک ایک وقت میں وہ اسی اسی اصحاب صفہ کو اپنے گھر لے گئے۔ رسول اللہ کے لئے بھی روز آنہ کوئی نہ کوئی سالن یا ہدیہ پہنچتا تھا۔ سعد بن عبادہ مدینہ کے ان چند افراد میں سے تھے جنھیں کامل کہا جاتا تھا۔ اور کامل وہ ہوتا تھا جسے تیر اندازی، پیراکی اور لکھنا پڑھنا آتا ہو،

یہ سابقون الاولون میں سے تھے۔

جنھوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی،

یہ بیت عقبہ میں شریک تھے،

جب رسول اللہ غزوہ ابواء پر تشریف لے گئے تو سعد مدینہ میں رسول اللہ کے نائب متعین ہوئے،

غزوہ بدر میں کل ستر اونٹ تھے، ان میں سے بیس اونٹ سعد بن عبادہ نے دیئے تھے،

فتح مکہ کے موقع پر انصار کے علمبردار یہی سعد بن عبادہ تھے۔

لہٰذا یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی کہ انصار نے انہیں رسول اللہ کی جانشینی کے لئے تجویز کیا تھا۔

لیکن جلد ہی رائے عامہ ابوبکر صدیق کے لئے ہموار ہوگئی اور سقیفہ میں وہ تاریخی فیصلہ ہوا، آنے والے وقت نے جس کی توثیق کی۔

....

سقیفہ میں ہر طرف گھوم پھر کر ہم واپسی کیلئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ آج سقیفہ جس حصے میں ہے اسے "مثلث السلطانیہ" کہا جاتا ہے مسجد نبوی سے تمام سڑکیں اس مثلث کی سمت جاتی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں مدینہ میونسپلٹی نے اس جگہ کو حاصل کرنے کی پیشکش کی تاکہ وہاں ایک لائبریری اور ایک مسجد بنائی جاسکے، تجویز یہ ہے کہ لائبریری میں سقیفہ بنی ساعدہ نامی ایک سماعت گاہ (آڈیٹوریم) بنائی جائے تاکہ اس نام سے رسول اللہ کے وصال کے بعد اس عمارت میں ہونے والی پہلی اسلامی کانفرنس کی یاد قائم رہے، جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے خلیفہ چنے گئے تھے۔

ہم خوش تھے کہ ہم نے وہ تاریخی جگہ دیکھ لی تھی۔

"آپ لوگ ہمارے پیچھے آئیں، دفتر میں کچھ کتابیں اور نقشے میں نے نگار کے لئے نکالے ہیں وہ لیتے ہوئے خیبر کی طرف نکل جائیں۔"

ہم چودھری صاحب کے پیچھے ہو لئے، ان کے دفتر کے باہر گاڑی روکی، کچھ انتظار کے بعد چودھری صاحب بعض تاریخی نوعیت کی کتابیں، جو عربی میں تھیں، کچھ چارٹ اور نقشے وغیرہ میرے لئے لے کر آئے۔ شفیق بھی ہمیں خدا حافظ کہنے آئے تھے۔

ہم نے دونوں باپ بیٹے کا شکریہ ادا کیا، ان کی مہمان نوازیوں کی خوشگوار یادیں لئے مدینہ سے رخصت ہوئے۔ ہماری اگلی منزل خیبر کا شہر تھا۔

☆☆☆☆☆☆

خیبر

وہ ۹ ر جولائی ۱۹۹۷ء کا دن تھا جب ہم خیبر کے لئے ہم مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ہماری خواہش تو یہ تھی کہ صبح ہی صبح نکل جاتے تا کہ دس گیارہ بجے تک خیبر کی ممکنہ سیاحت کے بعد دوپہر کا گرم وقت وہیں کسی ہوٹل میں گزار کر مدائن الصالح کے لئے روانہ ہو جاتے، لیکن سقیفہ بنو ساعدہ جانے میں ابتدائی دو گھنٹے صرف ہو گئے، یوں جب ہم مدینہ شہر سے نکلے تو گیارہ وہیں بج چکے تھے۔ خیبر مدینہ کے شمال مشرق میں ۱۷۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اور ہمارا خیال تھا کہ ہم دو گھنٹے میں خیبر پہنچ جائیں گے۔ قدیم وقتوں میں پیدل یہ راستہ تین دن میں طے ہوتا تھا۔

مدینہ سے خیبر تک جو سڑک ہے اس پر دو طرفہ ٹریفک ہے یعنی سنگل روڈ ہے۔ جبکہ خیبر سے آگے العلاء جانے والی سڑک دو رویہ ہے۔ مدینہ پیچھے رہ گیا تو ہمارے دونوں جانب کبھی پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا، کبھی ریتیلے میدان اور کبھی باغات کا سلسلہ۔ پہاڑ بھی کئی رنگوں کے، کتھئی، مٹیالے، سرخی مائل بھورے، اور سیاہی مائل سرخ۔۔۔۔۔۔ بائیں جانب زیادہ تر میدانی سلسلہ تھا، جہاں کبھی کبھی کھجوروں کے باغات کا سلسلہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہتا اور پھر پیچھے رہ جاتا۔

سطح سمندر سے ۲۸۰۰ فٹ بلند خیبر کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ اس کی گرد و نواح میں حرت سے حرات تھے۔ حرہ اس پتھریلے بنجر علاقے کو کہتے ہیں۔ جو سیاہ لاوے سے ڈھکا ہوا اور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ گویا اسے آگ سے جلا دیا گیا ہے اس قسم کے حرات زمین دوز آتش فشاں پہاڑوں کی وجہ سے بن جاتے ہیں، جو صحرا کے نشیب و فراز میں بار بار لاوے کی تہہ جماتے رہتے ہیں، مدینہ منورہ میں بھی ایسے حرات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور حرہ واقم ہے جہاں ۶۳ھ/۶۸۳ء میں جنگ حرہ ہوئی تھی۔ ایسے حرات خیبر کے قریب بھی ہیں جن کی وجہ سے زمین زرخیز ہے۔ پھلوں اور اجناس کی فصلوں کے لئے یہ علاقہ مشہور تھا۔ عہد رسالت میں خیبر میں یہودی آباد تھے۔ یہودیوں کے تین قبائل بنو قریظہ، بنو

قینقاع، اور بنو نضیر مدینہ میں بھی آباد تھے تاہم خیبر کے یہود استقلال و شجاعت اور کثرت تعداد کے اعتبار سے تمام یہودی قبائل پر فوقیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مدینہ میں رہنے والے اوس و خزرج کی خانہ جنگیوں میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ غیر جانبدار رہتے حالانکہ ان کے ہم مذہب جو (یثرب) مدینہ میں آباد تھے اس میں پوری طرح ملوث ہوتے تھے۔ جب رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تب بھی انہوں نے مدینہ کے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔

۲ھ میں بنو قینقاع مدینہ بدر کئے گئے اور ۴ھ میں بنو نضیر۔ جب بنو نضیر مدینہ سے نکالے گئے تو انہوں نے خیبر کے قرب و جوار میں پناہ لی اس کے بعد سے یہ علاقہ سازشوں کا مرکز بن گیا۔

....

سخت گرمی میں، دوپہر کا وقت اور ہمارا خیبر کا سفر، شوق کا کوئی مول نہیں، ہمیں خیبر میں قلعہ قوص دیکھنا تھا جو اب تک باقی ہے، باقی قلعے اب کھنڈرات کی شکل میں باقی ہیں۔

خیبر شروع ہونے سے تیس چالیس کلومیٹر پہلے ہی سے حرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی کئی کلو میٹر پر محیط یہ حرات ہمارے اطراف پھیلے ہوئے تھے ان کی وجہ سے اوپری زمین جلی جلی سی لگ رہی تھی، سب کچھ جلا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جھلسا ہوا۔

نیلے رہنما بورڈ ہمیں بتا رہے تھے کہ اب خیبر کتنے کلومیٹر دور رہ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ اب ہم خیبر کے کتنے نزدیک آ گئے ہیں، بالآخر ہم خیبر پہونچ گئے۔ پہلے خیبر کا جدید شہر آتا ہے اس کے عقب میں قدیم خیبر ہے۔

جدید خیبر کے باب الداخلہ پر ایک بڑی سی صراحی بنی ہوئی ہے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے، چھوٹا سا صاف ستھرا شہر تھا۔ ایک ہی مرکزی شاہراہ تھی جس کے دائیں بائیں شہر پھیلا ہوا تھا۔ اسی مرکزی شاہراہ پر چلتے چلتے ہم جدید خیبر سے باہر آ گئے۔ جدید خیبر میں سب کچھ جدید تھا، خوبصورت مکانات، دفاتر، ہوٹل، سڑکیں اور شاپنگ سینٹر، اور جب ہم قدیم خیبر کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک اجڑا ہوا، ٹوٹا پھوٹا دور دور تک پھیلے ہوئے کھنڈرات کا شہر افسوس نظروں کے سامنے تھا۔

یا اللہ یہاں ہم قلعہ قموص کو کہاں ڈھونڈھیں؟

ایک بج چکا تھا۔ گرمی کے دنوں میں ایک بجے دوپہر، کوئی سر پھرا ہی باہر نکل سکتا ہے۔ جدید خیبر تو سنسان تھا ہی۔ قدیم خیبر میں تو در و دیوار پر سناٹے اُگ رہے تھے۔ نہ آدم نہ آدم زاد، کس سے پوچھیں رستہ تیری گلی کا؟

جدید خیبر کے پیچھے رہ جانے پر پختہ سڑک بھی پیچھے ہی رہ گئی تھی

اب ہماری گاڑی کچے راستے پر تھی۔ تاہم یہ کچا راستہ ناہموار اور دشوار گزار نہیں تھا بلکہ ہموار تھا ،اور کشادہ بھی۔ ایسے جیسے یہاں سے بہت ٹریفک گزرتا ہو اور گزرنے والے ٹریفک نے ناپختہ راستے کو کسی نہ کسی حد تک ہموار کر دیا تھا۔ ہم اس اجڑے ہوئے شہر ویران میں ایک قلعہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے، جگہ جگہ رک کر تصویریں بناتے رہے بالآخر ہمیں ایک مقامی عرب نظر آیا۔ سجاد گاڑی روک کر اس کے پاس گئے اب مرحلہ ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کا تھا۔ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔

کچھ محنت کے بعد بالآخر اس عرب کی سمجھ میں آ گیا کہ ہم قلعہ قوص کی تلاش میں ہیں اس نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ہم گاڑی میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے، اب ہمیں غیر ہموار اور تنگ راستے سے سابقہ تھا۔ تنگ راستوں سے گزرتے ہم آہستہ روی سے چلتے رہے بالآخر ایک جگہ پہونچ کر اس نے ہاتھ سے کہیں دور اشارہ کیا۔

میں نے اس کے ہاتھ کے تعاقب میں دیکھا اور حیرت اور خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔

''ارے ۔۔۔۔۔ وہ رہا قلعہ ۔۔۔۔''

میری آنکھوں کے سامنے وہ قلعہ قوص تھا جس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر میں نے اسے گویا حفظ کر لیا تھا، سجاد گاڑی سے اتر کر اس عرب کا شکریہ ادا کرنے لگے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا۔ قلعہ تو اس نے ہمیں دکھا دیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ وہاں تک پہنچا کیسے جائے۔ بہر حال سجاد گاڑی لے کر چل پڑے، ایک جگہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ ہمیں گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔

آگ اگلتا سورج سر پر تھا۔ خیبر کی گرمی عروج پر تھی۔ میرا تو خیر شوق ایسا تھا کہ قدم اٹھ رہے تھے، مجھے بچوں پر حیرت تھی، جو نہ پیاس کی شکایت کر رہے تھے، نہ گرمی کی، مجھ سے آگے آگے قلانچیں

بھرتے بھاگ رہے تھے ایسے جیسے ٹھنڈے موسم میں ناران وکاغان کے مرغزاروں میں چہلیں کر رہے ہوں۔ میں بچوں کو تھوڑی بہت تاریخ بتاتی جا رہی تھی۔

''ان گلیوں میں ۷ھ میں خیبر کے یہودیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی تھی۔'' ہم سب تنگ، کچے، ناہموار راستوں سے گذرتے لمحہ بہ لمحہ اس پہاڑی کے قریب ہو رہے تھے جس کی بلندی پر قلعہ قوص سر اٹھائے کھڑا تھا۔ رقبہ میں چھوٹا، لیکن استحکام میں لاجواب۔ یہ قلعہ ایک سنگلاخ پہاڑی کے اوپر بنا ہوا تھا۔ اس کی تعمیر بجائے خود ایک عجوبہ تھی۔ سنگلاخ چٹانوں کے اوپر پتھروں کی چنائی کر کے پلیٹ فارم سا بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر قلعہ کی تعمیر کی گئی۔ یقیناً اس میں وہ سب کچھ رہا ہوگا جو کسی قلعہ میں ہونا چاہئے۔ مگر آثار قدیمہ والوں نے نیچے باڑ لگا کر اوپر جانے کا راستہ بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے ہم قلعہ میں داخل نہ ہو سکے۔ جس کا شاید زندگی بھر افسوس رہے گا۔ تاہم کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیا ہم اوپر تک چڑھ پاتے؟ ایسی عمودی چڑھائی؟؟ ناممکن۔

اس قلعہ کو فتح کرنے پر سیدنا علی کو خیبر شکن کا خطاب ملا تھا۔

خیبر میں یہ تنہا قلعہ نہیں تھا بلکہ ایسے ایسے چودہ قلعوں کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

چونکہ عربی زبان میں کئی قلعوں کے مجموعے کو خیبر کہتے ہیں۔ اس لئے اس جگہ کا نام خیبر پڑ گیا۔

چودہ سو سال اُدھر یہاں یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل آباد تھے۔ ان کے اپنے اپنے کھیت، چشمے، چراگاہیں، گڑھیاں اور قلعہ تھے، بعض مورخین نے ان قلعوں کی سات، بارہ اور چودہ لکھی ہے یہ وادی کی دونوں جانب اس طرح تعمیر کئے گئے تھے کہ بجائے خود ایک دفاعی یونٹ بھی تھے اور ایک دوسرے کو کمک بھی دے سکتے تھے۔ ان قلعوں کے نام یہ تھے۔

۱۔ حصن ناعم۔

۲۔ حصن قموص

۳۔ حصن الشق

۴۔ حصن النطاۃ

۵۔ حصن السلالم

۶۔ حصن الوطیح

۷۔ حصن الکتیبہ

۸۔ حصن صعب بن معاذ

۹۔ حصن قلۃ/قلعہ الزبیر

۱۰۔ حصن ابی

۱۱۔ حصن البر

۱۲۔ حصن مربط

۱۳۔ حصن نزار

۱۴۔ حصن قصارہ

یہ سارے قلعے تین حلقوں میں واقع تھے

۱۔ حلقہ النطاۃ:۔ میں پانچ قلعے تھے۔ ان میں ناعم، نطاۃ، صعب بن معاذ، قلعہ الزبیر اور حصن نزار شامل تھے۔

۲۔ حلقہ الشق:۔ میں تین قلعہ تھے۔ حصن البر، حصن ابی اور حصن الشق۔

۳۔ حلقہ کتیبہ:۔ اس میں واقع تین قلعوں کے نام قوص، وطیح، اور السلالم ہیں۔ ان میں یہودیوں کی بیس ہزار فوج تھی۔ بعض قلعوں پر منجنیقیں بھی نصب تھیں۔

غزوۂ خیبر کے دوران جنگ زیادہ تر پہلے حلقے میں ہوئی۔ دوسرے قلعے دفاعی اعتبار سے مستحکم ہونے کے باوجود زیادہ مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کے حوالے کردیئے گئے تھے۔

خیبر سازشوں کا گڑھ اس وقت بنا جب بنونضیر مدینہ سے نکالے گئے۔ یہ ربیع الاول ۴ھ کی بات تھی جب مسلمانوں نے بنونضیر کا محاصرہ کیا، یہ محاصرہ بیس دن جاری رہا بالاخر یہودی مذاکرات پر آمادہ ہوئے۔ رسول اللہ نے اسلحہ نہ لے جانے کی شرط پر ان کی جان بخشی کردی، وہ اسلحہ کے علاوہ اپنا تمام اثاثہ لے کر کچھ شام کی طرف جلاوطن ہوگئے اور کچھ خیبر میں جا بسے۔ آخر الذکر گروہ کا سردار حیی بن اخطب تھا اس نے اپنا اثر ورسوخ اس قدر بڑھالیا کہ پورے خیبر کا سردار بن گیا۔ ام المومنین حضرت صفیہ اسی کی بیٹی تھیں۔

۶ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی تب رسول اللہ کو قریش مکہ کی طرف سے یکسوئی نصیب ہوئی اور

وہ خیبر کی طرف متوجہ ہوسکے، لہذا حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ میں صرف بیس دن قیام کیا اور محرم ۷ھ میں منادی کرادی گئی کہ وہ سب لوگ جہاد کی تیاری کریں جو حدیبیہ میں حاضر تھے۔ رسول اللہ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ عموماً اپنے ہدف کو خفیہ رکھتے تھے۔ لہذا جب مدینہ سے شمال کی جانب کوچ کیا گیا تو یہ راستہ وہ تھا جو خیبر کو بھی جاتا تھا اور بنوغطفان کی طرف بھی۔ مدینہ میں موجود منافقین خصوصاً عبداللہ ابن ابی نے اس کوچ کی خبر یہود خیبر کو پہنچادی۔ یہود خیبر نے حصول مدد کے لئے اپنے قاصد بنوغطفان کی طرف دوڑا دیئے ان کی خواہش تھی کہ اگر مسلمان خیبر کی طرف آئیں تو بنوغطفان عقب سے ان پر حملہ کردیں، اس کے عوض یہ لالچ دیا کہ اگر ہم مسلمانوں سے جنگ جیت گئے تو نصف پیداوار انہیں (بنوغطفان کو) دیں گے۔

رسول اللہ کہ غیر معمولی سپہ سالار تھے، نے مقام رجیع میں پڑاؤ کیا۔ مقام "رجیع" بنوغطفان اور خیبر کے درمیان تھا۔ عسکری اعتبار سے بہت ہی موزوں جگہ تھی کہ بیک وقت دونوں دشمنوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ غطفانی اپنی چار ہزار کی فوج لے کر اہل خیبر کی مدد کے لئے روانہ ہوگئے تھے۔

جب انہیں مسلمانوں کی مقام رجیع میں پڑاؤ کی اطلاع ملی تو انہیں اپنی آبادیوں کی سلامتی کی فکر دامن گیر ہوئی لہذا وہ یہودیوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ جنگ شروع ہوئی تو روزآنہ مجاہدین رجیع سے خیبر جاتے، حملے کرتے اور واپس آجاتے۔ خیبر کے یہودیوں کو بنوغطفان کے علاوہ شام کی رومی حکومت سے بھی امداد کی توقع تھی لہذا رسول اللہ نے خیبر پر جنوب کے بجائے شمال کی طرف سے حملہ کا حکم دیا۔ رسول اللہ کی ان حربی تدابیر سے یہود خیبر اپنے حلیفوں کی مدد سے محروم ہوکر تنہا رہ گئے۔ اس وقت رئیس خیبر سلام بن مشکم تھا اس نے انتظامات کو آخری شکل دی عورتوں اور بچوں کو قلعہ کتیبہ میں منتقل کیا، سپاہیوں کو قلعہ نطاۃ اور قوص میں جمع ہونے کا حکم دیا اور خوراک اور رسد کو قلعہ ناعم میں محفوظ کرادیا۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے اسی قلعہ ناعم کو نشانہ بنایا۔ رسول اللہ کا پڑاؤ رجیع میں تھا یہاں سے فوجیں اپنے افسروں کی سرکردگی میں جاتیں، اور حملے کرتیں۔ سب سے پہلے حضرت عمرو بن مسلمہ حملہ فوج کے افسر بنائے گئے۔ وہ مسلسل پانچ دن تک قلعہ ناعم پر حملہ کرتے رہے۔ پانچویں دن شہید ہوگئے تو فوج کی کمان ان کے بھائی محمد بن مسلمہ نے سنبھالی اور قلعہ فتح کرلیا۔

اس کے بعد قلعہ صعب بن معاذ کی طرف رسول اللہ نے حباب بن منذر کی ڈیوٹی لگائی۔ چند

خیبر کی پرانی بستی

پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ قموص کی فصیل اور تیر اندازی کے محفوظ مقامات

دنوں کی جدوجہد کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد قلعہ اُبی بھی حباب بن منذر نے فتح کیا۔ اللہ اکبر کے دل دہلا دینے والے نعروں کی گونج میں حضرت ابو دجانہ مسلمانوں کو لے کر دلیرانہ قلعہ کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ قلعہ کے اندر زبردست دو بدو لڑائی ہوئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔

پھر قلعہ البر گیا۔

پھر قلعہ قلّہ یعنی حصن زبیر، زیر ہوا۔

معاملہ قلعہ قموص پر آ کر رک گیا۔ یہ قلعہ مرحب کی زیر کمان تھا

وہ ہزار سواروں کے برابر بہادر سمجھا جاتا تھا۔ بیس دن ہو گئے تھے قلعہ قموص کا محاصرہ کیے ہوئے، مگر مرحب کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔

بالآخر علم سیدنا علیؓ کو دیا گیا۔ ایک طرف سے شیر خیبر، مرحب رجز پڑھتا ہوا نکلا

دوسری طرف سے شیر خدا رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں کود پڑے۔

میں وہی ہوں جس کی ماں نے نام حیدر رکھا

جنگل کے شیر کی طرح نہایت مہیب

دونوں برق و بلا کی طرح پینترے بدل بدل کر لڑتے رہے بالآخر اللہ کا شیر غالب آ گیا، مرحب کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر اس کا بھائی یاسر دیوانہ وار مقابلے کے لئے نکلا، لیکن حضرت زبیر نے اسے اپنی تلوار کی نوک پر دھر لیا، مسلمانوں نے فلک شگاف نعروں کے درمیان قلعہ کا دروازہ گرا دیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔

قلعہ قموص کے نامور سرداروں میں کنانہ بن ابی الحقیق بھی تھا۔ جس کی بیوی صفیہ بنت حُی بن اخطب کو بعد میں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ جنگ کے دوران کنانہ قلعہ میں ہی مارا گیا اور اس کے تمام اہل و عیال جن میں حضرت صفیہ بھی تھیں قید ہو گئے۔

میں جھلسی ہوئی سنگلاخ چٹانیں دیکھتی رہی، خیبر کی فضا کو سونگھتی رہی، زمانہ امن کے خیبر کا تصور کرتی رہی، گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں، کھیتوں اور باغات میں مصروف مرد، شام کی مجالس، بے فکری، فارغ البالی، لپے پُتے مٹی کے مکانوں سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو، اپنے شوہروں کا انتظار کرتی بچی

خیبر کا جدید شہر (باب الداخلہ)

قلعہ قموص۔ خیبر
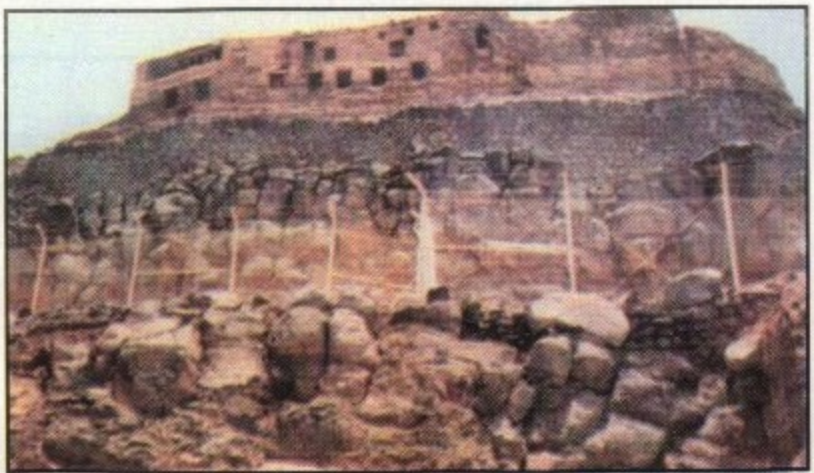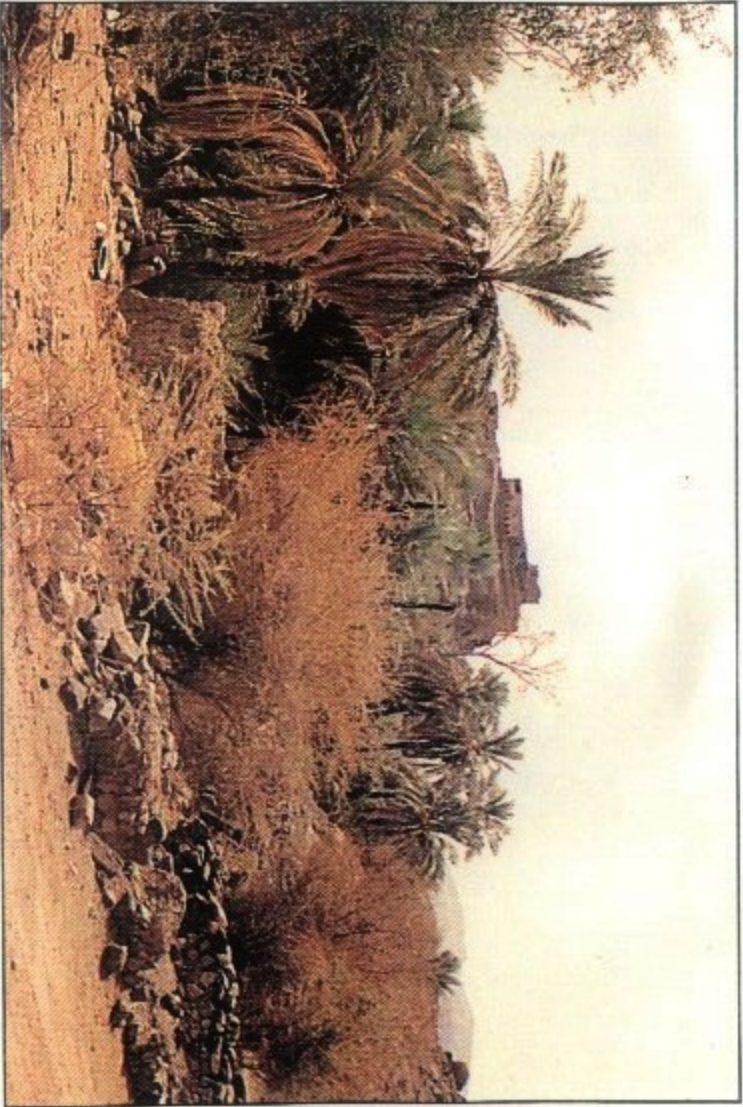
عقب میں قلعہ قموص نظر آ رہا ہے۔

سنوری دوشیزائیں، سنگلاخ گڑھی کے کسی چوبارے سے جھانکتی ہوئی وہ سترہ سالہ دوشیزہ جو کنانہ بن ابی الحقیق کی بیوی تھی صفیہ بنت حُی

صفیہ کے باپ اور نانا دونوں اپنی قوم کے معزز سردار تھے۔صفیہ کے والد حُی بن اخطب بنونضیر کے سردار تھے اور ان کی ماں برّہ بنت سموان بنوقریظہ کے سردار کی بیٹی تھیں۔صفیہ کو خیبر کے دوروساء کی بیوی بننا نصیب ہوا۔انکا پہلا نکاح سلام بن مشکم القرظی سے ہوا، جو مشہور شاعر اور سردار تھا اس سے طلاق ہو جانے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق نے عقد کیا۔یہ بھی سلام سے کچھ کم مرتبہ نہ تھا۔قموص کا سردار تھا اور یہیں اپنے اہل و عیال کے ساتھ بود و باش رکھتا تھا۔اس طور صفیہ کو حسب نسب کا بھی امتیاز حاصل تھا۔ دولت و ثروت کا بھی، پھر حسن و جمال کا بھی۔

خیبر کی سیاہی میں مجھے ہر جگہ اس ہیرے کی جھلکیاں نظر آتی رہیں۔

جنگ خیبر یہودیوں کے لئے ایسی تباہ کن تھی کہ پھر وہ آئندہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے اس جنگ میں حضرت صفیہ کے شوہر بھی مارے گئے اور بھائی بھی، اسی لئے اسیران جنگ میں حضرت صفیہ کی حالت یقیناً نہایت قابل رحم تھی۔ جب قلعہ قموص فتح ہو چکا تو حضرت صفیہ اور ان کی چچازاد بہن کو حضرت بلال اپنے ساتھ لے کر چلے تا کہ رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔راستہ میں ان کا گزر یہودیوں کی لاشوں پر ہوا، صفیہ کی چچازاد بہن یہ ہولناک منظر دیکھ کر چیخ اٹھی اور سر پر خاک ڈالنے اور بین کرنے لگی

لیکن حضرت صفیہ نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔وقار و متانت سے چلتی رہیں حالانکہ ان لاشوں میں ایک لاش ان کے شوہر کی بھی تھی۔

جب جنگ سرد ہوئی اور اموال غنیمت کی تقسیم کا موقع آیا تو دحیہ کلبی نے رسول اللہ سے ایک لونڈی کی درخواست کی۔آپ نے انتخاب کی اجازت دے دی دحیہ کلبی نے حضرت صفیہ کو پسند کیا۔لیکن بعض صحابہ نے حضرت صفیہ کے حسب و نسب اور مرتبہ کا خیال کرتے ہوئے رسول اللہ سے گزارش کی

''صفیہ بنی نضیر و بنی قریظہ کی رئیسہ ہے وہ تو آپ ہی کے لئے مناسب ہے''۔

رسول اللہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا دحیہ کو دوسری لونڈی عنایت کر دی گئی اور صفیہ کو عدت کی مدت گزارنے کے لئے سیدہ ام سلمہ کے حوالے کر دیا گیا۔جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں۔

خیبر کی فتح کے بعد دو اور یہودی بستیوں، فدک اور تیماء کی باری تھی۔ مسلمانوں کا لشکر فدک کی طرف بڑھا، اہل فدک، اہل خیبر کا حشر دیکھ چکے تھے، لہٰذا نصف پیداوار کے خراج کی ادائیگی پر معاہدہ صلح کرلیا۔

پھر تیماء کی باری آئی۔ تیماء کے خوشحال یہودیوں نے بھی نصف پیداوار بطور خراج دینے کی شرط پر صلح کرلی۔

ان تمام معاملات میں حضرت صفیہ کی مدت عدت گزر گئی۔ ان کے دل پر لگے زخموں سے خون رسنا بھی بند ہوگیا، ام سلمہ جیسی شفیق اور خوش مزاج خاتون کے ساتھ رہتے اور عام مسلمانوں کا اخلاق دیکھتے، ان سے مانوس بھی ہوگئیں، تو خیبر سے واپسی پر مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی گئی اور وہیں دعوت ولیمہ بھی ہوئی۔

صہبا سے چلنے لگے تو رسول اللہ نے صفیہ کو اپنے اونٹ پر سوار کیا اور خود اپنی عبا سے ان پر پردہ کیا تا کہ لوگوں کو صفیہ کی حیثیت (Status) کا پتہ چل جائے۔ رسول اللہ نے ان کے مرتبہ کے مطابق ان سے سلوک کیا اور انہیں ازواج مطہرات میں داخل کیا۔

جب آپ مدینہ پہنچے تو سیدہ صفیہ کو حارث بن نعمان کے مکان میں اتارا گیا۔ مدینہ میں سیدہ صفیہ کے حسن و جمال کا چرچا ہوا تو دیگر ازواج مطہرات ایک ایک کر کے انہیں ملنے اور دیکھنے گئیں۔ سیدہ زینب بنت جحش، سیدہ حفصہ، سیدہ جویریہ، جب سیدہ عائشہ انہیں دیکھ کر واپس آرہی تھیں تو رسول اللہ سے مڈ بھیڑ ہوگئی

''عائشہ وہ تمہیں کیسی لگیں'' رسول اللہ نے پوچھا

''یہودیہ ہے'' سیدہ عائشہ کو ان سے جو رشک آیا ہوگا اس کی بناء پر کہا۔

''یہ نہ کہو'' رسول اللہ نے فرمایا ''وہ تو مسلمان ہوگئی ہے، اور اسکا اسلام بہتر ہے''۔

سیدہ صفیہ نے خاندان رسول کی خواتین کو تحفے بھی دیئے۔ سیدہ فاطمہ اور رسول اللہ کی بیویوں میں آپ نے سونے کی بالیاں تقسیم کردیں۔

چونکہ سیدہ صفیہ کا مدینہ میں کوئی مضبوط میکہ نہیں تھا۔ پھر جو دکھ انہوں نے غزوۂ خیبر میں اٹھایا تھا اس وجہ سے رسول اللہ سیدہ صفیہ کی غیر معمولی دلجوئی کرتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے اور ازواج

(۱) ۲۰۰۰ء کے سفر عمرہ میں ہم اس جگہ پہنچے، اس کا احوال آگے بیان کیا گیا ہے۔

مطہرات بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق سے سیدہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا۔ یہ بہت گھبرائیں اور بے اختیار رونے لگیں۔ آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو خود تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو پونچھنے لگے، لیکن سیدہ صفیہ کا رونا ختم نہ ہوا تو آپ ﷺ نے سیدہ زینب بنت جحش سے کہا:

''زینب تم صفیہ کو اپنا ایک اونٹ دے دو''

سیدہ زینب جو رسول اللہ کی پھوپھی زاد بہن بھی تھیں راضی نہ ہوئیں انہوں نے کہا'' کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں؟''

یہ جملہ رسول اللہ کو سخت ناگوار گزرا۔ اور دو تین ماہ تک حضرت زینب سے بات نہ کی۔ سیدہ عائشہ مسلسل صلح صفائی کی کوشش کرتی رہیں تب آپ ﷺ نے انہیں معاف کیا۔

رسول اللہ کی اس درجہ عنایت نے سیدہ صفیہ کے دل میں رسول اللہ کی ایسی محبت جگا دی کہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تمام ازواج آپ ﷺ کی عیادت کی غرض سے آپ ﷺ کے قریب جمع تھیں تو آپ ﷺ کی تکلیف نے سیدہ صفیہ کو تڑپا دیا

''یارسول اللہ کاش آپ کی تمام تکالیف مجھے مل جائیں''

یہ کوئی بناوٹی جملہ نہ تھا کیونکہ صادق رسول نے اس کی تائید کی اور کہا

''قسم اللہ کی وہ سچ کہتی ہے''

سترہ سال کی عمر میں آپ ﷺ کی زوجیت میں آنے والی سیدہ صفیہ نے صرف تین سال آپ ﷺ کی معیت میں گزارے پھر بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور چالیس طویل سال بیوگی کے گزار کے ۵۰ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں، وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ میری متروکہ املاک کا ثلث میرے بھانجے کو دے دیا جائے، آپ نے ایک لاکھ درہم چھوڑے تھے۔ چونکہ ان کا بھانجا یہودی تھا لہٰذا لوگوں نے وصیت پوری کرنے میں تامل کیا سیدہ عائشہ کو پتہ چلا تو سخت ناراض ہوئیں۔

''لوگو اللہ سے ڈرو، اور صفیہ کی وصیت پوری کرو۔''

وصیت پوری کی گئی کہ ام المومنین کی حکم عدولی کی جرأت کس میں تھی؟

سیدہ صفیہ سے متعلق واقعات یاد آتے رہے، کچھ میں بچوں کو بتاتی رہی کچھ کو خود ہی دہراتی رہی ۔قلعہ قموص کے گردونواح کے کھنڈرات کو کھوجتے ،ڈیڑھ دو گھنٹے ہو گئے ،تو ہم واپس اپنی گاڑی میں آبیٹھے۔

ہماری اگلی منزل العلاء کا شہر تھا۔ جہاں رات قیام کر کے مدائن الصالح جانا تھا

☆☆☆☆☆☆

مدائن صالح

خیبر میں قلعہ قموص کی ممکنہ سیاحت کے بعد ہم نے خیبر کی چھوٹی سی بستی کو خیر باد کہا اور اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گئے ۔ یہ 'العلاء' کا شہر تھا جو مدائن صالح کے نزدیک تھا ہمارا ارادہ تھا کہ 'العلاء' میں رات گزار کر مدائن صالح کی سیاحت کو جائیں گے۔

وہ ۹ رجولائی کا گرم دن تھا، جب ہم خیبر سے نکلے تو شام ہونے لگی تھی۔ خیبر سے العلاء جانے والی سڑک دورویہ ہے، جبکہ مدینہ سے خیبر تک کی سڑک یک رویہ تھی۔ سعودی عرب کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ صحراؤں میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے، اور سڑکیں بھی انتہائی چوڑی، رواں اور مضبوط جس نے صحراؤں کے سفر کو بھی سہل اور آسان بنا دیا ہے۔

ہماری گاڑی رواں دواں تھی البتہ اس سارے سفر میں شدید ویرانی کا احساس ہو رہا تھا خیبر سے العلاء جاتے ہوئے راستے میں کوئی پیٹرول پمپ نہیں ملا، حالانکہ سعودی عرب میں ہائی وے پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پٹرول پمپ ملتے ہیں جس سے آبادی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ دونوں اطراف اونچے نیچے، پیلے، سرخی مائل کتھئی پہاڑ یا دور تک پھیلی ہوئی ریت اور اسکے درمیان سے نکلتی ہوئی اسفالٹ کی شفاف سڑک، سڑک پر ٹریفک بھی خال خال تھی۔ میلوں چلنے کے بعد کبھی کوئی گاڑی ہمارے قریب سے گذر جاتی، پھر وہی دشت کی خاموشی! راستہ میں کوئی 'مرکز طریق امن' بھی نہ ملا، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خیبر سے العلاء تک کا راستہ نہایت خطرناک ہے اگر گاڑی خراب ہو جائے یا کوئی اور مسئلہ پیدا ہو جائے تو مسافر کیا کرے؟ یہ سوچ سوچ کر مجھے تو بوکھلاہٹ ہونے لگی۔

"ہم نے تنہا نکل کر غلطی کی" بالآخر میں نے سجاد کو اپنی پریشانی میں شریک کرنا چاہا

"کیوں؟"

مجھے سجاد کے اطمینان پر حیرت ہوئی ''کس قدر ویران راستہ ہے، نہ آدم نہ آدم زاد، کوئی انسانی آبادی نہیں، ایک اور گاڑی ہوتی تو کم از کم ہمیں سہارا ہوتا۔ خدانخواستہ ہماری گاڑی خراب ہوگئی یا کوئی اور ایمرجنسی ہوگئی تو اس ویرانے میں ہم کیا کریں گے؟''

''حیرت ہے، ابھی تک کوئی پٹرول پمپ بھی نہیں آیا'' اب سجاد بھی فکر مند ہوگئے۔

ہم اپنی پریشانی بچوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے لہذا اس گفتگو کو یہیں ختم کر دیا، البتہ اپنے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لئے میں قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی اور میری خواہش تھی کہ رات اترنے سے قبل، یہ ہولناک سفر ختم ہو جائے اور ہم انسانی آبادی میں پہنچ جائیں۔

اترتی ہوئی شام اس اعتبار سے اچھی تھی کہ موسم کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ خیبر سے العلاء تقریباً دو سو کلومیٹر کا راستہ ہے۔ جو مغرب تک ہم طے کر چکے تھے۔ وہ راہنما نیلے بورڈ جو شاہراہوں پر لگے ہوتے ہیں بتا رہے تھے کہ العلاء بہت نزدیک ہے جب ہی داہنی جانب ہمیں ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ سجاد نے گاڑی وہاں لے جا کر روک دی۔ پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی بقالہ (جنرل اسٹور) تھا، پیچھے باتھ روم، تھوڑے فاصلے پر چھوٹی سی جگہ کو گھیر کر مسجد بنائی گئی تھی۔ بقالہ کے پیچھے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، گاڑی سے اتر کر ہم سب اپنے اپنے کاموں سے لگ گئے۔ سجاد بقالہ چلے گئے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لینے، بچے ایک ایک کر کے باتھ روم جانے لگے، میں مغرب کی نماز کے لئے وضو کرنے لگی اور ثناء ہمارے لئے چائے بنانے لگی۔ چائے بنانے کا سارا سامان ہمیشہ دوران سفر میرے ساتھ ہوتا ہے، جگ میں گرم پانی، ٹی بیگ، پوڈر دودھ اور شکر۔

یہاں ہم تقریباً نصف گھنٹہ ٹھہرے، سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا، ہلکا ہلکا اندھیرا صحرا کو نگلنے لگا تھا جب ہم پھر العلاء کی جانب روانہ ہوئے۔ جلد ہی شہر کے آثار شروع ہوگئے، چک پوسٹ بھی ملا، جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ یہ چھوٹا مگر انتہائی صاف ستھرا اور جدید طرز کا شہر تھا۔ سڑکوں پر جو پہلا شخص چلتا ہوا نظر آیا وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔

''چلو بھئی یہاں بھی اپنے پاکستانی بھائی نظر آگئے'' راستے کا اعصابی تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم دشت کی ویرانی سے نکل کر انسانی آبادی میں آگئے تھے۔ مرکزی سڑک ہی پر ایک پیٹرول پمپ سے ہم نے گاڑی میں پیٹرول ڈلوایا بلکہ ٹنکی بھروالی۔ یہاں کام کرنے والے دو لڑکوں میں سے ایک لاہور کا تھا اور

دوسرا لکھنو کا۔ سجاد ان سے مدائن صالح جانے کے بارے میں اطلاعات حاصل کرتے رہے۔

''آپ کو مدائن صالح جانے کے لئے ورقہ (LETTER) لینا ہوگا'' وہ لڑکا سجاد کو بتا رہا تھا ''یہ ورقہ آپ کو وزارت الداخلیہ سے ملے گا، اور وزارت الدخلیہ کا دفتر اسی سڑک پر آگے جا کر داہنے ہاتھ پر ہے۔''

رات ہو چکی تھی تمام دفاتر بند ہو چکے تھے، لہذا یہ ضروری تھا کہ ہم بھی رات گذارنے کا کوئی بندوبست کرتے لہذا ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ چند منٹ سڑکوں پر گھومنے کے بعد ہمیں ''مطعم مدائن'' نظر آیا۔ سجاد معلومات کرنے ہوٹل میں چلے گئے اور ہم گاڑی میں بیٹھے ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

''ہوٹل میں جگہ نہیں ہے'' سجاد نے واپس آکر اطلاع دی ''تاہم تین بستروں کا ایک کمرہ ابھی خالی ہو رہا ہے، صفائی کرا کے وہ ہمیں دے دیں گے''

''ہوٹل میں اتنا رش کیوں ہے؟''

''لیلۃ الخمیس'' (جمعرات کی رات) ہے'' سجاد نے بتایا ''کل چھٹی ہے، لوگ تفریح کے لئے آئے ہوں گے۔''

کچھ دیر انتظار کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ کمرہ خالی ہو گیا ہے۔ ہم نے زیادہ تر سامان گاڑی ہی میں رہنے دیا۔ ضرورت کا کچھ سامان لے کر مطعم مدائن میں داخل ہوگئے۔ پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۲۲ ہمارے لئے صاف کیا گیا تھا۔ کمرہ میں تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ٹی وی، فریج، الماری ہر چیز موجود تھی، اے۔ سی تیز چل رہا تھا جسکی وجہ سے کمرہ خاصا ٹھنڈا تھا، صاف ستھرا بستر دیکھتے ہی بچے بستروں پر دراز ہوگئے، جی تو میرا بھی ایسی ہی کسی حرکت کا چاہ رہا تھا مگر ابھی دو مراحل طے کرنے تھے ایک تو رات کا کھانا کھانا تھا کہ سخت بھوک لگ رہی تھی، دوسرے قصر ہی سہی، عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔

سجاد کھانا لینے چلے گئے اور میں چیزوں کو مناسب جگہ رکھنے لگی، کھانا آیا، بمشکل تمام بچے اٹھے، کھانا کھا لیا گیا، میں نے نماز پڑھی اور بستروں پر ڈھے گئے۔

نئی جگہ تھی مگر جلد ہی نیند آگئی،

پھر صبح ہی صبح سجاد نے جگا دیا ''اب اٹھ جاؤ، بچوں کو تیار کرالو، میں ورقہ لے کر اور ناشتہ لے کر آتا ہوں۔''

''بھلا اتنی صبح نکلنے کی کیا ضرورت؟''

''بیگم صاحبہ اتنی صبح بھی نہیں ہے۔ سات بج چکے ہیں، مدائن صالح صبح ہی صبح ہو آئیں، ریاض آج ہی واپس جانا ہے۔''

مجھے میاں صاحب کا یہ پروگرام بالکل پسند نہیں آیا۔ آج جمعرات تھی، ہم کل یعنی جمعہ تک بھی ریاض پہنچ جاتے تو ٹھیک تھا۔ مگر سجاد اپنا پروگرام سنا کر جا چکے تھے، یہ دوسری بات کہ ان کے جانے کے بعد ہم نے پھر لمبی تان لی، ناشتہ آیا تو اٹھنا ہی پڑا۔

''ورقہ نہیں ملا''

''کیوں؟''

ابھی تک دفتر نہیں کھلا''

''پھر کیا کریں؟''

''ناشتہ کرلو، تیار ہو جاؤ، چلتے ہیں، دیکھا جائے گا''

ہم نے ایسا ہی کیا اور صبح ہی مدائن صالح کے لئے نکل گئے۔ العلاء سے مدائن صالح تقریباً ۲۵ کلومیٹر ہے، حسب سابق سڑک صاف ستھری، کشادہ اور شاندار تھی، البتہ اب دونوں جانب جن پہاڑوں کا سلسلہ تھا وہ سعودی عرب کے دیگر پہاڑوں سے یکسر مختلف تھے۔ ترشے ہوئے اور ہوا کے کٹاؤ (AIR EROSION) کے زیر اثر آئے ہوئے، سرخی مائل کتھئی نرم پہاڑ، ان پہاڑوں میں وہ سنگلاخی اور کرختگی نہیں تھی جو مکہ یا خیبر کے پہاڑوں میں تھی۔

وہ منظر اب تک میری آنکھوں میں محفوظ ہے، دونوں جانب پہاڑی سلسلے، پیلی ریت، تا حد نظر اسفالٹ کی سیاہ شاندار سڑک، صبح کا سہانا منظر، صحرا کی صبح بھی اپنا مخصوص حسن رکھتی ہے، فطرت کے یہ نظارے شہروں میں کہاں ملتے ہیں؟

شہر سے نکلتے ہوئے نیلے بورڈ پر لکھا ہوا دیکھا تھا

''مدائن الصالح ۲۵ کلومیٹر''

ہمارے حساب سے ۲۵ کلومیٹر ہو چکے تھے، مگر مدائن صالح کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

''یہ پہاڑ سو فیصد مدائن صالح کے ہیں'' میں نے کہا ''بستی یہیں کہیں ہونی چاہیے'' جو پہاڑ
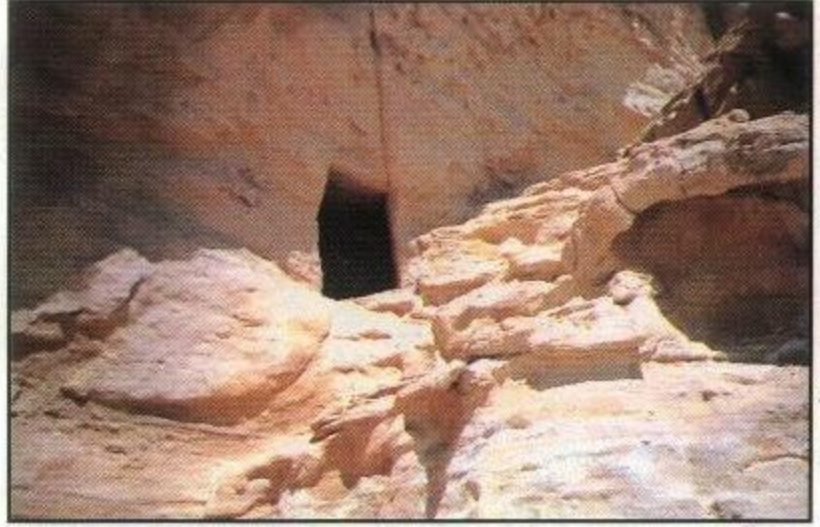
پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے جانے والے مقابر (مدائن صالح۔ ۹ر جولائی ۱۹۹۷ء)
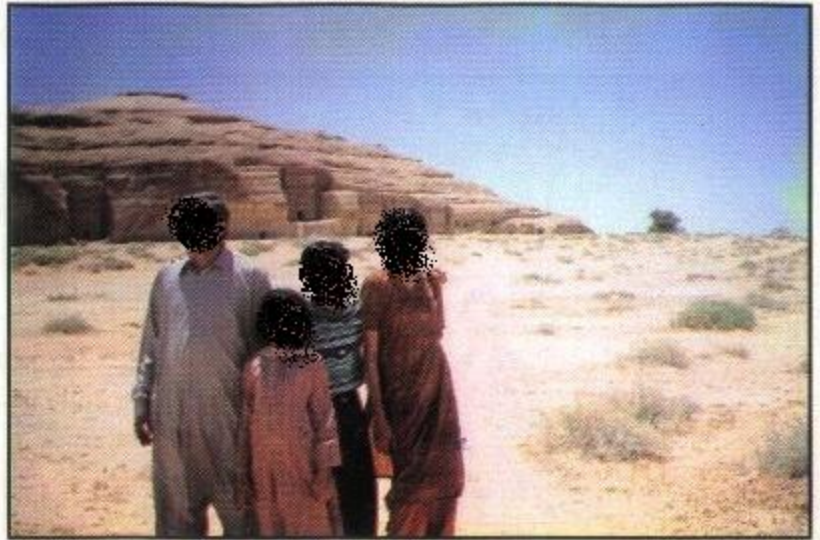
الخریمات، منطقہ قرالبنت۔ عقب میں پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے جانے والے مخصوص مکانات اور قصر
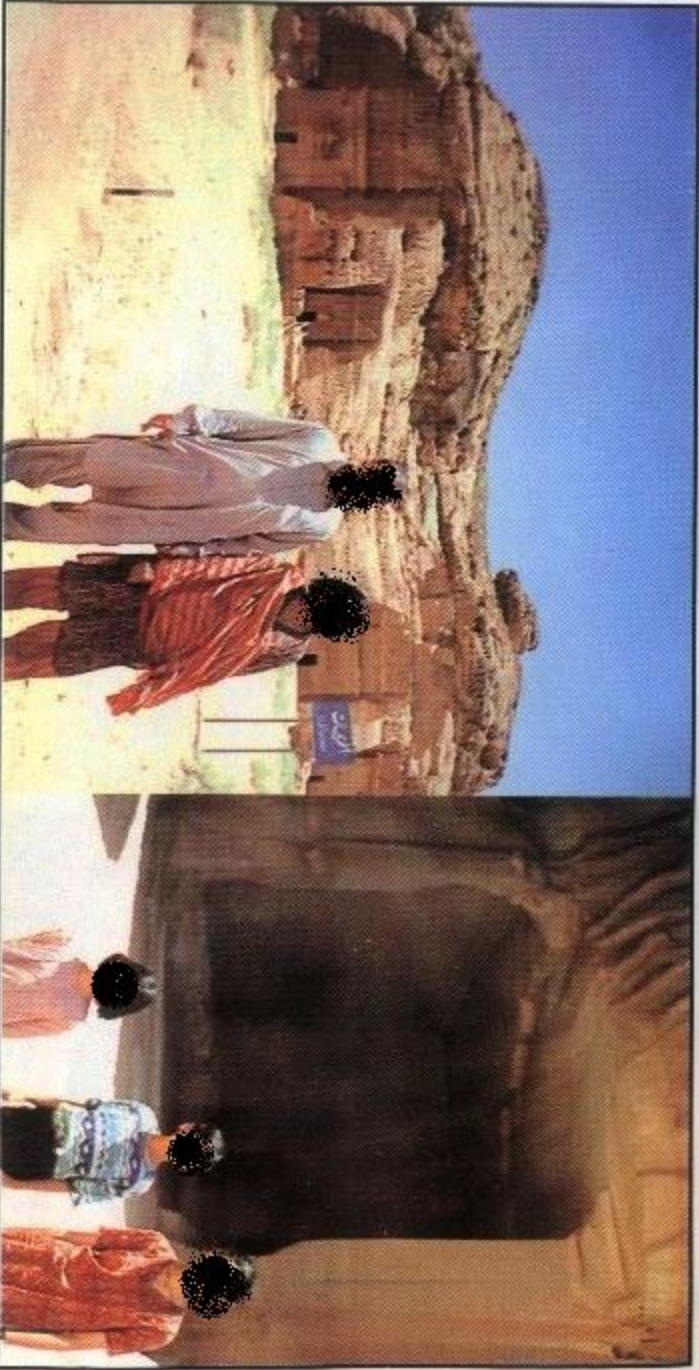
ثنا، سعود، سعدیہ مدائن صالح میں "دیوان کے سامنے (۱۹۹۷ء)"

الخریمات، منطقہ قصر البنت میں (۱۹۹۷ء)

میں تصویروں میں دیکھ چکی تھی، یہ انہی پہاڑوں جیسے تھے، مگر وہ آثار کہاں تھے؟

''شائد ہم آگے نکل آئے ہیں'' سجاد نے گاڑی واپس گھمائی، چند کلومیٹر کے بعد ایک قدرے تنگ سڑک بائیں جانب مڑتی نظر آئی،

چند لمحے ہم نے سوچا اور پھر گاڑی اسی سڑک پر ڈال دی، یہ تنگ سڑک تھی اور اس پر کوئی ٹریفک نہیں تھا، اس قدر سناٹا اور ویرانی تھی کہ خوف محسوس ہو رہا تھا، مگر میں نے خوف کا اظہار نہیں کیا کہ مدائن صالح جانا زیادہ ضروری تھا، خواہ خوف کے کتنے ہی دریا پار کرنے پڑتے۔ چند کلومیٹر چلنے کے بعد وہ سڑک داہنی جانب مڑ گئی، ہم بھی مڑ گئے، ذرا آگے جا کر پولیس چوکی آ گئی، اس سے آگے ''منطقۃ آثار'' (ANTIQUE) شروع ہو رہا تھا، گویا ہم صحیح جگہ پہنچ چکے تھے۔ پولیس چوکی پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہمارے پاس ورقہ نہیں تھا۔ سجاد نے پولیس والے کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی کہ وزارۃ الداخلیہ کا دفتر ابھی کھلا نہیں ہے ہمیں واپس ریاض پہنچنا ہے۔ مگر سعودی شرطے نے معذرت کر لی۔

''ورقہ لانا ہی پڑے گا'' سجاد نے آ کر اطلاع دی۔ بعض سرکاری دفاتر میں جمعرات اور جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے، ہمیں یہ خدشہ تھا کہ اگر آج دفتر نہ کھلا تو کیا ہوگا؟ لیکن شرطہ کا کہنا تھا کہ دفتر کھلے یا نہ کھلے ایک افسر ورقہ دینے ضرور آئے گا۔

ہم واپس آ گئے۔ سجاد کی مہم جو طبعیت نے واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کیا اب پتہ چلا کہ اصل راستہ یہی تھا، جو خاصا آباد تھا، اس راستہ پر ٹریفک بھی تھی اور یہ العلاء کی پرانی بستی سے بھی گزرتا تھا۔ ہم راستے کی جزیات سمیٹتے، اور جگہ جگہ رک کر تصاویر بناتے ہوٹل واپس آ گئے۔

چائے پی کر سجاد پھر ورقہ کے حصول کے لئے چلے گئے اور میں موقعہ غنیمت جان کر پھر سو گئی لیکن جلدی ہی اٹھنا پڑا سجاد ورقہ لے آئے تھے، ایک بار پھر ہم مدائن صالح جانے کے لئے نکلے، گیارہ بج چکے تھے، گرمی بڑھنے لگی تھی، ایک نزدیکی بقالہ پر رک کر ہم نے پانی کی ٹھنڈی بوتلیں لیں کہ ہم مدائن صالح کی خاک اس عالم میں چھاننے جا رہے تھے کہ سورج نصف النہار پر ہوتا۔

''وزارت الداخلیہ میں جو پولیس چیف ملا اس کا نام احمد عبداللہ دوسری تھا'' سجاد ورقہ ملنے کی تفصیل بتانے لگے ''بڑا نفیس، کھڑا اور ملنسار بندہ تھا۔ میں نے تمہارا وزٹنگ کارڈ اس کو دیا تو اس نے پوچھا۔ تمہاری بیوی کے نام کے ساتھ تمہارا نام کیوں لکھا ہوا ہے؟''
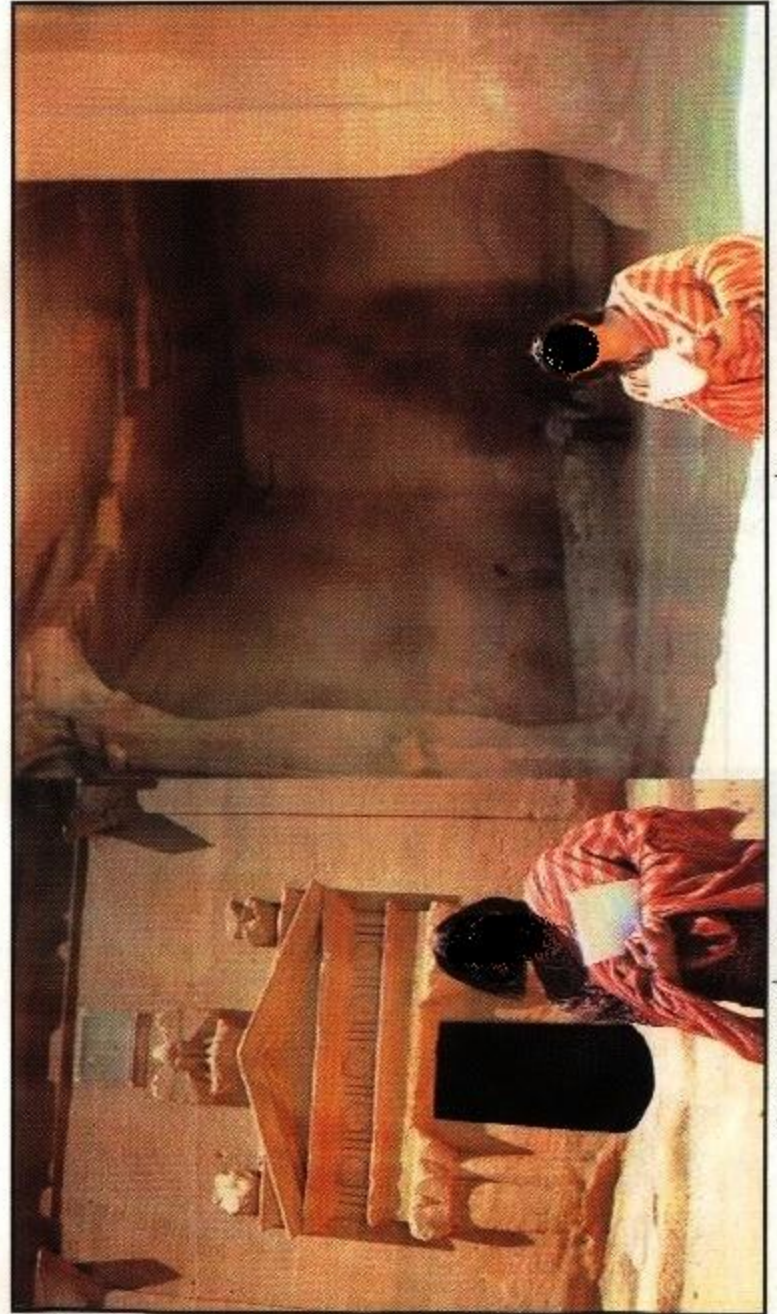
دیوان۔ مدائن صالح

مدائن صالح میں ایک قبر کے آگے

''ھذا فی طریق امریکی'' (یہ امریکی طریقہ ہے) میں نے اسے جواب دیا۔

''مافی شرعی'' (مگر یہ اسلامی اور شرعی طریقہ نہیں ہے) احمد عبداللہ الدوسری نے کہا۔

سعودی عرب میں طریقہ یہ ہے کہ لڑکیاں ہمیشہ اپنے باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی ان کے ناموں میں شوہر کے نام کا لاحقہ نہیں لگتا۔ دوسری تہذیبوں میں جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا خاندان تبدیل ہوگیا ہے اور اب وہ اپنے شوہر کے خاندان کا ایک فرد سمجھی جاتی ہے لہذا وہ اسی خاندان کا خاندانی نام اپنے نام کے ساتھ لگا لیتی ہے اور خود لڑکی کا اپنا خاندان اس کے لئے کم یا غیر اہم ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ اسلامی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں میاں اور بیوی دو پارٹنر ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک اپنا ایک قانونی تشخص رکھتا ہے۔ دوسو سال قبل تک مغربی عورت کا کوئی قابل ذکر قانونی تشخص نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ملکیت کے بارے میں بھی شوہر کی مرضی کی پابند ہوتی تھی۔ خواہ اس کی یہ ملکیت اپنے شوہر کی زوجیت میں آنے سے قبل ہی کی کیوں نہ ہو۔ بعض تہذیبوں میں بیوی کی ذاتی چیزیں بھی اس کے شوہر کی ملکیت تصور ہوتی ہیں اور وہ بیوی کی اجازت کے بغیر ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرسکتا ہے۔

اسلام میں یہ صورت حال برعکس ہے۔ اسلام میں ایک عورت اپنا مکمل قانونی تشخص رکھتی ہے، جیسے کوئی مرد رکھ سکتا ہے، وہ اپنی جائیداد اور دیگر ملکیت کے بارے میں اپنے شوہر کی اجازت کی پابند نہیں ہوتی، اس کے بارے میں وہ ذاتی فیصلہ کرسکتی ہے۔ شادی مرد اور عورت کے مابین ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ اس معاہدہ کو فسخ کرنے کا حق دونوں فریقین کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ فریقین میں سے ہر ایک کا نام اس کا ''ذاتی نام'' ہوتا ہے۔ عورت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا نام ہی اختیار کرے اور شوہر کے نام کا، یا شوہر کے خاندانی نام کا لاحقہ لگانے کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ خاندانی طور پر وہ اپنے باپ ہی کے نام سے شناخت ہوگی۔ مثلاً عائشہ بنتِ ابی بکر، رسول اللہ سے شادی سے قبل بھی عائشہ بنت ابی بکر تھیں اور شادی کے بعد بھی عائشہ بنت ابی بکر ہی رہیں، فاطمہ بنت محمد شادی کے بعد بھی فاطمہ بنت محمد ہی رہیں، ان کے نام کے ساتھ ان کے شوہر علی کا لاحقہ نہیں لگایا گیا۔ سعودی عرب میں آج بھی یہی رواج ہے۔ مجھے اس بات کا علم ڈیڑھ دوسال قبل یہیں ہوا تھا، جب کئی خواتین سے بحث ومباحثے ہوئے تھے، یہ وہ خواتین تھیں جو گذشتہ سترہ و اٹھارہ برسوں سے سعودی عرب میں رہ رہی ہیں اور اپنے ناموں کے آگے اپنے باپ کا نام

لگاتی ہیں، بلکہ ان میں سے ایک خاتون کا ''فتویٰ'' تو یہ تھا کہ جو خواتین اپنے باپ کی جگہ اپنے شوہر کے نام کا لاحقہ لگاتی ہیں وہ گنہ گار ہیں، لہذا انھیں توبہ کرنی چاہئے۔

خود میرا رجحان بھی یہی ہے کہ لڑکی کی شناخت اس کے شوہر سے نہیں اس کے باپ سے ہوتی ہے۔ شوہر بدل سکتا ہے باپ نہیں بدل سکتا۔ لیکن مجھے اس بات کا علم دیر سے ہوا، میرے شناختی کارڈ، پاسپورٹ، دیگر اہم کاغذات اور تحریروں اور کتابوں پر میرے نام کے ساتھ میرے شوہر اور ان کے خاندانی نام کا لاحقہ لگا ہوا ہے۔ اگر مجھے اس مسئلہ کا علم شادی سے قبل ہوجاتا تو شائد نہیں بلکہ یقیناً میں اپنا نام تبدیل نہ کرتی اور میرا خیال ہے کہ پاکستان میں بہت ہی کم لوگ اس مسئلے سے واقف ہوں گے۔

اس بار مدائن صالح جانے کے لئے سابقہ غیر آباد راستے کی جگہ العلاء کی پرانی بستی کے درمیاں سے گزرنے والے نسبتاً آباد راستے کا انتخاب کیا، یعنی ملک فہد روڈ پر چلتے ہوئے العذیب سے داہنے جانب مڑیں، تقریباً بارہ کلومیٹر چلنے کے بعد ''منطقہ آثار'' (ANTIQUE) کے بورڈ کے ساتھ بائیں جانب مڑیں، بشرطیکہ وہ بورڈ آج بھی اپنی جگہ لگا ہو۔ آگے چند کلومیٹر پر پولیس چوکی کے ساتھ ہی مدائن صالح کے آثار کے حدود شروع ہوجاتے ہیں۔ ان آثار کو آہنی باڑ لگا کر محفوظ کیا گیا ہے۔

پولیس چوکی پر شرطہ نے ورقہ چیک کیا اور ہماری گاڑی کے لئے آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ گاڑی جونہی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ہمارے دائیں بائیں اور سامنے حجر کی وہ بستی تھی جسے مدائن صالح بھی کہتے ہیں اور جو ہزاروں سال قبل حضرت صالح اور ان کی قوم ثمود کی جائے رہائش تھی۔

قومِ ثمود کا ذکر قران مجید میں نو سورتوں میں آیا ہے۔ ان کا زمانہ قومِ عاد کے بعد کا ہے۔ عاد کا زمانہ تقریباً ۲ ہزار سال قبلِ مسیح کا مانا جاتا ہے، یعنی حضرت ابراہیم سے بھی بہت پہلے کا، ان دنوں (یعنی عاد اور ثمود) کا شمار سامی اقوام کی شاخوں اور 'عرب بائدہ' میں ہوتا ہے۔ حضرت نوح کی اولاد میں ایک کا نام ثمود تھا یہ قوم ان سے منسوب تھی، انہیں عاد ثانی بھی کہا گیا ہے۔ اس قوم نے (۱۷۰۰) سترہ سو بستیاں آباد کیں جو خوش نما اور سرسبز و شاداب تھیں۔ ان کی یہ بستیاں تبوک اور شام کے درمیاں وادی القریٰ میں ۲۰۰ مربع میل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وادی میں جابجا چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جس کی وجہ سے ''وادی القریٰ'' (قریہ کی جمع) نام پڑ گیا۔ ان کا مرکزی شہر یا بستی الحجر تھی جو بعد میں ''فج الناقة'' اور آج کل مدائن صالح کے نام سے مشہور ہے۔ جو مدینہ منورہ سے تقریباً ۴۰۰ کلومیٹر شمال میں تبوک کے راستہ پر واقع ہے۔

رسول اللہ نے تبوک جاتے ہوئے یہاں مختصر قیام کیا تھا۔ یہ معذب بستی تھی لہذا ہم جلد ہی اس کی سیاحت سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب آپ یہاں سے گزرے تھے تو مدائن صالح کے کھنڈرات میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو جمع کر کے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور کہا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہذا یہاں سے جلدی سے گزر جاؤ۔

یہی بات بار بار میں بچوں کے سامنے دہرا رہی تھی کہ ہمیں جلدی کرنا ہے، اس پورے دورانیہ میں میری کوشش رہی کہ سفر کی کیفیت طاری رہے، سیر و تفریح کا عنصر شامل نہ ہونے پائے لہذا ہم نے وہاں سوائے پانی کے کچھ بھی کھانے پینے سے اعراض برتا۔

''اگر یہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا، اور ہمیں یہاں سے جلدی گزرنے کا حکم ہے تو آخر یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟'' ثناء کا سوال تھا۔

''اس لئے کہ ''سیروا فی الارض'' بھی تو اللہ ہی کا فرمان ہے، یہ بھی تو اللہ کا حکم ہے کہ دنیا میں گھومو پھرو اور اس کی نشانیاں دیکھو۔ اگر یہ معذب مقامات نہ دیکھے جائیں تو عبرت کیونکر حاصل ہوگی؟ ان معذب مقامات پر تفریح کی غرض سے نہیں آنا چاہئے لیکن حصول علم اور حصول عبرت کے لئے ان آثار کو دیکھا جا سکتا ہے'' میں نے جواباً کہا

''کیا ان مقامات سے آپ لوگ کوئی سبق حاصل نہیں کر رہے؟'' میں نے بچوں سے سوال کیا۔

''کر رہے ہیں کہ جو قومیں اللہ کی نافرمانی کرتی ہیں وہ تباہ کر دی جاتی ہیں''

سعود پھرتی سے بولا۔

''ہاں، خواہ وہ کتنے ہی مضبوط قلعوں میں رہتی ہوں۔''

حجر کی وسیع و عریض بستی ہماری نظروں کے سامنے تھی، ترشے ترشائے، مدوّر پہاڑوں کی بستی۔ ان پہاڑوں میں ایک یا زائد دروازے بنے ہوئے تھے ہم پہاڑوں کی نصف بلندی طے کر کے ان دروازوں تک پہنچتے تو عموماً ایک جیسا منظر نظر آتا۔ گول چھت، سامنے ۱۲×۱۲ یا اس کے لگ بھگ کا ایک کمرہ، ننگی فرش اور اس کمرے میں ایک یا دو قبریں۔ یہ آل ثمود کے مقابر تھے۔

یہ قوم سنگ تراشی میں ماہر تھی۔ یہ پہاڑوں کو کھود کر عالیشان مکانات و مقابر بناتے، اور نقش و

نگار سے آراستہ کرتے۔ ہم اس کے چشم دید گواہ بن چکے تھے آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر اس کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔''

(تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۱۶)

غالباً تاریخ میں ثمود ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل کی بات ہے۔ اس کے ہزاروں سال کے بعد نبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں اس فن کو مزید ترقی دی۔ ان کی یادگاریں اب بھی خلیج عقبہ کے کنارے، مدین کے مقام پر اور اردن کی ریاست میں پیٹرا (PETRA) کے مقام پر اب بھی موجود ہیں۔ اور پھر ایلورا میں، جس کے غار پیٹرا سے تقریباً سات سو سال بعد کے ہیں، یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

مدائن صالح کا یہ پورا علاقہ اب محکمۂ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ہے لہذا انہوں نے سیاحوں کی آسانی کے لئے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے ہیں جس سے اس پہاڑی عمارت کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، ہم ایک ایک آثار کو دیکھتے جا رہے تھے اور تصویریں کھینچنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں ضروری نوٹس بھی لیتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ 'المقابر النبطیہ' (NABATAEEN TOMBS) کا بورڈ لگا ہوا تھا، یہ بھی پہاڑوں کو کھود کر تیار کئے گئے مقابر ہیں، ان مقابر کی صورت یہ ہے کہ کسی مدوّر پہاڑی پر، نصف بلندی پر ایک دروازہ ہوگا۔ آپ دروازے سے اندر داخل ہوں تو آپ خود کو ایک چوکور کمرے میں پائیں گے۔ کمرے کی بلندی ۱۰ تا ۱۲ فٹ ہوگی لہذا آپ چھت کو ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکیں گے اس کمرے میں فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ کی گہرائی میں قبریں بنی ہوں گی، ایک یا دو یا زیادہ سے زیادہ چار۔ بعض مقابر کے دروازوں پر کچھ نہیں بنا، وہ سادے اور معمولی ہیں بعض مقابر کے دروازوں پر ''عقاب'' کا نشان کھدا ہوا ہے،

ایک پر تولتا عقاب ۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ شاہی مقابر ہوں۔

بالکل اسی طرز کے ان کے قصر تھے۔ قصر الفرید، قصر الصانع، اور قصر البنت وغیرہ۔ یہ قصر بھی

بالکل ایک طرح کے تھے، اور ویسے ہی تھے جیسے ان کے معابر تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے متمول افراد اپنی زندگی میں ایسے قصر غاروں میں بنواتے ہوں، اور انہیں ان کے مرنے کے بعد وہیں دفن کردیا جاتا ہو کیونکہ ان کے مقابر اور قصر میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ہم نے تقریباً ہر قصر اندر سے دیکھا، قصر البنت جس کا زیادہ شہرہ ہے اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ان کے سردار جندع کی شاہی حویلی تھی، آیئے میں آپ کو اس کی سیر کراتی ہوں۔

یہ قصر ایک بڑی پہاڑی کے اندر بنایا گیا ہے، لہذا پہلے تو آپ کو پہاڑی پر چڑھنا پڑے گا، کم از کم نصف بلندی تک۔ اب محکمۂ آثار قدیمہ والوں نے لوہے کی سیڑھیاں لگادی ہیں جس کی وجہ سے یہ چڑھائی آسان ہوگئی ہے۔ جب آپ تقریباً نصف بلندی پر پہنچیں گے تو آپ کو چند گز کا ایک مسطح چبوترا (PLATFORM) سامنے ملے گا، سامنے قصر کا کم از کم آٹھ، نو، فٹ بلند ایک دروازہ نظر آئے گا، جس کے اوپر ایک پرتولتا عقاب تراشا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دروازے کے چاروں طرف اور اوپر کئی گز کی بلندی تک نقش ونگار تراشے گئے تھے جس کی وجہ سے محل کے داخلی دروازے کی شان بڑھ گئی تھی۔

آپ دروازے سے اندر داخل ہوں تو خود کو تقریباً ۲۵×۲۵ کے ایک کمرے میں پائیں گے۔ سامنے اور دائیں بائیں تین فٹ بلندی کا ایک چبوترہ سا ہے سامنے والے چبوترے پر دو مزید دیواریں اٹھی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے مستطیل شکل کے تین خانے سے بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک خانہ ایک کمرہ استراحت کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا یہی حال دائیں اور بائیں جانب کے چبوترے کا ہے ۔۔۔۔ بس یہ شاہی حویلی یا قصر البنت ہے۔

اس سیاحت سے جہاں تک میں سمجھ سکی اور جیسا کہ قرآن نے بھی اشارا کیا ہے کہ وہ میدانوں میں بڑے بڑے عالیشان قصر بنا کر رہتے تھے اور پہاڑوں کو کاٹ کر بھی مکانات بناتے تھے۔ تو ان کے امراء و روساء کا طریقہ یہ رہا ہوگا کہ وہ ان پہاڑی مکانات کو موسم گرما یا سرما کی شدائد کے دوران اپنی استراحت گاہ بناتے ہوں گے۔ جیسا کہ آجکل بھی ہوتا ہے، ہمارا طبقۂ امراء شدید گرمی کے دن سوات، مری اور کاغان میں گذارنا پسند کرتا ہے چونکہ یہ پہاڑ میں بنے ہوئے مکانات تھے لہٰذا ٹھنڈے تھے۔

''یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشیں بنایا

اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔

پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہوجاؤ۔

اور زمین میں فساد برپا نہ کرو''۔

[الاعراف۔۷۴]

مدائن صالح کے شہر کو آثار قدیمہ والوں نے مختلف محلوں یا localities میں تقسیم کیا ہوا ہے، ہر علاقہ کا اپنا نام ہے مثلاً منطقہ الخریمات یا جبل العلیمہ وغیرہ۔

گھومتے گھامتے ہم ''الدیوان'' تک آپہنچے۔ یہ دیوان ایک کشادہ نشست گاہ ہے جہاں تین اطراف میں سنگی بنچیں بنی ہوئی ہیں یہ دیوان بہت دیوہیکل پہاڑ کی کھوہ میں بنایا گیا ہے۔ یعنی پہاڑ کا دامن اندر کی طرف کاٹ کر یہ دیوان نکالا گیا ہے۔ اس کے سامنے چند گز کے فاصلے پر اتنا ہی دیوہیکل ایک پہاڑ اور بھی ہے۔ ان دونوں بڑے پہاڑوں کی وجہ سے دیوان کے سامنے والی راہگذار، ایک سایہ دار راہداری کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ یہ سایہ دار راہداری جس کا فرش پیلی ریت کا تھا انتہائی ٹھنڈی تھی حالانکہ اس وقت باہر کا درجہ حرارت کسی طرح بھی 45C سے کم نہیں تھا اور اس وقت بارہ سے ایک کا درمیانی عمل تھا، یعنی دن کا گرم ترین وقت۔

راہداری کے دونوں طرف پہاڑوں کو طاقوں کی صورت میں کاٹ کر وہاں انہوں نے اپنے بتوں کی تصویریں تراشی ہوئی تھیں۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی بت پرست تھے۔ ان کے بتوں کے نام ضر ضمر یہ، اور ایا تھے۔ اس دیوان کو آل ثمود عموماً اپنی مذہبی رسومات کے لئے استعمال کرتے تھے۔

دیوان جس پہاڑ پر بنایا گیا تھا، اور اس کے مدمقابل جو پہاڑ تھا، دونوں آگے جاکر ایک دوسرے سے نزدیک آگئے تھے لہٰذا راہداری خاصی تنگ ہوگئی تھی۔ ہم اس تنگ گزرگاہ سے نکل کر دوسری جانب پہنچے تو وہ ایک اور کھلا علاقہ تھا۔ ہمارے چاروں جانب پہاڑ تھے، جن میں مکانات بنائے گئے تھے۔ کبھی یہاں آبادی ہوتی ہوگی، اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی، یہاں ہمیں ایک کنواں بھی نظر آیا جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہوگا۔

ہم دیوان کی جزئیات سمیٹ رہے تھے کہ جیپ پر ایک بدو آیا۔ اسے ہم باہر پولیس چوکی پر

بھی دیکھ چکے تھے، ہوسکتا ہے ان کا گائیڈ رہا ہو یا ان کی انتظامیہ کا کوئی فرد کیونکہ اس کو ہم نے جیپ میں ادھر اُدھر آتے جاتے دیکھا تھا۔

اس نے قریب آکر ہمیں بتایا کہ اس وقت ہم ''دیوان'' میں کھڑے ہیں، پھر اس نے عربی زبان میں ''دیوان'' کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے زیادہ معلومات ہم ''دیوان'' کے قریب لگے ہوئے نیلے بورڈ سے حاصل کر چکے تھے۔ پھر وہ ہمیں گردونواح کے بارے میں کچھ بتانے لگا، پھر قصر البنت کے بارے میں، ان میں سے آدھی باتیں ہماری سمجھ میں آرہی تھیں آدھی نہیں، میں نے اس کی بات کاٹ کر اس سے ناقۃ الصالح اور اس کنویں کے بارے میں سوال کیا جہاں سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اس نے دور، مخالف سمت میں ہاتھ سے اشارا کر کے بتایا کہ یہ آثار پہاڑوں کے اس طرف ہیں جنہیں بند کر دیا گیا ہے اور عموماً ٹورسٹ حضرات کو وہاں نہیں جانے دیتے، ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کنویں کے بارے میں مجھے یہ اطلاع تھی کہ اب وہ کنواں ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے۔

نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیاں سے گزرا کرتے تھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر بھی رسول اللہ ادھر سے گزرے تھے انہوں ایک جگہ ایک کنویں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اس کنویں سے پانی لینا باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درّے کو دکھا کر آپؐ نے بتایا کہ اسی درّے سے اونٹنی کا معجزہ نکالا گیا تھا۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی ''فج الناقۃ'' کے نام سے مشہور ہے وہ بدّو صحیح کہہ رہا تھا، کیونکہ ہم نے گاڑی پر تقریباً سارا علاقہ چھان مارا، اس نام کا کوئی بورڈ ہمیں نظر نہیں آیا، نہ ہی ترکی عہد کی کوئی چھوٹی سی فوجی چوکی ہی مل سکی۔

ہم ثمود کی اس بستی میں پھر رہے تھے جو تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل وہاں آباد تھی

، ہمارے علاوہ کئی گاڑیوں میں اور بھی ٹورسٹ تھے جو ان آثار عبرت کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔

عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی ثمود تھے، مگر ان کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کر لی جو عاد کی ترقی نے کی تھی یعنی معیار زندگی بلند سے بلند تر اور معیار آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا، معاشرے میں شرک اور بت پرستی کا زور بڑھتا چلا گیا اور ہر وہ برائی معاشرے میں در آئی جو

شرک کا نتیجہ ہوتی ہے قوم کے بدترین اور مفسد لوگ قوم کے سردار بنے ہوئے تھے، بلاشبہ انہوں نے انجینئرنگ اور فن تعمیر میں حیرت انگیز ترقی کر لی تھی مگر ان کی تعمیرات کی غرض وغایت یہ تھی کہ اپنی بڑائی، دولت وقوت، شان وشوکت اور اپنے کمالات فن کی زیادہ سے زیادہ نمود ونمائش کریں۔ یہ تعمیرات ضرورت کی غرض سے نہیں بے جا نمود ونمائش کی غرض سے تھیں، ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی شان یہی ہوتی ہے کہ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے کے لئے چھپر تک کو ترسیں تو دوسری طرف امراء اور اہل ثروت جب رہنے کے لئے ضرورت سے زیادہ محل بنا چکیں تو بلاضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگیں۔

نزول قرآن سے پہلے قوم ثمود کے قصے اہل عرب میں زبان زد عام تھے، زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور، یونان، اسکندریہ، اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصے پہلے تک اس قوم کے کچھ باقیات موجود تھے چنانچہ رومی مورخیں کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن فوج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

ثمود کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے حضرت صالح کو رسول بنایا۔[1] ان کے والد کا نام عبیل تھا جو حجر کی بستی میں رہتے تھے۔ حضرت صالح کی تبلیغ وتلقین کے نتیجے میں اس زبردست قوم کے چند کمزور لوگ ایمان لے آئے جو جتنا زبردست تھا وہ مخالفت میں بھی اتنا ہی جری تھا۔ اور اقوام عالم کی تاریخ میں عموماً ایسا ہی ہوا ہے۔ نبوت کے اعلان سے قبل حضرت صالح ان کے ہردلعزیز فرد تھے۔ جب انہوں نے شرک اور بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تو وہ ان کے مبغوض ترین فرد بن گئے۔

''اے صالح! اس سے قبل تو تو ہمارے درمیان ایسا تھا جس سے ہمیں بڑی توقعات وابستہ تھیں، کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے، جس کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے، تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہم کو خلجان میں ڈال رکھا ہے''[2] وہ کہتے۔

کبھی وہ صالح کا مذاق اڑاتے کہ اللہ میاں کو بس آپ ہی نظر آئے تھے بھئی اگر پیغمبر ہی بنانا تھا

۱: القرآن، سورہ ھود۔۶۱ ۔ ۲: القرآن، سورہ ھود۔۶۲

توکسی فرشتے کو بناتے۔ ۱ کبھی وہ صالح کے پیروکاروں سے الجھتے اور کہتے

''کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟''

''بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے۔ اسے ہم مانتے ہیں۔'' ۲ وہ جواب دیتے

جس پر عرب سردار ہٹ دھرمی سے کہتے

''جس چیز کو تم نے مانا ہے، ہم ہرگز اسے نہیں مانیں گے۔'' ۳

ان کے سخت دل سردار، جن کی تعداد قرآن نے نو بتائی ہے، جن کے ساتھ ان کے لاؤلشکر بھی تھے اور تمام مادی آسائشوں سے بھرے ہوئے محلات اور کھیتیاں بھی وہ حضرت صالح اور ان کے پیروکاروں کو دلیل دیا کرتے کہ دیکھو اگر ہم باطل پرست ہیں تو پھر یہ دھن دولت، محلات، سرسبز کھیتیاں، باغات اور نعمتیں ہمیں کیوں عطا ہوئیں؟ اگر آپ اور آپ کے ساتھی ہی اللہ کے چہیتے ہیں تو یہ آسائشیں اور نعمتیں آپ کو کیوں نہ عطا ہوئیں؟؟

حضرت صالح انہیں سمجھاتے کہ یہ سب آزمائش ہے، چندروزہ عیش ہے، اگر تم اللہ کے شکر گزار نہ بنے تو یہ سب کچھ ختم بھی کیا جا سکتا ہے مگر وہ ایک بگڑی ہوئی قوم تھی۔ اس سرکش قوم نے اپنے صالح نبی کی صالح باتیں ماننے سے انکار کر دیا اور معجزہ کے طالب ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ جو کچھ صالح کہہ رہا ہے وہ بس اسکا خللِ دماغ ہی ہے اگر واقعی نبی ہے تو معجزہ لائے۔

''ایسا نہ ہو کہ معجزہ آجانے کے بعد بھی تم اپنے انکار پر قائم رہو، تب تو تم تباہ کر دیئے جاؤ گے''

حضرت صالح نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں اگر ہماری مرضی کے مطابق معجزہ آگیا تو ہم ایمان لے آئیں گے''

عرب سرداروں نے کہا

''کس قسم کا معجزہ چاہئے؟'' صالح نے پوچھا

''سامنے والے پہاڑ سے ایک ایسی گابھن اونٹنی نکالو، جو نکلتے ہی بچہ دے، اس بچے کے بال سرخ ہوں، ہم اس اونٹنی کا دودھ پیا کریں گے'' (یعنی دودھ اتنا ہو جو بستی والوں کو کافی ہو)

یہ ایک بالکل ناممکن العمل بات تھی۔ اگر صالح ایک عام انسان ہوتے تو وہ کبھی بھی ایک ایسی

۱: القرآن، سورہ حم السجدہ ۱۴ ۔ ۲: القرآن، سورہ الاعراف۔ ۷۵ ۔ ۳: ایضاً۔ ۷۶

اونٹنی کیا ایک پہاڑ کے پیچھے سے نکالنے پر قادر نہ ہوتے جو گابھن بھی ہو، فوراً بچہ بھی دے دے، اور بچے کے بال سرخ بھی ہوں اور تو اور وہ اونٹنی اتنا دودھ بھی دے جو بستی والوں کے لئے کافی ہو۔ حضرت صالح نے اس ناممکن العمل کو ممکن بنانے کے لئے رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی پہاڑ میں سے ایک گونجدار آواز آئی، ایک پتھر پھٹا اور اسکے عقب سے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی، جس نے بچہ دیا۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بچے کے بال سرخ تھے۔

وہ ٹکٹکی باندھے دم سادھے اونٹنی اور اس کے بچے کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ ہے اللہ کی ناقہ، جو تمہارے لئے ایک نشانی ہے، اسے اللہ کی سرزمین میں پھرنے دینا اور کوئی گزند نہ پہچانا کہ پھر تمہیں دردناک عذاب آلے۔'' صالح پکارے

قوم سہم گئی تھی لہٰذا وہ چپ چاپ سنا کیے۔

پہاڑ سے نمودار ہونے والی اونٹنی اور اس کے سرخ بالوں والا بچہ چرتے چرتے وادی القریٰ کے مرکزی چشمے پر پہنچ گئے۔ اس کے علاوہ بھی بستی میں کنویں رہے ہوں گے جو موسم کی بارشوں سے سیراب ہوتے ہوں گے۔ مگر چشمہ یہ واحد ہی تھا۔ اونٹنی اور بچے نے چشمے کا سارا پانی پی لیا اور چشمہ خشک ہوگیا۔ ظاہر ہے اگر اونٹنی کو اتنا ہی دودھ دینا تھا کہ ساری بستی کو کافی ہوتا تو اسے اتنا ہی پانی پینا تھا کہ چشمہ خشک ہو جائے۔

قوم کے کاہنوں نے برجستہ کہا ''یہ تو جادو ہے۔''

اب ان کا ڈر کچھ کم ہوا انہوں نے صالح سے کہا

''یہ اونٹنی تو ہمارا سارا پانی پی گئی ہم اس کو اور اس کے بچے کو باندھ دیں گے''

''ایسا کبھی نہ کرنا یہ اللہ کے نام پر تمہارے لئے چھوڑی گئی ہے۔'' صالح نے تنبیہاً کہا

''تو کیا ہم سب پیاسے مر جائیں؟''

''اللہ نے اس کے اور تمہارے درمیاں پانی پینے کی باری مقرر کر دی ہے۔ ایک دن اس کا ہوگا، اور دوسرا دن قوم اور اس کے چوپایوں کا، خبردار اس میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔''

قوم کے بعض لوگ اس معجزے کو دیکھ کر ایمان لے آئے جن میں ایک سردار جندع بن عمر بھی

تھا مگر کاہنوں اور سرداروں نے دیگر لوگوں کو یہ کہہ کر روکے رکھا کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے، یہ شخص نبی نہیں ساحر اور جادوگر ہے، اسکے پیچھے لگ کر اپنے آبائی دین سے کیوں پھرتے ہو؟

بہر حال کچھ عرصہ بستی میں پانی کے لئے باری کا نظام چلتا رہا۔ اپنی باری والے دن وہ اونٹنی پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی، چرتی چگتی اور کنویں کا سارا پانی پی کر اتنا دودھ دیتی کہ اس دودھ کو محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے ایک روایت کے مطابق فرش کھود کر اس میں پیالہ بنالیا تھا۔ اس پیالے کی تصویریں بعض کتابوں میں ملتی ہیں ۱

یہ پیالہ بڑی فنکاری سے پتھر میں تراشا گیا تھا۔ پیالے کی اندرونی دیوار تقریباً سات فٹ بلند تھی، اسی حساب سے گولائی یا چوڑائی تھی، گویا دودھ کا ایک چھوٹا کنواں بھرلیا جاتا تھا جو پوری بستی والوں کو کافی ہوتا تھا۔ دودھ دے کر اونٹنی اور اس کا بچہ واپس کھوہ میں چلے جاتے، اگلے دن بستی والے اپنی ضرورت کے لئے کنویں سے پانی لے جاتے۔

کچھ عرصہ تک معاملات یونہی چلتے رہے پھر ان کے بدنہادوں کو یہ بھی کھٹکنے لگا۔ ایک روایت ہے کہ ایک حسین مالدار خاتون صدوق نے سب سے طاقتور جتھے دار عرب سردار مصدع سے درخواست کی کہ اگر وہ اونٹنی کو ٹھکانے لگادے تو وہ خود کو اسے پیش کردے گی، صدوق کے جانور زیادہ تھے، جسے پانی پلانے کا باری کا نظام پریشان کرتا تھا۔ مصدع آمادہ ہوگیا۔

ادھر ایک اور مالدار خاتون عنیزہ نے ایک دوسرے طاقتور، جتھے دار عرب سردار قیدار بن سالف کو پیش کش کی کہ اگر وہ اونٹنی کو ٹھکانے لگادے تو وہ اپنی نوجوان خوبصورت لڑکی اُسے بخش دے گی۔

یہ بڑی پرکشش پیشکش تھی، قیدار آمادہ ہوگیا لہذا جب مصدع نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تیار تھا، ان دونوں نے سازش کر کے باقی ساتوں سرداروں کو اپنے ساتھ ملالیا اور ایک دن موقعہ پا کر مصدع نے ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اُسے مار ڈالا، بچہ یہ دیکھ کر بھاگا اور چیختا چلاتا پہاڑ میں غائب ہوگیا۔

خبر دینے والوں نے حضرت صالح کو خبر دی تو وہ لرز گئے

''آخر تم لوگوں نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔'' انہوں نے قوم کے بدنہاد سرداروں سے کہا

''ہاں ہمیں جو کرنا تھا ہم نے کرلیا، اب تم لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے اگر

۱: سیرت النبی البم صفحہ نمبر ۱۳۲، مرتب شاہ مصباح الدین شکیل، پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ، کراچی

تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو۔'' ۱

''تین دن اور اپنے گھروں میں مزے کرلو'' صالح نے جواباً کہا ''اس کے بعد تمہیں عذاب آلے گا اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی'' ۲

اس بات سے سردار اور بپھر گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس سے قبل کے صالح کا خدا ہمیں پکڑے، ہم اُسے اور اُس کے گھر والوں کو قتل کردیں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سارے اہم سرداروں نے جو تعداد میں نو تھے، اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے جتھے تھے۔ صالح اور ان کے اہل خانہ پر شب خون مارنے کی تیاری مکمل کرلی، لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی چال چلتے، ان کی چالوں پر اللہ کی چال غالب آگئی۔

''اس شہر میں نو جتھے دار تھے
جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے
انہوں نے آپس میں کہا
''خدا کی قسم کھا کر عہد کرو کہ ہم صالح اور اس کے اہل خانہ پر شب خون ماریں گے
پھر اس کے ولی سے کہدیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت پر موجود نہ تھے
ہم بالکل سچ کہتے ہیں''
یہ چال تو وہ چلے
اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی
اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا کیا انجام ہوا؟
ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو
اب اُن کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے
اس میں ایک نشانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں
اور بچالیا ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے
اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے (النمل ۴۸۔۵۳)

۱: الاعراف۔۷۷ ۲: ھود۔۶۵

سو وہ عذاب آ گیا جس کو انہوں نے اپنی سرکشی، نافرمانی، اور ہٹ دھرمی سے خود دعوت دی تھی ۔ایک دل ہلا دینے والی کڑک کے ساتھ ایک زبردست زلزلے نے اُن کو آلیا، وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، ایسے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ان کے وہ محلات، عالی شان مکانات، ان کے وہ لاؤ لشکر جن کی خبر ہم تک پہنچی ہے، ایسے ملیامیٹ ہو گئے جیسے راندہ ہوا بھوسا۔

"ہونی شدنی!

کیا ہے وہ ہونی شدنی!

اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ہونی شدنی!!

ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا

تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیئے گئے۔"

(الحاقۃ ۱۔۵)

قران نے اس عذاب کو سورۃ اعراف (آیہ نمبر ۷۸) میں "الرَّجفة" یعنی زبردست زلزلہ کہا ہے، سورۃ ھود (آیہ ۶۷) میں اس کے لئے "الصَّیحَة" یعنی زور کے دھماکے کا لفظ استعمال کیا ہے۔سورۃ حٰم السجدہ (آیہ ۔۱۷) میں کہا گیا ہے کہ ثمود کو "صاعقة العذاب" (عذاب کے کڑکے) نے آلیا۔ دراصل یہ سب ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیات کا نام ہے۔

ثمود پر ایک ہولناک کڑک کے ساتھ ایک زبردست زلزلہ مسلط کیا گیا یہ زلزلہ صرف حجر کی وادی یا مدائن الصالح ہی میں نہیں آیا بلکہ وادی القریٰ کی ساری بستیوں، جن کی تعداد ۷۰۰ ابتائی جاتی ہے، میں آیا جہاں ثمود کے مختلف قبائل رہائش پزیر تھے اور اُن سب کے پاس حضرت صالح دعوتِ الٰہی لے کر گئے تھے، اور اُن سب نے انہیں جھٹلایا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بارے میں اندازہ لگایا ہے کہ مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاستِ اردن کی حدود میں ۳۰۔۴۰ میل تک وہی مخصوص پہاڑ ملتے ہیں جو مدائن الصالح کے ہیں اور جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطحِ زمین سے چوٹی تک جھنجھوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور سو میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے اس زلزلۂ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔[1]

۱: مودودی، سید ابوالاعلیٰ "تفہیم القرآن" جلد ۳ صفحہ نمبر ۵۲۳،

ثمود پر یہ عذاب رات کے پچھلے پہر نازل کیا گیا تھا، سپیدۂ سحر نمودار ہونے پر ثمود کی بستی ایک ہلاکت آفریں منظر پیش کر رہی تھی، فنِ تعمیر کے شاہکاران کے وہ محلات جو میدانی علاقوں میں بنائے گئے تھے، ریزہ ریزہ ہوئے پڑے تھے۔ان کے پہاڑوں میں بنائے گئے وہ سنگین مکانات جو اب تک انہیں ہر قسم کی آفاتِ ارض و سماوی، گرمی، سردی، لُو، بارش اور آندھی طوفان سے بچاتے رہے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔

وہ عذاب خداوندی کا کوڑا تھا اور انتہائی سخت حادثہ تھا کہ ہر گھر ہر راہگذر اور ہر پہاڑ کے دامن میں انسانوں اور جانوروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، اور لاشیں بھی ایسی کچلی ہوئی جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی ہوئی جھاڑیاں جو جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ جاتی ہیں۔نہ ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودی ہوئی پناہ گاہیں۔وہ جانور اور وہ کھیتیاں جن پر ان کی معیشت کا دارو مدار تھا بھوسے کی مانند پیس کر رکھ دی گئی تھیں۔کنویں بیکار ہو گئے تھے۔قصر کھنڈر بن گئے تھے۔بستیاں اجڑ گئیں تھیں۔

حضرت صالح اور اُن کے پیروکاروں کو اللہ نے اپنی رحمت سے محفوظ رکھا، اُن کی تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) بتائی جاتی ہے۔صالح نے مومنوں کو جمع کیا اور ہجرت کا حکم دیا، وہ سب یہ معذب بستی چھوڑ کر چل دیئے، صالح نے ایک آخری نظر برباد بستی پر ڈالی اور حسرت سے کہا

"اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا تھا

اور میں نے تمہاری بہت خیر خواہی کی۔

مگر میں کیا کروں کہ تمہیں اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں"[1]

ایک سو بیس کے اُس قافلے نے شمال کی سمت رخت سفر باندھا کئی دنوں تک وہ انہی معذب وادیوں کے درمیاں سفر کرتے رہے جہاں کبھی زندگی کی گہما گہمی عروج پر تھی اب وحشت سی وحشت اور ویرانی سی ویرانی تھی۔ جھنجھوڑے گئے پہاڑوں اور ہلائی جانے والی زمین کے درمیاں وہ اپنا راستہ بناتے فلسطین کے قریب رملہ پہنچ گئے۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ صالح ہجرت کر کے جزیرہ نمائے سینا چلے گئے تھے چنانچہ کوہ طور کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام "نبی صالح" ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی صالح کی جائے

۱: الاعراف۔۷۹

قیام تھی۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ مکۂ آ گئے اور یہیں ۲۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حجر کی بستی کے گرد ہم نے ایک الوداعی چکر لگایا، ویران، بے آباد، اور سنسان وادی، ادھر اُدھر چند سیاحوں کی دوڑتی ہوئی گاڑیاں اور بس! ساڑھے تین ہزار سال قبل جھنجھوڑ کر تباہ کر دینے والی اس معذب بستی کو چھوڑ کر ہم منطقۂ آثار سے باہر آ گئے۔ میرے کانوں میں قرآن کی آیات گونج رہی تھیں۔

دیکھو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا!

سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود!

اضافۂ مزید:

۱۔ چھٹا سفر (۲۰۰۲ء)

۲۔ حدیبیہ

۳۔ تیما

۴۔ تبوک

چھٹا سفر ۲۰۰۲ء

جمعہ ۲۰/جون ۲۰۰۰ء کو میں اور سعدیہ، سعودیہ ایئر لائن سے اپنی سالانہ تعطیلات پر ریاض جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس بار ثناء اور سعود ایک ہفتہ سے اپنے ابو کے پاس جا چکے تھے۔ فلائٹ اپنے وقت پر چلی اور مقررہ وقت سے دس منٹ قبل منزل مقصود یعنی ریاض پہنچ گئی اس وقت ریاض میں ساڑھے بارہ بجے تھے' جمعہ کا دن تھا' سجاد کی چھٹی تھی اس لئے ان کا ایئر پورٹ آنا مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارا سفر بہت آرام دہ گزرا تھا دوران سفر سعدیہ زیادہ تر فلم دیکھتی رہی یا ویڈیو گیم کھیلتی رہی اور میں حسب عادت کتاب اور اخبار کا مطالعہ کرتی رہی۔ ایئر پورٹ پر سجاد اور سعود ہمیں لینے آئے تھے جبکہ ثناء گھر پر ہی تھی۔

ایئر پورٹ سے گھر پہنچتے پہنچتے راستہ میں ہی سجاد نے پورے ہفتے کی مصروفیت بتا دی۔ ہر روز کہیں نہ کہیں کھانا تھا۔ اصل میں اس بار جب میں ریاض پہنچی تو ''ڈاکٹر'' بن چکی تھی گزشتہ دنوں میں مجھے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی اور اہل ریاض کی محبت کہ وہ اس خوشی میں میری دعوتیں کر رہے تھے۔ پہلی رات کا کھانا صفدر صاحب اور دکتورہ عطیہ کے یہاں تھا۔ یہ جوڑا ریاض میں مدت دراز سے مقیم ہے' مقیم نہیں ہیں بلکہ انہیں سعودی عرب کی شہریت ملی ہوئی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر عطیہ اب اپنا کلینک چلا رہی ہیں ان دنوں یہ میاں بیوی کویتی مارکیٹ کی بلڈنگ نمبر 37 کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں جس کا نام انہوں نے ''حیدر آبادی ہاؤس'' رکھا ہوا ہے اور یہ قطعی ''نو سموکنگ زون'' ہے۔ یہاں ''قانون'' کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سنگین نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ یہاں سگریٹ پینا شامت اعمال کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ دکتورہ کے گھر میں ''بچے'' قسم کی کوئی مخلوق نہیں پائی جاتی لہٰذا ان کا سجا سجایا گھر ''ہر وقت ہی سجا سجا رہتا ہے۔ کہیں ''شو پارکنگ'' ایریا ہے تو کہیں ''قلقل مینا'' کی موسیقی اور کہیں ''گوشۂ عبرت'' یہ گھر جو دکتورہ کی چھوٹی سی ریاست معلوم ہوتا ہے کہ ایک گوشے میں ان کے میاں یعنی صفدر حسین صاحب بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کو حالات نے مزاح نگار بنا دیا ہے۔ صفدر صاحب اور ان کی بیگم ڈاکٹر عطیہ
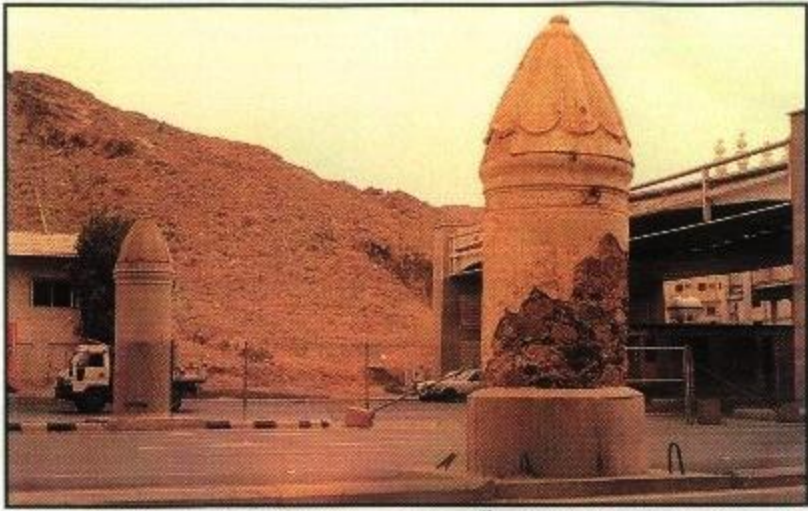
مسجد عائشہ (تنعیم) کے پاس حدود حرم کی نشانی

بئر عثمان۔ مدینہ منورہ ۲۰۰۰ء

(جو دکتورہ مشہور ہیں) دونوں کا تعلق حیدرآباد (دکن) سے ہے۔ ان کے حیدرآبادی لہجے کی اردو سن کر جی چاہتا ہے کہ خود بھی ویسے ہی بولنے لگیں۔ حیدرآبادی لہجے میں اردو بولنے والوں کا انداز دھیما' میٹھا اور قدرے سوالیہ ہوتا ہے۔ ان کے بیانیہ جملوں پر بھی گمان ہوتا ہے کہ سوال پوچھا جا رہا ہے۔ ویسے حیدرآباد' برصغیر کی تاریخ کے تناظر میں اب بھی ایک ''سوال'' معلوم ہوتا ہے۔

دکتورہ کے یہاں کھانے پر میر احمد علی' ان کی بیگم نرگس کے علاوہ عذرا بھی تھیں۔ اول الذکر جوڑا نصف حیدرآبادی ہے۔ نصف پاکستانی' یعنی میر احمد علی جو بہت صاحب ذوق آدمی ہیں کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے جبکہ ان کی بیگم کا تعلق میرے شہر یعنی کراچی سے ہے۔ عذرا ریاض کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ خوش شکل وخوش وضع ہیں ان کے شوہر ڈاکٹر پرویز جو کمپیوٹر سائنس کے استاد تھے بعد میں عذرا کی صحبت میں رہتے رہتے ''شاعر'' بن چکے ہیں۔ دکتورہ کے پرتکلف کھانوں' چائے اور باتوں کی نشست کے بعد یہ سلسلہ رکا نہیں جیسے جمعرات کی جھڑی ہو' کبھی کسی کے پاس کھانا ہے' کبھی کسی کے یہاں ''ادبی نشست'' ایک طرف تو یہ سلسلے تھے' دوسری طرف چونکہ حرم کی حاضری کو تین سال ہو گئے تھے لہٰذا ہم نے روایتی بیویوں کی طرح اٹھتے بیٹھتے میاں کے کان کھانے شروع کر دیے کہ اس سال اگر ہمیں عمرہ نہیں کرایا گیا تو اگلے سال ہم نہیں آئیں گے۔ دھمکی کارگر ہوئی اور ہم عمرہ کے پروگرام کو فائنل کرنے لگے۔ کئی دن ہم اس بحث ومباحثہ میں لگے رہے کہ عمرہ کے بعد کیا سیاحت کے لئے شمالی عرب کی طرف جایا جائے یا جنوبی عرب کی طرف۔ شمالی عرب کی طرف ''تبوک'' ایسا علاقہ تھا جو ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ سعودی عرب کا یہ شہر اردن کی سرحد پر واقع ہے دوسری طرف جنوبی عرب میں ''مسکن اصحاب الاخدود'' کو دیکھا جا سکتا تھا۔ جہاں چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں یہودی بادشاہ ''ذونواس'' نے علاقہ نجران کے بہت سے راسخ العقیدہ عیسائیوں کو آگ کے گڑھے میں زندہ جلوا دیا تھا۔ نجران میں ذونواس اور اس کے ساتھیوں کو اصحاب الاخدود کہا گیا ہے۔ آصف بھائی (ڈاکٹر آصف قریشی) اور ان کی فیملی نجران کا یہ علاقہ دیکھ کر آئی تھی اس کی وجہ سے ہمارا شوق اور بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ ربع الخالی کے جنوب میں قوم عاد کا مسکن ''احقاف'' بھی دیکھا جا سکتا تھا مگر بالآخر طے یہی ہوا کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد شمالی علاقوں کی سیاحت کی جائے اور جہاں اب تک نہیں پہنچے وہاں پہنچنے کی کوشش کی جائے۔
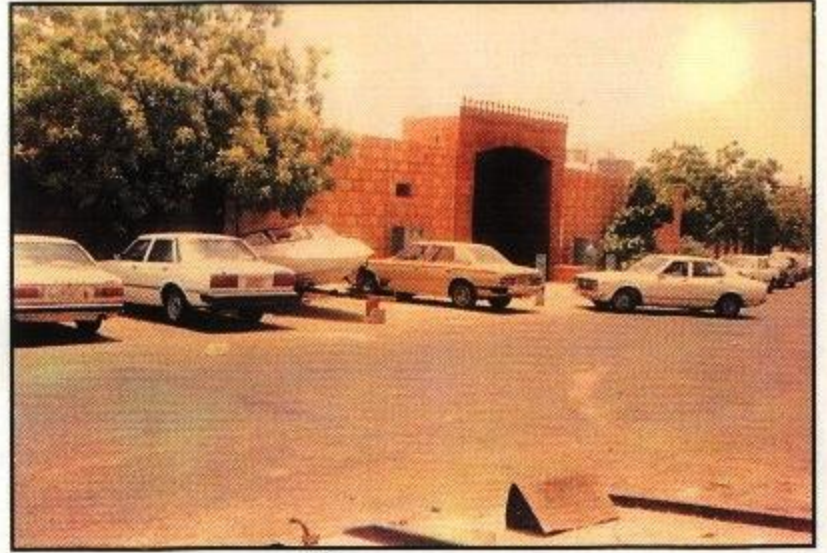
جدہ میں وہ مقام جہاں حضرت حوا کی قبر ہے
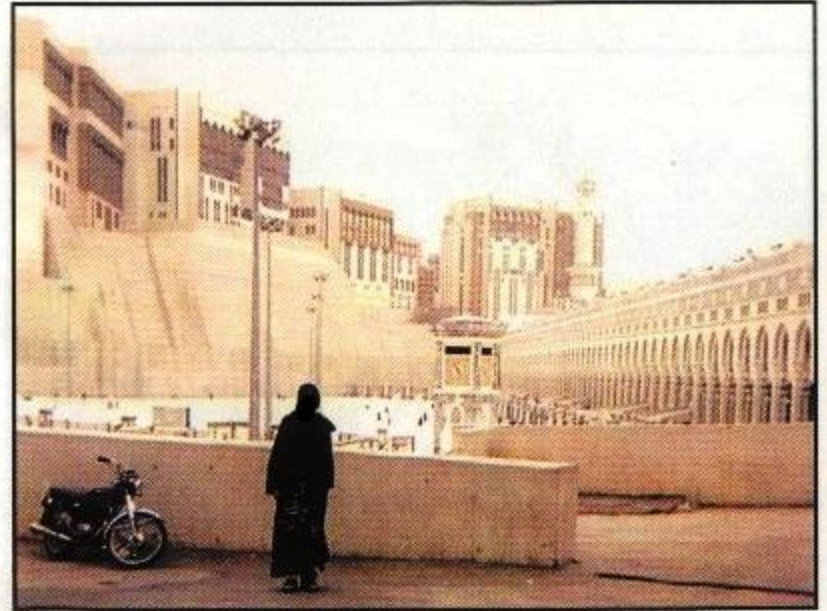
مسجد حرام کے مدمقابل بادشاہوں کے محل

اواخر جون ہم عازم عمرہ ہوئے وہی راستے' وہی مرحلے' وہی عالم شوق وذوق تھا مکہ پہنچے تو حسب سابق راحیلہ اور سجاد بھائی کے گھر قیام رہا' اس باران کا گھر بدلا ہوا تھا' ہم جمعہ کی نماز حرم میں پڑھ کر راحیلہ کے گھر پہنچے تھے۔ گزشتہ پوری رات سفر میں گزری تھی' اور آج کا آدھا دن بھی لہذا حسب سابق تھکن سے بے حال تھے' کھانا کھا کر بے سدھ ہو کر سو گئے۔ رات میں عمرہ کی ادائیگی کر لی اور اگلے دن وہ جگہ دیکھنا طے پایا جہاں صلح حدیبیہ ہوئی تھی۔

حدیبیہ

حدیبیہ، جس کا پرانا نام مراء الظہران ہے اور موجودہ نام شمیسی، یہ مکہ سے ایک منزل یعنی تقریباً ۱۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے یہیں ۶ھ کو وہ تاریخی معاہدہ ہوا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق اس کا بڑا حصہ حرم میں داخل ہے اور کچھ حل (حرم سے خارج) ہے۔ اس جگہ کا نام حدیبیہ کیوں پڑا؟ کسی کے بیان کے مطابق کنویں کا نام حدیبیہ تھا' کسی کے بیان کے مطابق درخت کا اور کسی کے بیان کے مطابق گاؤں کا نام حدیبیہ تھا۔ اسی نام کی مناسبت سے ہونے والا معاہدہ بھی "صلح حدیبیہ" کہلایا جہاں صلح حدیبیہ ہوئی تھی وہاں اب ایک مسجد بنام "مسجد شمیسی" موجود ہے۔ وہ تاریخی کنواں بھی موجود ہے جسکے قریب رسول اللہ کے خیمے میں معاہدہ لکھا گیا تھا۔ یہ ساری اطلاعات فون پر عبدالوہاب خان سلیم صاحب نے سجاد کو دی تھیں۔

عبدالوہاب صاحب کو تحریری طور پر میں گزشتہ ایک سال سے جانتی تھی۔ یہ ۱۵ جولائی ۱۹۹۹ء کی بات ہے' جب میں دو ماہ کی چھٹیاں ریاض میں گزار کر واپس کراچی پہنچی' اسی دن یونیورسٹی گئی تو دو ماہ کی کئی کلو کی ڈاک جمع تھی اس ڈاک کو دیکھنے میں میرے چار دن لگ گئے' اس میں ۲۵ مئی ۱۹۹۹ء کا لکھا ہوا وہاب صاحب کا خط معہ پچاس ڈالر کے چیک کے بھی موجود تھا۔ میں ان صاحب کو بالکل نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے اس خط میں جو اپنا تعارف کرایا اس سے پتہ چلا کہ وہاب صاحب پاکستانی' امریکن ہیں۔ ان کا تعلق مراد آباد اور بجنور وغیرہ سے تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور گزشتہ تیس سال سے امریکہ میں آباد ہیں۔ بیوی بچے اور بچوں کے بچے سب امریکی شہریت کے حامل ہیں۔ بچے کاروبار حیات میں مصروف ہیں اور وہ خود ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ مطالعہ ان کا شوق ہے اور کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اس کی وجہ سے نیو یارک' امریکہ میں ان کا اپنا ذاتی کتب خانہ ہے جہاں پانچ ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی ایسا اہم علمی اور ادبی رسالہ یا جریدہ نہیں ہے جو ان کے پاس نہ آتا ہو ان کا

دعویٰ ہے کہ حج وعمرہ کے سفرناموں کا جتنا بڑا ذخیرہ انہوں نے دیارِ غیر (یعنی نیویارک) میں زرِ کثیر خرچ کر کے جمع کرلیا ہے اتنا بڑا ذخیرہ کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ خط بھی انہوں نے میرے سفرنامے ''دشت امکاں'' کے حصول کی غرض سے لکھا تھا اور اس کی قیمت (50 ڈالر کا چیک) بھیجی تھی۔ یہ کراچی یونیورسٹی کے طلبائے قدیم میں سے بھی ہیں۔

مجھے اپنی کتاب ''دشت امکاں'' روانہ کرنے میں کچھ تاخیر ہوگئی کیونکہ دو ماہ بعد اپنے شہر' گھر اور یونیورسٹی میں واپسی ہوئی تھی۔ دو ماہ کے کاموں کا انبار تھا اس دوران ان کے لگاتار دو تین خطوط آگئے کہ کتاب کہاں ہے؟ میں ان کے جذبہ طلب سے بڑی متاثر ہوئی اور کتاب بذریعہ رجسٹری انہیں امریکہ روانہ کردی۔ اس کے بعد سے ان سے خط وکتابت کا سلسلہ چل نکلا' بعد میں یہ میرے بڑے بھائی شاہد مستقیم (مقیم نیویارک) کے دوست نکلے' ان کے ایک عزیز دوست ڈاکٹر سہیل مقبول کی بہن میری بھابھی شاہین (شاہد کی بیوی) کی کلاس فیلو نکلیں' پھر تو واقفیتوں اور شناسائیوں کا یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہندوستان کے اہل علم طبقہ میں میرے سفرنامے کو پہنچوانا' سلیم صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ انہوں نے دشت امکاں کے متعدد نسخے خرید کر ہندوستان اور پاکستان میں بکھرے ہوئے اپنے دوست واحباب' جو سب کے سب علم دوست حضرات ہیں کو بھجوائے یوں میری کتاب کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہوگیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہاب صاحب رہتے تو نیویارک میں ہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں ایسی زبردست علمی حرکت شروع کر رکھی ہے گویا یہیں رہتے ہوں۔ جوں جوں شناسائی بڑھتی گئی پتہ چلا کہ ہندوستان اور پاکستان میں متعدد کتابیں انہوں نے اپنے خرچے پر چھپوائیں ہیں یہاں کئی بچے ان کی وجہ سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہیں کسی کا گراہوا گھر تعمیر کرا رہے ہیں' کہیں کسی بچی کے سہرے کے پھول کھلا رہے ہیں' میرے توسط سے بھی انہوں نے خدمت خلق کے اس طرح کے کام شروع کردیے جو تادم تحریر جاری ہیں۔ اس بارے میں زیادہ نہیں لکھوں گی کہیں ان کی نیکیاں ضائع نہ ہو جائیں۔ صدقہ و خیرات کے کام پوشیدہ ہی اچھے لگتے ہیں۔

ان کی ایک خوش بختی یہ ہے کہ تقریباً ہر سال بیوی بچوں کے ساتھ عمرہ کرنے آتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء کے عمرے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

مکہ میں مقیم غنی اکرم سبزواری صاحب جو ان کے بڑے دوست ہیں، کی معیت میں وہ جگہ

دیکھنے جانا تھا جو آج کل شمیسی کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر غنی اکرم سبزواری صاحب مکہ یونیورسٹی یعنی جامعہ ام القریٰ کے چیف لائبریرین تھے کراچی یونیورسٹی میں بھی انہوں نے پڑھایا ہے۔ بہرحال عصر کی نماز کے بعد ہم مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ پانچ سات منٹ انتظار کے بعد سبزواری صاحب' عبدالوہاب صاحب' ان کی بیگم خورشید اور دو بیٹیوں رفعت سلیم اور ڈاکٹر ثروت سلیم کے ساتھ آگئے اور ہم ابتدائی سلام دعا کے بعد اپنی اپنی گاڑیوں میں حدیبیہ کی طرف روانہ ہوئے۔

☆☆☆☆☆

یہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ بیت اللہ کا طواف فرمارہے ہیں۔ صحابہ بھی ساتھ ہیں جنہوں نے سر منڈوا لئے ہیں اور قربانی کر رہے ہیں۔ نبی کے خواب سچے ہوتے ہیں' رسول اللہ کے اس خواب کا علم جب صحابہ کرام کو ہوا تو سب میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور جن کے پاس اسباب ووسائل تھے انہوں نے عمرہ کی تیاری شروع کردی۔ بظاہر اسباب ایسے تھے کہ مسلمانوں کا حج کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ کفار قریش نے گزشتہ چھ سال سے مسلمانوں کے لئے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور اس مدت میں کسی مسلمان کو انہوں نے حج یا عمرے کے لئے حدود حرم کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا تھا۔ اب آخر یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ رسول اللہ کو صحابہ کی ایک جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ صحابہ کرام نے تیاریاں تو شروع کردی تھیں لیکن حالات کی سنگینی کا انہیں بھی احساس تھا۔ اگر وہ عمرے کا احرام باندھ کر جاتے ہیں تو ظاہر ہے جنگی ساز وسامان نہیں لے جاسکتے' کیونکہ احرام کی حالت میں تو کوئی مچھر بھی نہیں مار سکتا' چہ جائیکہ جنگ کی نیت کی جائے' غیر مسلح جانے کے معنی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے تھے۔

مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اس کا رب جو حکم بھی دے اس کو وہ بلا چوں وچرا بجالائے، لہٰذا رسول اللہ نے سفر کی تیاری شروع کردی اور آس پاس کے قبائل میں بھی پیغام بھجوادیا کہ ہم عمرے کے لئے جارہے ہیں جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آجائے۔ لیکن ان لوگوں کی نگاہ ظاہری اسباب پر تھی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ لوگ تو گویا موت کے منہ میں جارہے ہیں لہٰذا ان بدو قبائل میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ لیکن آپ پر ایمان رکھنے والے آپ کی صحابہ کی جماعت' نتائج سے بے پرواہ ہوکر آپ کے ہمراہ روانہ ہوئی۔

وہ ذی قعدہ ٦ھ کی پہلی تاریخ تھی۔ (مارچ ٦٢٨ء) جب رسول اللہ عمرہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے آپ کے ساتھ ایک روایت کے مطابق چودہ سو صحابہ تھے۔ تلواریں نیام میں بند ساتھ تھیں جو اس زمانے میں ہر مسافر کے زادِ سفر میں شامل ہوتی تھیں۔ قربانی کے ستر اونٹ ساتھ تھے' رسول اللہ نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا۔ سفر میں جانے سے قبل اس بات کی قرعہ اندازی کی جاتی تھی کہ رسول اللہ کی کون سی بیوی ان کے ساتھ جائیں گی؟ اس سفر کے لئے قرعہ فال ام المومنین سیدہ ام سلمہ کے نام نکلا' مدینہ سے روانہ ہو کر ذوالحلیفہ میں (جسے آج کل ابیار علی بھی کہتے ہیں اور یہ مقام مدینہ سے مکہ کی جانب تقریباً ٦ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مدینہ سے حج کے لئے جانے والوں کا میقات ہے) ظہر کی نماز پڑھی' پھر عمرہ کا احرام باندھا' تلبیہ پڑھی' قربانی کے جانوروں کے گلے میں قلادہ ڈالا گیا تا کہ شناخت رہے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں اور مکہ کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ یہ عمرہ کا مہینہ تھا۔ احرام باندھ کر مکہ آنے والوں کو روکنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ قدیم دستور اور صدیوں کا مروجہ قانون تھا لیکن اس وقت حجاز کی جو سیاسی صورت حال تھی اس کے پیش نظر یہ انتہائی آزمائشی سفر تھا' ابھی پچھلے سال ہی تو شوال ٥ھ میں جنگ خندق ہو چکی تھی۔ جس میں قریش نے قبائل عرب کی متحدہ طاقت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی تھی اور ہزیمت اٹھا کر واپس جانا پڑا تھا۔ اب یہ بات قریش کے لئے کس طرح قابل قبول ہوتی کہ رسول اللہ عمرہ کے لئے ہی سہی' اتنی بھاری جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہو جاتے؟

سفر جاری رہا۔ رسول اللہ نے بنی کعب کے ایک شخص کو مخبر کی حیثیت سے آگے بھیج رکھا تھا تا کہ قریش کے ارادوں اور نقل و حرکت سے آپؐ آگاہ ہو سکیں جب آپؐ عسفان پہنچے جہاں سے اونٹ کی سواری پر مکہ پہنچنے میں دو دن لگتے ہیں تو آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ذی طویٰ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خالد بن ولید کو انہوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف آگے بھیج دیا ہے تا کہ وہ آپؐ کا راستہ روکیں' یہ مقام عسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر مکہ کی جانب واقع ہے۔

اصل میں رسول اللہ کے اس سفر نے قریش مکہ کو سخت آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔ اگر وہ رسول اللہ اور مسلمانوں کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے دیتے ہیں تو سارے عرب میں ان کی ہوا اکھڑ جائے گی اور اگر نہیں داخل ہونے دیتے تب بھی سارا عرب ان پر تھو تھو کرے گا کہ انہوں نے آخر ایک ایسے
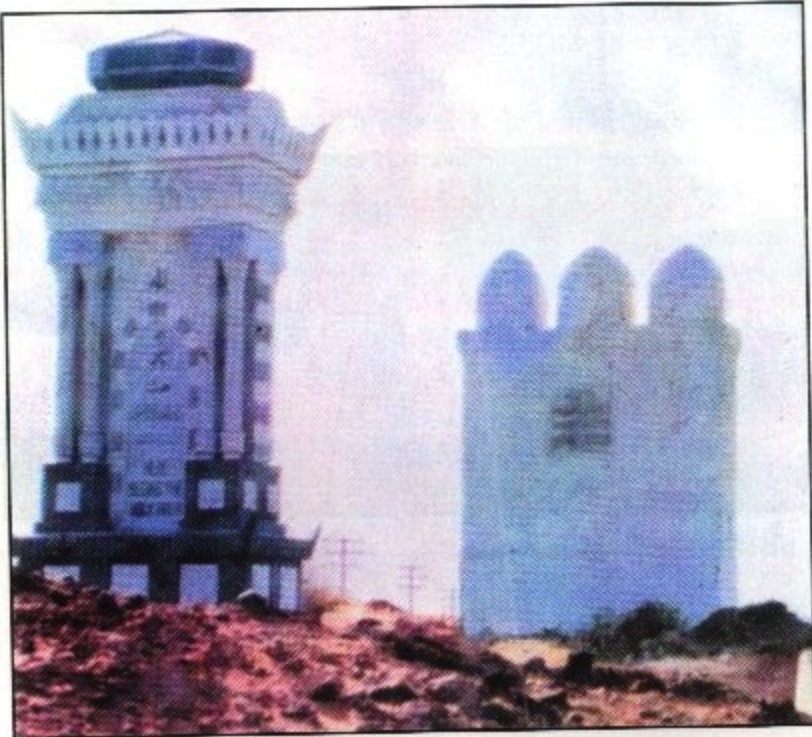
یہ حدودِ حرم کے نشانات ہیں جو حدیبیہ (موجودہ نام شمیسی) کے مقام پر موجود ہیں

حدیبیہ کا کنواں یعنی وہ کنواں جہاں صلح حدیبیہ ہوئی

پرامن قافلہ کو حرام مہینوں میں کیسے روک لیا جبکہ وہ عمرہ کرنے جارہے تھے؟ بالآخر قریش نے یہ سوچا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے ان کو اشتعال دلائیں اور اس کے نتیجے میں اگر لڑائی ہو جائے تو پورے عرب میں مشہور کر دیں کہ یہ لوگ دراصل آئے ہی لڑنے تھے۔ عمرہ کا تو محض بہانہ تھا اور احرام محض دھوکے کے لئے باندھا تھا۔

لیکن رسول اللہ بھی بالآخر رسول اللہ تھے' انہوں نے قریش کی چال کو سمجھ لیا اور فوراً اپنا راستہ بدل دیا اور ایک نہایت دشوار گزار راستہ سے سخت مشقت اٹھا کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے جو عین حرم کی سرحد پر واقع تھا۔ اسی مقام سے جب مسلمانوں نے مکہ کی جانب مڑنا چاہا تو رسول اللہ کی اونٹنی ''قصویٰ'' بیٹھ گئی۔

''قصویٰ کی یہ عادت نہیں کہ یوں بیٹھ جائے بلکہ اس ذات نے اس کو روک دیا ہے جس نے ''اصحاب فیل'' کو روکا تھا۔'' رسول اللہ نے فرمایا اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا گیا مکہ ابھی ایک منزل (تقریباً ۱۳ میل) دور تھا۔

یہاں بنی خزاعہ کا سردار بدیل بن ورقاء اپنے قبیلہ کے چند افراد کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور آپ سے آنے کا سبب پوچھا' رسول اللہ نے فرمایا ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں' صرف بیت اللہ کی زیارت وطواف ہمارا مقصد ہے۔ بدیل نے یہ بات قریش کو پہنچادی اور انہیں مشورہ دیا کہ ان زائرین کو نہ روکا جائے۔ مگر قریش اپنی ضد پر اڑے رہے۔ انہوں نے اب دوسری چال چلی اور احابیش کے سردار حُلیس بن علقمہ کو رسول اللہ کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپ کو واپس جانے پر آمادہ کرے۔ احابیش دراصل اطراف مکہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا۔ جن سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے اس چال سے قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمدؐ حلیس کی بات نہیں مانیں گے تو وہ ان سے ناراض ہو کر پلٹے گا یوں احابیش کی پوری طاقت قریش کے ساتھ مل جائے گی اور مسلمانوں کے لئے مسئلہ پیدا ہو جائے گا مگر حلیس نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام بند ہے' ہدی کے اونٹ' جن کے گلے میں قلاوے پڑے ہیں' چرچگ رہے ہیں انتہائی پرامن حالات ہیں' تو وہ خود ہی قائل ہو گیا اور رسول اللہ سے کوئی بات کئے بغیر مکہ کی طرف پلٹ گیا اور سرداران قریش سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ محض زائرین ہیں عمرہ کی نیت سے آئے ہیں اگر تم لوگ انہیں روکو گے تو احابیش اس حرکت میں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ ہم

اس لئے تمہارے حلیف نہیں بنے کہ تم حرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس بے انصافی میں تم سے تعاون کریں۔

قریش کی دوسری چال بھی ناکام رہی۔

اس کے بعد رسول اللہ نے اپنا سفیر (خراش بن امیہ خزاعی) قریش کے پاس بھیجا تاکہ انہیں اپنی آمد کا مقصد بتائیں کہ یہ حرام مہینہ ہے' ہم لڑنے نہیں' عمرہ کی ادائیگی کے لئے آئے ہیں اگر قریش چاہیں تو ایک مدت مقرر کرلیں' ہم اس معینہ مدت میں عمرہ ادا کرکے واپس چلے جائیں گے۔

اس کے بعد دونوں طرف سے سفراء کا تبادلہ ہوتا رہا قریش نے قبیلہ بنوثقیف کے سردار عروہ بن مسعود کو بھی رسول اللہ کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ عروہ حدیبیہ آئے تو دیکھا ہدی کے جانور ادھر ادھر پھر رہے ہیں' مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں اس حالت میں جنگ و خونریزی ممکن ہی نہیں۔

''جب تک مکہ میں قریش کی حکومت ہے' بیت اللہ کے طواف کی امید کم رکھئے۔'' عروہ نے کہا تو رسول اللہ نے فرمایا۔'' ہم سے بیت اللہ کی زیارت اور طواف کا حق کوئی نہیں چھین سکتا یہ اور بات ہے کہ میں نوک شمشیر اس حق کو منوانا نہیں چاہتا۔ چاہو تو صلح کا راستہ کھلا ہے'' یہی عروہ جب قریش کے پاس واپس گئے تو کہا'' میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں مگر خدا کی قسم میں نے اصحاب محمد کو جس طرح محمدؐ کا فدائی دیکھا ہے ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمہارا مقابلہ کس سے ہے؟''

معاملہ پھر بھی آگے نہ بڑھا تو رسول اللہ نے اپنے داماد سیدنا عثمانؓ ذوالنورین کو ان کے چچا زاد بھائی آبان بن سعید کی پناہ میں مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش کو آمادہ کرسکیں اور مسلمان پُرامن طور پر عمرہ کی ادائیگی کرکے واپس چلے جائیں۔ سیدنا عثمانؓ کی واپسی میں اندازہ سے زیادہ دیر ہوگئی اور یہ افواہ اڑ گئی کہ انہیں قید کرلیا گیا ہے اور پھر ان کی شہادت کی خبر پھیل گئی اس خبر نے مسلمانوں کو سخت مشتعل کردیا۔

''اب ہم اس مقام سے اس وقت تک نہیں ٹل سکتے جب تک عثمان کے خون کا بدلہ نہ لے لیں۔'' رسول اللہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور وہیں ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ کرام سے بیعت لینی شروع کی تاکہ اگر شہادت عثمان کی خبر درست نہیں ہے تو بھی قریش متنبہ ہوجائیں اور انہیں گزند نہ

پہنچائیں اور اگر خدانخواستہ عثمان کو شہید کردیا گیا ہے تو قریش کو پتہ چل جائے کہ مسلمان اس خون ناحق کا بدلہ لئے بغیر ہرگز نہ ٹلیں گے۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بیعت نہیں تھی۔ مسلمان صرف چودہ سو تھے' کسی سامان جنگ کے بغیر آئے تھے' اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دور' عین مکہ کی سرحد پر پڑے ہوئے تھے جہاں دشمن اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوسکتا تھا۔ تمام صحابہ کرام کو موقع کی نزاکت کا پورا پورا علم تھا پھر بھی انہوں نے موت پر بیعت کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ کیا۔ یہی وہ بیعت ہے جو تاریخ اسلام میں ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

''بے شک اللہ ان مومنین سے راضی ہوگیا۔
جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔
جو خلوص ان کے دلوں میں ہے اللہ کو وہ بھی معلوم ہے۔
اللہ نے ان پر تسلی نازل فرمائی۔
انہیں فتح قریب عنایت کی۔
اور بہت سی غنیمتیں ہیں جو انہیں ملنے والی ہیں
اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔'' (سورۃ فتح)

اس بیعت نے قریش اور ان کے خلفاء کو خوفزدہ کردیا اور انہوں نے سیدنا عثمان کی بابت اطلاع بھجوائی کہ وہ اپنے چچا زاد کے گھر میں زندہ سلامت اور بخیر و عافیت ہیں۔ سیدنا عثمان نے واپس آکر رسول اللہ کو بتایا کہ قریش یہ تو تسلیم کررہے ہیں کہ حج کے دنوں میں زیارت کعبہ پر وہ کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ لیکن ان حالات میں اور اس جم غفیر (چودہ سو) کے ساتھ اگر مسلمان مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی ساکھ سخت متاثر ہوگی تاہم وہ معاہدہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ گویا اب قریش اپنی اس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ رسول اللہ اور مسلمانوں کو سرے سے مکہ میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے البتہ اپنی ناک بچانے کے لئے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپ اس سال واپس چلے جائیں آئندہ سال آپ عمرہ کے لئے آسکتے ہیں۔

معاہدہ کے لئے سہیل بن عمرو قریش کے نمائندہ بن کر آئے' رسول اللہ نے سیدنا علیؓ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا۔ معاہدہ مکمل ہوا' گواہوں کے دستخط ہوئے' معاہدہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں' اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں وہ تین دن مکہ میں ٹھہر سکیں گے۔

صلح سے فارغ ہوکر رسول اللہ نے قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے، حلق کرانے (بال منڈوانے) اور احرام اتارنے کا حکم دیا۔ صحابہ اس معاہدہ سے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ حضور کی پورے دور رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ صحابہ کو کسی بات کا حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لئے دوڑ نہ پڑیں۔ رسول اللہ کو فطرتاً اس بات سے تکلیف پہنچی وہ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے، سیدہ ام سلمہ نے خیریت دریافت کی انہوں نے صحابہ کے رویہ کی شکایت کی تو ام سلمہ نے جہاندیدگی سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، خود قربانی دیں حلق کرائیں اور احرام اتاریں پھر وہ بھی آپ کی متابعت میں ایسا ہی کریں گے۔

مشورہ بڑا صائب تھا۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا صحابہ کرام نے رسول اللہ کے فیصلے کی حمیت کو محسوس کیا تو انہوں نے آپ کی متابعت کی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ کی حکم عدولی کی، دراصل انہیں مکہ میں داخلے اور حج کی ادائیگی کی امید تھی۔ پھر صلح کی شرائط ان کی توقع کے مطابق نہیں تھیں لہٰذا جو صدمہ اور تکلیف انہیں پہنچی وہ اس کا فطری ردعمل تھا۔

معاہدہ کے بعد تین دن تک آپ حدیبیہ میں مقیم رہے اس طرح حدیبیہ میں قیام کی مدت چودہ دن ہوگئی پھر مدینہ کی طرف سفر شروع ہوا۔ راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی۔ جس سے مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جس صلح کو وہ شکست سمجھ رہے تھے دراصل فتح عظیم ہے۔

''ہم نے تم کو فتح دی''

فتح مبین (واضح اور صریح فتح)۔ تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے

اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے

اور تم کو سیدھے راستے پر چلائے

اور تمہاری ہر ممکن اور بہتر سے بہتر مدد کرے۔

(الفتح ۱۔۳)

اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا۔ آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لئے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے پھر آپ نے یہ سورۃ تلاوت فرمائی اور خاص طور پر سیدنا عمر کو بلا کر سنایا کیونکہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ تھے اور پھر تین ماہ نہیں گزرے تھے کہ فتح

خیبر سے اس فتح مبین کا جو سلسلہ شروع ہوا تو فتح مکہ پر جاکر بھی ختم نہ ہوا۔ اس سورۃ نے گویا مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ دیا

قرآن مرہم ہی تو ہے

ہر طرح کی بیماریوں اور زخموں کا

زخم خواہ جسم پر لگے یا روح پر

یہ اور بات ہے کہ ہم نے اس مرہم کا استعمال ترک کردیا ہے

☆☆☆☆☆

مکہ کی سڑکوں پر ٹھیک ٹھاک رش تھا، گرمی بھی اچھی خاصی تھی، جلد ہی یہ فاصلہ طے ہوگیا، کشادہ سڑک کے داہنے جانب ہماری گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ قریب ہی سنگی یادگاری بنی ہوئی تھی جو دراصل حدود حرم کے نشانات ہیں۔ ترکوں کے دور کی بنی ہوئی یہ سنگی یادگاریں، جو سڑک کے دونوں جانب ایستادہ ہیں، بہت قدیم ہیں اکثر پرانے سفرناموں میں ان سنگی ستونوں کا ذکر ہے۔ آج کل یہ جگہ شمیسی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ مقام مکہ، جدہ کی پرانی سڑک پر واقع ہے۔

اس کے کچھ فاصلے پر وہ کنواں تھا جس کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ کنواں بہت گہرا تھا اور سطح نظر نہیں آتی تھی ہمارے پاس زوم کیمرہ تھا جس کی بدولت کنویں کی تہہ تک ہماری نظروں کی رسائی ہوسکی تہہ میں بہت سے کبوتر چگ رہے تھے، کنواں بالکل خشک تھا۔ میں نے، بچوں نے، رفعت وثروت نے یہاں کئی تصاویر کھنچوائیں۔ بدقسمتی نے ہماری یہ پوری ریل خراب ہوگئی۔ بہر حال یہ قدیم کنواں پرانے زمانوں میں نہایت اہم تھا۔ چونکہ یہاں سے حدود حرم شروع ہوتے تھے لہٰذا حاجیوں کے قافلے یہیں احرام باندھتے اور اونٹوں کو پانی پلا کر سفر شروع کرتے۔

اس کے بعد ہم اس مسجد کی طرف چلے جو اسی جگہ بنائی گئی ہے جہاں رسول اللہ کا خیمہ تھا اور وہیں صلح حدیبیہ ہوئی تھی، یہاں سب سے پہلے ۱۲۵۵ء میں ایک سادہ سی تین در والی مسجد تھی، جو ایک بلند چبوترے پر بنائی گئی تھی۔ اس کے ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد ۱۹۶۳ء میں دوسری مسجد تعمیر کی گئی اس کے شکستہ آثار موجود مسجد شمیسی کے قریب ہی موجود ہیں۔ موجودہ مسجد شمیسی خاصی بڑی ہے۔ پیلے رنگ کی سادہ سی ایک مینار والی مسجد، اس کے سائے میں ہم نے اپنی گاڑیاں پارک کیں اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔

سبزواری صاحب کھانے پینے کی اشیاء ساتھ لائے تھے۔ خورشید بھابی نے وہ سامان خورد نوش نکالا اور گفتگو کے ساتھ ساتھ یہ شغل بھی شروع ہوگیا' تاہم ہم میں سے غالباً ہر ایک بار بار گردن اٹھا کر گرد و نواح کو دیکھتا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں رسول اللہ اور ان کے جان نثار دو ہفتہ ٹھہرے تھے۔

''ان پہاڑوں کو دیکھئے' رسول اللہ نے بھی انہیں دیکھا ہوگا۔''

عبدالوہاب صاحب کی آواز سے عقیدت جھلک رہی تھی' حدیبیہ کے میدان کے گرداگرد وہ پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے جن کے دامن میں اللہ کے رسول نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

چونکہ عشاء کی نماز حرم میں پڑھنی تھی لہٰذا ہم زیادہ دیر وہاں نہ رک سکے اور مسجد حرام کی طرف روانہ ہوئے۔

عشاء کی نماز کے بعد ہم گھر پہنچے تو عبدالوہاب صاحب کا فون آ گیا۔ کل وہ لوگ مدینہ اور ہم لوگ جدہ جا رہے تھے لہٰذا ملاقات کے لئے یہ رات ہی ہو سکتی تھی۔ میں بہت تھک گئی تھی لیکن سجاد نے آنے کی حامی بھرلی یوں ایک بار پھر ہم حرم کی طرف چلے' وہاب صاحب کا قیام ہوٹل زینی عارف میں تھا۔ یہ ہوٹل حرم سے بالکل متصل ہے اور ہوٹل کا ایک دروازہ مروہ کی اوپری منزل میں کھلتا ہے۔ یوں ہوٹل والے براہ راست حرم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال دونوں بچیوں نے بستر سنبھال لیا تھا لہٰذا میں سجاد اور سعود زینی عارف گئے۔ لفٹ سے نکلتی ہوئی خورشید بھابی اور ان کی بیٹی سے ملاقات ہوگئی وہ دونوں عمرہ کی ادائیگی کے لئے جا رہی تھیں جبکہ ہم اوپر وہاب صاحب سے ملنے چلے گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اس دوران خورشید بھابی اور رفعت کے آنے کے بعد چائے کا دور چلا پھر رات گئے ہم ان سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔

☆☆☆☆☆

تیما

وہ ۵ جولائی ۲۰۰۰ء کی صبح تھی ہم مدینہ سے تبوک جانے کے لئے تیار تھے البتہ جاتے جاتے میری فرمائش پر مدینہ کے کچھ کنوؤں کی تلاش میں نکلے' ادریس بھائی جو کئی سال سے مدینہ میں مقیم تھے ان کی مدد حاصل کی گئی' بمشکل تمام ہماری پہنچ بئر عثمان تک ہو سکی۔ قدیم زمانے میں اس کا نام بئر رومہ تھا یہ کنواں پانی کی مٹھاس اور لذت کے لئے مشہور تھا لیکن اس کا مالک ایک یہودی تھا رسول اللہ نے ایک بار صحابہ کرام کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس کنویں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا جائے۔ سیدنا عثمانؓ نے اسی وقت یہ کنواں بیس ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا اسی لئے اس کا نام ''بئر عثمان'' پڑ گیا۔ رسول اللہ نے ان کی اس فیاضی پر انہیں جنت کی بشارت دی۔ بعد میں جب ۳۵ھ میں خلیفہ ثالث کے خلاف باغیوں نے جرأت کی اور انہیں دار عثمان میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا اور ان پر پانی بند کر دیا تو انہوں نے باغیوں کو مخاطب کر کے پوچھا تھا کہ آج تم اس کنویں کا شیریں پانی مجھ پر بند کرتے ہو، جسے رسول اللہ کے حکم پر میں نے اپنے مال سے مول لے کر تمہارے لئے وقف کیا تھا؟

یہ واقعہ یاد کر کے پورا وجود کڑواہٹ سے بھر گیا اس قوم کو کیا کہا جائے جو اپنے محسنوں کے قتل پر آمادہ ہو جائے؟

یہ کنواں اور اس سے سیراب ہونے والا مزرعہ ایک وسیع احاطہ میں تھا ہم احاطہ کا چکر لگا کر تھک گئے' کہیں سے اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ بالآخر ایک جگہ ادریس بھائی کو دخول کے کچھ آثار نظر آئے وہ گاڑی سے اتر کر قریب گئے جہاں چند مرد اور چند کھیلتے ہوئے بچوں سے ''اپنی عربی'' میں معلومات حاصل کیں پتہ چلا کہ یہ مزرعہ بند ہے' کنواں چونکہ بہت اندر کہیں جا کر رہا ہوگا لہٰذا مزید جستجو ترک کر کے ہم ادریس بھائی کو ڈراپ دیتے ہوئے سفر پر نکل گئے۔

خیبر تک کا وہی راستہ تھا خیبر کی وہی سیاحی تھی وہی وحشت' وہی گرمی' وہی ہم' خیبر سے نکلے اور

پھر تبوک تک کے لئے سفر شروع ہوا۔ میرا خیال تھا کہ راستے میں فدک' تیما اور وادی القریٰ کی بستیاں پڑیں گی جو کہ خیبر سے قریب ہی تھیں اور عہد رسالت میں یہاں بھی یہودی آباد تھے جب خیبر فتح کیا گیا تھا تو ان تینوں بستیوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی تھی اور جزیہ وخراج کی ادائیگی پر راضی ہو گئے تھے لیکن راستے میں ہمیں صرف تیما کی بستی نظر آئی جہاں ہم نے کچھ دیر قیام کیا۔

خیبر سے تیما کا درمیانی راستہ ڈھائی سو میل ہے جو ہم نے تین گھنٹے میں طے کر لیا کیونکہ سڑک انتہائی شاندار تھی۔ خیبر سے تیما تک سفر کا حال ۱۹۷۵ء میں کیا تھا؟ ذرا دل تھام کے پڑھیئے۔

''تیما کا یہ راستہ اس قدر خراب (عربوں کی عامی زبان میں بطال) تھا کہ پورے سفر میں اس سے خراب راستہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کی بعض سمتوں میں گاڑی سات، آٹھ میل کی رفتار سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی اور کہیں کہیں بیل گاڑی کی رفتار سے چلنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک رات چلنے کے بعد ۲۵ دسمبر کو جمعہ کے وقت ہم تیما پہنچے۔ خیبر سے تیما کے درمیان ۲۵۰ میل کے قریب مسافت ہے۔ اس پورے سفر میں ہمیں ایک بھی آبادی نہیں ملی۔ صرف ایک جگہ ایک بدو ملا جو پیدل سفر کر رہا تھا اور معلوم نہیں کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس نے دور سے اپنے بدوانہ لہجے میں آواز دے کر ہماری گاڑی کو رکوایا اور ایک بڑے پیالے میں پانی مانگا ہم نے پانی سے اس کا پیالہ بھر دیا۔ جسے اس نے ایک مرتبہ منہ کو لگایا اور سارے کا سارا اپنے اندر انڈیل لیا۔ پھر ہم نے اسے کچھ روٹیاں دیں جنہیں وہ اس بیتابی سے کھانے لگا جیسے کئی دن کا بھوکا ہو بدوؤں کے اس کمال کا ہم نے تذکرہ تو سنا تھا لیکن اسے دیکھا نہ تھا کہ وہ سردی کے موسم میں ایک کمبل' ایک پیالہ اور ایک دیا سلائی لے کر عرب کے اس غیر آباد علاقہ میں لمبے سے لمبا سفر کرنے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ رات پڑ گئی تو جنگل سے لکڑیاں توڑ لیں اور ان ہی کو جلا کر رات گزاری۔ راستے میں کوئی موٹر مل گئی تو اس سے پانی لے کر پی لیا ورنہ بھوکے پیاسے چلتے رہے اس میں جہاں ان بدوؤں کی جفاکشی کا دخل ہے' وہاں ان کی غربت وناداری کا بھی دخل ہے۔ اس وقت عرب میں یا تو وہ لوگ ہیں جو ہوائی جہاز سے کم سفر نہیں کر سکتے یا پھر اس قسم کے دیہاتی ہیں جو ٹرک پر سفر کرنے کے لئے بھی کرایہ نہیں رکھتے۔'' (سفرنامہ ارض القرآن از محمد عاصم)

تیما کی سرسبزی اور شادابی حیرت انگیز ہے صحراؤں کے درمیان کھلا یہ گلاب قابل رشک حد تک خوبصورت ہے تیما ایک چھوٹا سا شہر ہے یہاں بھی وہی حال ہے جو بدر اور خیبر وغیرہ کا ہے۔ یعنی ایک

طرف پرانا تیما ہے جہاں پیلی مٹی گارے کے ٹوٹے پھوٹے مکانات ہیں کھجور کے ان گنت درختوں کے جھنڈ، کچے راستے اور ٹھنڈا میٹھا سایہ وغیرہ دوسری طرف جدید تیما ہے اسفالٹ کی شاندار سڑکیں، مضبوط اور شاندار عمارتیں' باغات اور سرکاری عمارتیں وغیرہ۔ اس بستی میں جب ہم پہنچے تو سہ پہر ہو رہی تھی۔

تیماء ایک قدیم بستی ہے جو شمالی عرب کے ایک شادات نخلستان میں واقع ہے۔ تیما کا ذکر عہد عتیق میں بھی اس حیثیت سے آیا ہے کہ یہ کاروانوں کی شاہراہ کی ایک اہم منزل ہے۔ قدیم عرب شعراء بھی اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً امراء القیس اپنے معلقہ (شعر ۷۶) میں کہتا ہے۔

''یہ (طوفان بادوباراں) تیما میں کسی کھجور کے درخت کو قائم نہیں چھوڑتا
اور نہ کسی مکان کو
جب تک کہ وہ پتھروں کا نہ بنا ہو''

سیدنا عمر نے جب اپنے عہد خلافت میں عرب کو یہودیوں سے پاک کیا تو تیما کے یہودیوں کو بھی ملک بدر کر دیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی میں مشہور جغرافیہ داں ابن حوقل اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ تیما کی آبادی تبوک سے بھی زیادہ گنجان تھی۔

اس صدی کا ایک اور مشہور سیاح مقدسی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیما ایک وسیع اور شاداب بستی ہے اور نشیبی علاقے میں واقع ہے جس میں ایک چشمہ اور کئی کنوئیں ہیں جن میں سے کچھ ویران ہو گئے ہیں۔ بہت عمدہ باغات ہیں اور کھجور کے درخت بکثرت ہیں۔ جن کا پھل نہایت اچھا ہے۔ [۱] اس کے برعکس مقدسی باشندوں کی حرص و آز کی مذمت کرتا ہے اور افسوس ظاہر کرتا ہے کہ اس شہر میں نہ کوئی عالم ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے' اور نہ کوئی حاکم جس پر بھروسہ ہو سکے مقدسی لکھتا ہے ''میں نے ان کا خطیب دیکھا جو کنجڑا تھا اور ان کا حاکم دیکھا جو موچی تھا''۔ [۲]

گیارہویں صدی میں البکری لکھتا ہے کہ اس میں کھجور کے درختوں' انجیروں اور انگوروں کی کثرت ہے اس گنجان آبادی والے شہر کی فصیل ایک فرسنگ لمبی تھی' جو ایک ندی کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔'' [۳]

---

[۱] : دائرۃ المعارف الاسلامیہ، جلد ۶ ص ۱۹۲

[۲] : ایضاً [۳] : ایضاً (بحوالہ البکری ''المعجم فی ما استعجم'' ص ۲۰۸)

برج ھداج ۔ تیما
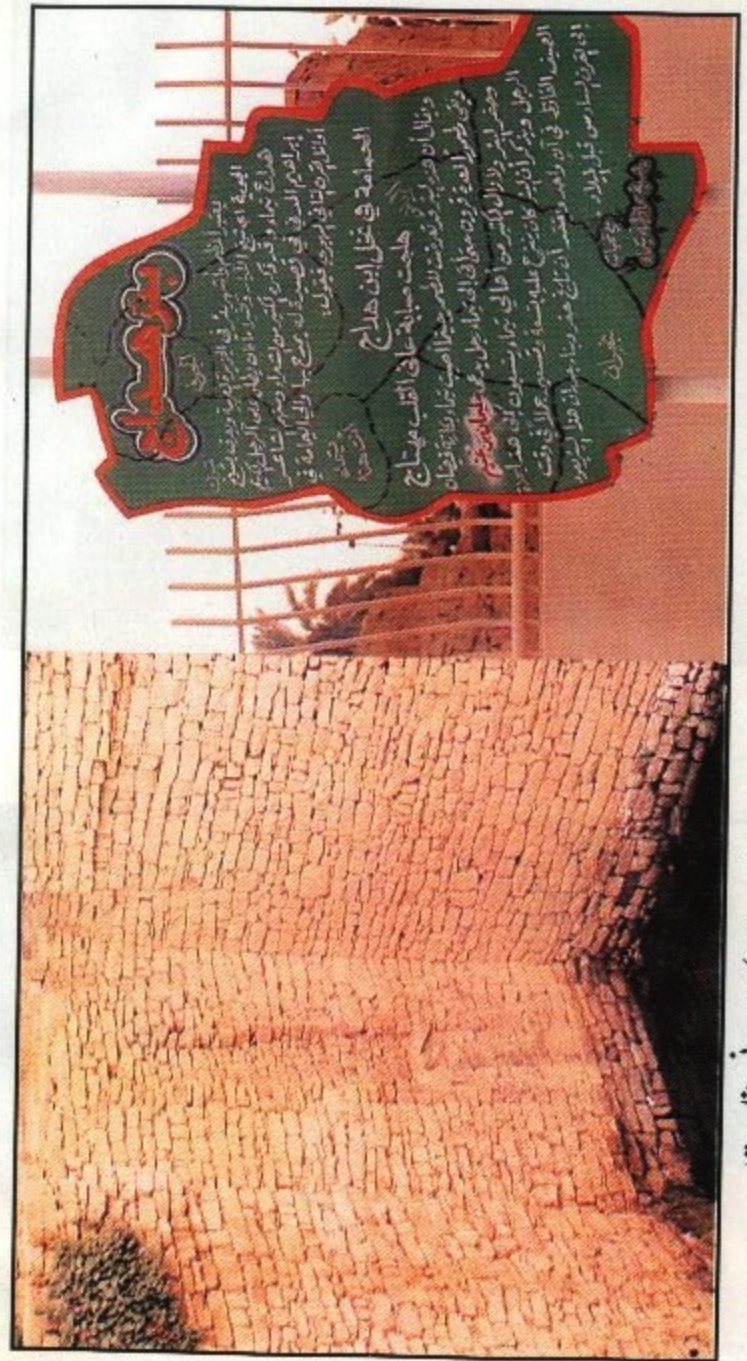
برج ھداج کا اندرونی منظر ۔ تیما

جدید تیما کے گرد کوئی فصیل نہیں ہے یہاں مقامی لوگوں سے ہم نے پوچھا کہ یہاں کوئی آثار قدیمہ بھی ہے تو انہوں نے ہمیں ایک کنویں اور ایک قلعہ کے آثار کی نشاندہی کی۔ سجاد ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمیں کنویں تک لے آئے جس پر بئر هداج کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ تصویر میں اس بورڈ کو غور سے دیکھیں یہ سعودی عرب کا نقشہ ہے، جہاں ''أنت هنا'' (اس وقت آپ یہاں ہیں) لکھا ہے۔ یہ تیما ہے۔ کنواں جس کو حفاظت کے خیال سے باڑ لگا کر ہر جگہ سے بند کر دیا گیا تھا ایک کونے سے اندر جانے کا راستہ پا کر ہم سب آہستہ آہستہ باڑ کے اندرونی احاطہ میں داخل ہو گئے جہاں وہ قدیم کنواں ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ پورے تیما کی سرسبزی و شادابی کا دارومدار اسی کنویں پر تھا۔ کنویں کی پتلی پتلی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی دیواریں تھیں۔ کنویں کی گہرائی ۴۰ یا ۴۵ فٹ بتائی جاتی ہے اور قطر ۶۰ فٹ۔ ایک جگہ جہاں منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی ہم نے بھی قوت مجتمع کر کے کنویں کے اندر جھانک کر دیکھا اور ہولا کر پیچھے ہٹ گئے۔ سعود اور سجاد فوٹو گرافی میں مصروف ہو گئے اور میں ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتی، واپسی کا شور مچاتی رہی۔ حالانکہ یہاں آنے کے لئے شور بھی سب سے زیادہ شاید میں نے ہی مچایا تھا۔

''چلئے جناب کنواں دیکھ لیا اب قلعہ کے آثار.....''

ہم سب واپس اپنی گاڑی میں بیٹھے اور قلعہ کی تلاش میں چل پڑے، شام ہو رہی تھی اور ابھی تبوک پہنچنا تھا۔ سجاد نے آنے جانے کے راستوں کے کئی چکر لگائے بالآخر ''یوریکا'' کا نعرہ مارا۔ قلعہ کے آثار کو باڑ لگا کر سیاحوں کے لئے بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آثار مخدوش تھے، حادثہ ہو سکتا تھا اس قلعہ کے بارے میں جہاں تک میری معلومات ہیں یہ سموٴل کا قلعہ تھا جو قلعہ ابلق کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے معنی سرخ و سفید کے ہیں۔ بابل کے اس بادشاہ سموٴل کا گرمائی دارالحکومت تیما تھا۔

یہ قلعہ مضبوطی اور خوبصورتی کی وجہ سے عربوں کے یہاں ضرب المثل تھا اعشیٰ اور کئی شعرا نے اپنی شاعری میں قلعہ ابلق کا تذکرہ کیا ہے۔

سموٴل بن عادیا غالباً یہودی تھا اور اچھا شاعر تھا۔ وہ امراء القیس کا معاصر تھا لہٰذا اس کا عروج لازماً چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ہوا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک پوتا اسلام لے آیا تھا اور حضرت معاویہؓ کی خلافت کے آخر تک زندہ رہا تاہم سموٴل کی وجہ شہرت اس کی شاعری سے زیادہ مخصوص عرب روایات کی پاسداری ہے۔ عربوں کے یہاں پناہ کے انعقاد کے معاملہ میں ایفائے عہد کا خاص اہتمام تھا۔

سموٴل نے بھی ایفائے عہد کی ایسی مثال قائم کی کہ یہ بات ضرب المثل بن گئی۔

اوفی من السموٴل

یعنی سموٴل سے بھی زیادہ باوفا

ہوا یوں کہ امرؤ القیس بن حجر الکندی اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے طالع آزمائی کرتا ہوا آوارگی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنے بہت سے ساتھیوں کو کھو دینے کے بعد شاہ حیرہ المنذر کے مقابلے سے بھاگ رہا تھا تو اس نے سموٴل کے اس قلعہ ابلق میں آ کر پناہ طلب کی۔ پناہ مل گئی۔

کچھ عرصے بعد جب وہ بازنطینی دربار میں گیا تا کہ قیصر روم سے اپنے باپ کے قاتلوں کے خلاف مدد مانگ سکے۔ تو اپنی ایک بیٹی، ایک چچازاد بھائی سو کے قریب زرہیں اور بعض خاندانی نوادرات سموٴل کی نگرانی اور حفاظت میں چھوڑ گیا۔ امرو القیس کی عدم موجودگی میں شاہ حیرہ کی فوج نے سموٴل کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور امرو القیس کی مملوکہ امانت طلب کی، سموٴل امانت میں خیانت پر تیار نہ ہوا پھر امر القیس کی بیٹی اور عزا اس کی پناہ میں تھے وہ عہد توڑنے پر راضی نہ ہوا۔

اتفاق سے سموٴل کا ایک بیٹا کسی طرح دشمن کی فوج کے ہتھے چڑھ گیا اب انہوں نے سموٴل کو دھمکی دی کہ اگر تم نے امرو القیس کی چیزیں ہمارے حوالے نہ کیں تو تمہارے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا۔ [1]

سموٴل کے دل میں خون کے آنسو ٹپکتے رہے ہوں گے اور ایک ایسا غم اس نے مستعار لے لیا جس نے جلد ہی اسے بوڑھا کر دیا ہوگا۔ لیکن اس نے اپنے دوست سے کئے وعدہ سے بے وفائی نہ کی۔ قلعہ ابلق کے آثار طویل رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں ہم نے اس کے گرد کئی چکر لگائے لیکن تصویر لینے میں ناکام رہے۔

سعودی عرب میں تصویر کشی ایک مرحلہ ہوتی ہے، ہم چھپ چھپ کر تصویریں کھینچتے رہے تھے۔ قلعہ کے آثار کی تصویر لینے کے لئے سجاد نے سڑک کے اس طرف گاڑی روکی جہاں قدرے سناٹا تھا اور یہاں سے قلعہ کے آثار بھی نظر آ رہے تھے ابھی سجاد نے کیمرہ سیٹ ہی کیا تھا کہ مرور (ٹریفک پولیس) کی گاڑی آ گئی۔ پولیس افسر اپنی گاڑی سے اتر کر سجاد کے پاس آیا، ہاتھ ملایا، خیریت پوچھی اور بڑی شائستگی

---

[1] حموی، یاقوت 'معجم البلدان' جلد ۱ ص ۷۵

سے اس قانون کا حوالہ دیا کہ یہ چونکہ زیادہ تر آرمی کا علاقہ ہے لہٰذا تصویر کشی منع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قلعہ ابلق کی باقیات کی کوئی تصویر نہ لے سکے۔ جس کی تعریف میں سموال کہتا ہے

"یہ قلعہ ایک پہاڑ ہے ہر اس کو ٹھکانا دیتا ہے
جس کو ہم ٹھکانہ دیتے ہیں
اور وہ بہت محفوظ ہے
اور نیزے کے حملوں کو روک دیتا ہے، مانند تاج ہے۔
اس کی بنیادیں زمین سے نیچے اور اس کی تعمیر ستاروں تک بلند ہیں
جہاں تک پہنچا نہیں جا سکتا۔
یہ ابلق الفرد ہے، جس کا ذکر ہوا
اور اس کو نشانہ بنانا کچھ آسان نہیں۔"

میں سوچتی رہی جسے حیرہ کی فوج تباہ نہ کر سکی، زمانے کی دست و برد سے بچ نہ سکا۔

☆☆☆☆☆

تبوک

ہم تیما سے نکلے تو تبوک ہماری منزل تھا، جو سعودی عرب کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے آگے حقل کی بندرگاہ ہے پھر اردن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ تیما اور تبوک کا درمیانی راستہ تقریباً ۲۲۶ کلومیٹر (۱۷۰ میل) ہے یہ راستہ ہمیں تین گھنٹے میں طے کر لینا چاہئے تھا۔ تیما سے نکلے تو شام ہو رہی تھی۔ تبوک پہنچے تو رات پڑ چکی تھی۔ جب تک سورج نہیں ڈوبا ہم اردگرد کے مناظر کو نگاہوں میں سمیٹتے چلے جب رات پڑ گئی تو دائیں بائیں سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا لہٰذا تبوک کا شدت سے انتظار شروع ہو گیا۔

جب ہم تبوک پہنچے تو رات کے نو بج رہے تھے۔ مرکزی شاہراہ پر ہم دور تک چلتے چلے گئے۔ ہوٹل کی تلاش کا مرحلہ درپیش تھا ایک جگہ رک کر ہم نے چکن تکہ وغیرہ کھایا۔

"اتنے بڑے شہر میں آپ کو آثار نبی کہاں ملیں گے محترمہ؟"

سجاد کا یہ وہ سوال تھا جس پر کافی دیر سے سوچ سوچ کر میں ہلکان ہو رہی تھی۔

"اللہ مالک ہے کل کا دن ہمارے پاس ہے۔ آثار کی تلاش میں نکلیں گے تو مل بھی جائیں گے۔" میں نے ہمت نہ ہاری۔ تبوک کے ایک خوبصورت اور بڑے ہوٹل حمدان میں رات گذارنے کے لئے ہم نے کمرہ لے لیا۔ یہ کمرہ نمبر ۲۰۵ تھا اس شاندار کمرے میں فریج، ٹی وی، فون سے لے کر ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ صاف ستھرا باتھ روم دیکھ کر سب نے نہانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور پھر سونے کا مرحلہ تھا۔

اگلے دن صبح اٹھ کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو تبوک کا شہر دن کی روشنی میں میری نظروں کے سامنے تھا۔ سامنے بڑی بڑی کشادہ عمارتیں، چوڑی سڑکیں، اور خاصا سبزہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس شہر کو دیکھنے سے وسعت کا احساس ہو رہا تھا۔

یہاں رسول اللہ اور مسلمانوں کا لشکر ۹ھ میں خیمہ زن ہوا تھا رومیوں سے معرکہ درپیش تھا۔ رومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کی ابتداء فتح مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ نے

اشاعت اسلام کی غرض سے گردونواح کے علاقوں میں مختلف وفود بھیجے ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحد شام سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان لوگوں نے رسول اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ۱۶ رکنی وفد کے پندرہ اراکین کو قتل کردیا صرف رئیس وفد کعب بن عمیر غفاری بچ کر واپس آ سکے۔

اسی زمانہ میں رسول اللہ نے بصریٰ کے رئیس شرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوت اسلام کا پیغام بھیجا تھا، یہ بھی عیسائی تھا اور براہ راست قیصر روم کے تابع تھا، اس نے بھی رسول اللہ کے ایلچی حارث بن عمیر کو قتل کروادیا۔ ایلچیوں کا قتل معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک طرح کا اعلان جنگ ہوتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج سرحد شام کی طرف بھیجی تاکہ آئندہ کے لئے یہ علاقہ مسلمانوں کے لئے پرامن ہوجائے۔ اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرات نہ کرسکیں۔ یہ فوج جب معان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرحبیل بن عمرو کا ایک لاکھ کا لشکر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے آرہا ہے۔ خود قیصر روم حمص کے مقام پر موجود ہے۔ اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے۔ ان خوفناک اطلاعات کے باوجود تین ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور موتہ کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ کی فوج سے جا ٹکرایا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں مسلمانوں کا بھرکس نکل جاتا۔ لیکن سارا عرب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس جنگ میں کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو کسریٰ کے زیر اثر تھے اسلام کی طرف متوجہ کردیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہوگئے۔

انہی مسلمان ہونے والوں میں رومی سلطنت کی عربی فوج کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی بھی تھا۔

اسلامی تاریخ ایسے کرداروں کو بھول نہیں سکتی

قیصر کو جب فروہ کے قبول اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے اسے گرفتار کرکے اپنے دربار میں بلالیا۔

''دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا تمہیں موقع دیا جاتا ہے۔'' قیصر روم نے اسے دھمکی آمیز انداز میں کہا ''ترک اسلام، جس کے نتیجے میں نہ صرف تمہیں آزاد کردیا جائے گا بلکہ اپنے عہدے پر بحال کردیا جائے گا۔ اور یا پھر اسلام کا انتخاب کرلو جس کا نتیجہ تمہاری موت ہوگی۔''

ایک لمحہ کے تامل کے بغیر فروہ نے مضبوط لہجے میں کہا ''میرا انتخاب اسلام ہے'' چنانچہ قیصر نے فروہ کو قتل کرادیا۔ لیکن یہ جانثاری، قیصر روم کے لئے لمحہ فکریہ بن گئی۔ جس نظریہ کے محافظ، اتنے جانثار ہوں کہ اپنی جانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ اس نظریہ کو کثرت فوج سے شکست نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذا قیصر روم نے اس نظریہ کی بیخ کنی کا ایک اور فیصلہ کرلیا۔ دوسرے ہی سال قیصر روم نے مسلمانوں کو غزوہ موتہ کی سزا دینے کے لئے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کردیں۔ رسول اللہ اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپ نے بلا تامل اس وقت کی دنیا کی سپر پاور قیصر روم سے ٹکرانے کا فیصلہ کرلیا۔

بڑے لوگوں کے بڑے فیصلے!

اور اگر اس وقت ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو مسلمانوں کی ساکھ اکھڑ جاتی، جس کو سالوں کی محنت اور قربانیوں سے قائم کیا گیا تھا۔ اس لئے باوجود اس کے کہ ملک میں قحط سالی تھی، گرمیاں شدید پڑ رہی تھیں، فصلیں پکنے کے قریب تھیں سرمایہ کی شدید قلت تھی، سواریوں کا انتظام دشوار تر تھا، اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں (Super Powers) میں سے ایک سے مقابلہ درپیش تھا۔

رسول اللہ نے جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

اہل مدینہ نے اپنی بساط سے بڑھ کر سامان حرب کی فراہمی کی تیاری شروع کردی۔ سیدنا عبدالرحمٰن ابن عوف اور سیدنا عثمان نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ جس پر خوش ہوکر رسول اللہ نے فرمایا ''آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا''۔

سیدنا عمر نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا نصف لاکر مسجد نبوی ﷺ میں ڈھیر کردیا۔

سیدنا ابوبکر صدیق نے اپنی عمر بھر کی پونجی نذر کردی اور جب رسول اللہ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟

تو ابوبکر صدیق نے بہت رسان سے جواب دیا ''اللہ اور اس کے رسول کی محبت''

غریب صحابہ نے محنت مزدوری کرکے جو کچھ کمایا، لاکر حاضر کردیا۔ یہ موقع عملاً ایمان اور نفاق کے امتیاز کی کسوٹی بن گیا۔

رجب ۹ھ کی کوئی تاریخ تھی، جمعرات کا دن تھا۔ جب آپ نے مدینہ کو خیر آباد کہا آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ انصاری کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تاہم ابن ہشام اور طبری نے حضرت

قدیم ترکی قلعہ کے قریب چشمہ کی بیرونی دیوار (تبوک)

تبوک کے قدیم چشمہ کا موجودہ منظر

سباع بن عرفطہ انصاری کا نام لکھا ہے۔ اہل وعیال کی حفاظت پر سیدنا علی کو نگران مقرر کیا اور مسجد نبوی کی امامت سیدنا عبداللہ ابن مکتوم کے سپرد ہوئی۔

رسول اللہ جب تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو تیس ہزار مجاہدین آپ کے ساتھ تھے۔ ان میں صرف دس ہزار سوار تھے، اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت یہ کوئی معمولی معرکہ نہیں تھا۔

آزمائش سی آزمائش تھی۔

یہ لشکر بھی مدائن صالح سے گذرا تھا۔ پھر جب یہ تبوک پہنچا تو معلوم ہوا کہ قیصر روم مقابلہ پر آنے کے بجائے، پہلو بچا گیا غزوہ موتہ میں ایک لاکھ کے لشکر کے مقابلے میں تین ہزار کے اسلامی دستہ کی جو شان وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود نبی کی قیادت میں آنے والے تیس ہزار کے لشکر سے جا بھڑتا۔

یہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی اخلاقی فتح تھی۔

گردونواح کے قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور جوق در جوق وفود نے رسول اللہ کے پاس حاضر ہونا شروع کردیا۔

آپ تبوک میں بیس دن ٹھہرے تھے۔ اس عرصہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم کے زیر اثر تھیں۔ اسلامی سلطنت کا تابع اور باج گذار بنالیا۔ یوں اسلامی ریاست کی سرحدیں سلطنت روحہ سے جا ملیں

....

بچے تیار ہو چکے تھے۔

ہم نے ہوٹل کو خیر آباد کہا۔ چلتے چلتے میں نے PSO کی سیرۃ النبی البم۔ ساتھ رکھ لی۔ یہ تصویری البم میری ایک طالبہ سیدہ ہما کلیم نے ۲ مئی ۱۹۹۶ء کو مجھے تحفتہً دی تھی۔ اس میں بہت سی نادر و نایاب تصاویر کے ساتھ ساتھ تبوک کی مسجد، چشمہ اور کنوئیں کی تصاویر بھی تھیں۔ فی الوقت ہم اس کی مدد سے آثار کو پہچان سکتے تھے۔ کل رات جہاں ہم نے چکن تکہ کھایا تھا۔ وہیں سجاد نے کسی مقامی شخص سے مسجد رسول اللہ کے بارے میں پوچھا تھا، اس نے بتایا تھا کہ وہ مسجد یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ لہٰذا ہم گاڑی میں بیٹھ کر

مسجد رسول اللہ ﷺ ۔ تبوک (۶ر جولائی ۲۰۰۰ء)

تبوک کا افتتاحی چوک (۶ جولائی ۲۰۰۰ء)

ہوٹل حمدان (کمرہ نمبر ۲۰۵) سے لی گئی شہر تبوک کی ایک تصویر ۶ر جولائی ۲۰۰۰ء)

سیدھے وہیں جا پہنچے۔

''اگر تم ان علاقوں میں گاڑی چلاتے رہو تو میں مسجد رسول اللہ کا مینار پہچان لوں گی'' میں نے تصویری البم اپنے زانو پر کھول کر رکھ لی تھی،

یہ مرحلہ دومنٹ میں طے ہوگیا، دور سے مسجد کے ایک مینار پر وہی نشانی تھی جو PSO کے البم میں دی گئی تھی، چنانچہ ہم جلد ہی مسجد رسول اللہ کے دامن میں پہنچ گئے۔

طلب سچی ہو تو منزل کتنی آسان ہو جاتی ہے۔

وہاں کے مقامی لوگوں نے تصدیق کی کہ یہی مسجد رسول اللہ ہے۔ تبوک میں اسی جگہ رسول اللہ کا خیمہ لگایا گیا تھا۔ پہلے یہاں لکڑی کی مسجد بنائی گئی تھی۔ ۱۲۴۵ء میں ترک فوجی افسر نے اپنے خرچ پر سنگی مسجد بنوائی۔ جو مختلف ادوار میں مرمت اور توسیع سے گذر کر آج ایک خوبصورت مسجد کی شکل میں موجود ہے۔

مسجد سفید رنگ کی، سادہ مگر انتہائی خوبصورت ہے۔ مرکزی دروازہ بڑا شاندار ہے۔ مسجد کے سامنے بڑا سا پارکنگ لاٹ ہے اور ایک طرف مارکیٹ ہے مارکیٹ کے عقب میں قدیم زمانے کا بنا ہوا ترکی قلعہ ہے۔ قلعہ کے مرکزی دروازے پر آٹھ سطری سنگی تختی پر جو تحریر ہے، وہ جگہ جگہ سے مٹی ہوئی ہے، ورنہ قلعہ کب بنا، کس نے بنایا کا معمہ حل ہو سکتا تھا۔ بہرحال آخری سطر پر ۱۰۶۴ کی تاریخ ضرور پڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ تاریخ سنہ تعمیر کو ظاہر کرتی ہے تو گویا ساڑھے چار سو سال پرانا قلعہ تھا۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ قلعہ جیل کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔

قلعہ کو چاروں طرف سے دیکھنے کے شوق میں جب ہم قلعہ کے عقب میں پہنچے تو ایک حیرت انگیز منظر نظروں کے سامنے تھا۔ کھجوروں کے جھنڈ کو اپنے دامن میں لئے ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس احاطہ کی دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو ایک پٹے ہوئے کنوئیں یا چشمہ کے آثار نظر آئے۔

PSO کی البم میں چشمہ کی جو تصویر دی گئی ہے (دیکھیئے ص ۱۲۹) اس کے عقب میں بھی ترکی قلعہ نظر آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامہ ارض القرآن کے مطالعہ سے بھی یہی بات پتہ چلتی تھی کہ وہ تاریخی چشمہ، مسجد رسول اللہ کے قریب ہی تھا اس چشمہ کے متعلق حدیث کی کتابوں میں یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ ابھی تبوک کے راستے میں تھے کہ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا ''کل تم تبوک کے چشمہ پر
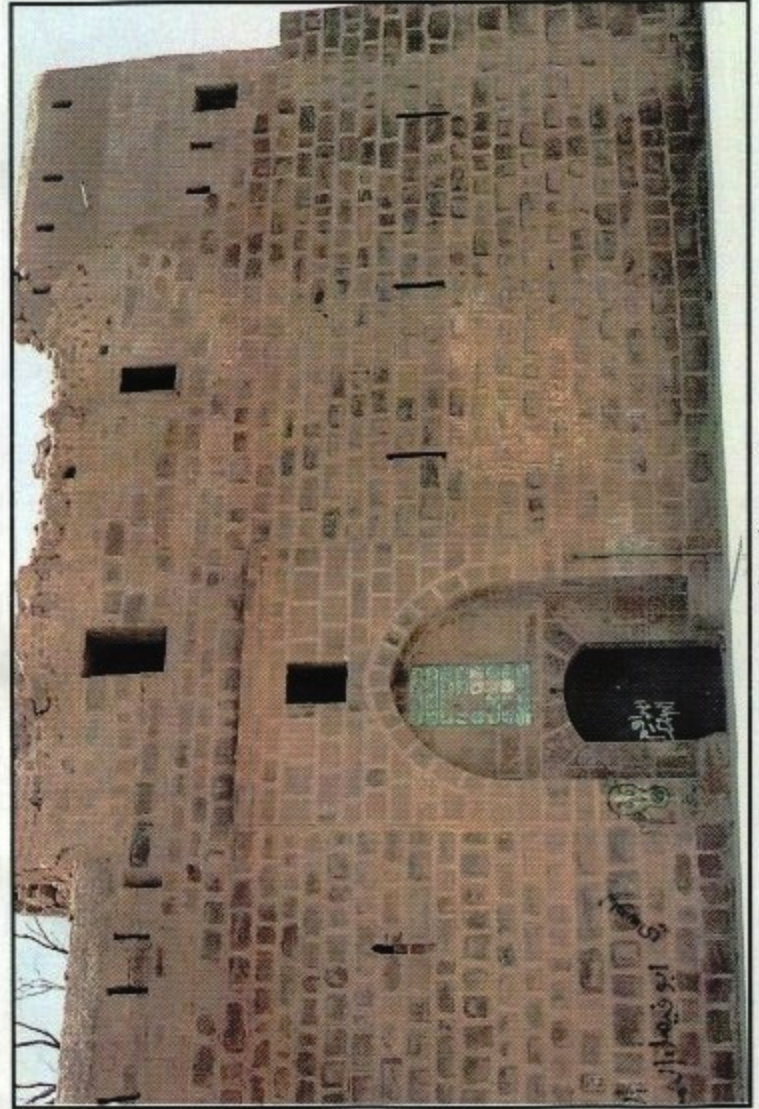
تبوک میں ترکی قلعہ کی باقیات

پہنچو گے، تمہارے وہاں پہنچتے پہنچتے چاشت کا وقت ہو جائے گا۔ تم میں سے جو شخص وہاں پہلے پہنچ جائے تو وہ اس چشمہ کا پانی استعمال نہ کرے"

جب لشکر اسلامی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی پہلے سے وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ اور چشمہ سے قطرہ قطرہ کر کے پانی نکل رہا ہے۔ حضور نے ان دونوں آدمیوں سے دریافت فرمایا کہ تم نے اس چشمہ کا پانی استعمال کیا ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے خفگی کا اظہار کیا۔ پھر صحابہ کرام نے چلوؤں سے ایک برتن میں اس چشمہ کا پانی جمع کیا رسول اللہ نے اس سے اپنا چہرہ مبارک اور ہاتھ دھوئے اور اسے چشمہ میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی چشمہ سے پانی ابلنا شروع ہو گیا۔ اور تقریباً پونے چودہ سو سال تک ابلتا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں نشیبی علاقوں میں جب ٹیوب ویل کھودے گئے تو اس چشمہ کا پانی کھودے جانے والے ۲۵ ٹیوب ویلز میں تقسیم ہو گیا۔ چشمہ اب خشک ہو گیا ہے۔ مگر اب وہ پانی ٹیوب ویلز کے ذریعہ گرد اگرد کو سیراب کر رہا ہے۔

اس موقع پر رسول اللہ نے حضرت معاذ سے فرمایا تھا۔

"اے معاذ اگر تمہاری زندگی رہی تو تم اس علاقہ کو باغوں سے بھرا ہوا پاؤ گے۔"

رسول اللہ کی بات کی سچائی کی گواہی دینے کو ہم بھی وہاں موجود تھے۔ تبوک کا علاقہ وسیع وعریض سبزہ زاروں اور باغات سے بھرا ہوا ہے۔

ہم وہ مقامات دیکھ چکے تھے۔ جن کے لئے اتنا دور دراز کا سفر کیا تھا لہٰذا ہوٹل واپس آنے اور واپسی کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ تبوک سے ۱۴۵ میل مغرب میں خلیج عقبہ کے ساحل سے ملا ہوا ایک اور تاریخی مقام مدین (مغایئر شعیب) ہے۔ یہاں حضرت شعیب کی قوم آباد تھی۔ اگرچہ حضرت شعیب کی بعثت اس علاقے کے علاوہ تبوک کے علاقے کے لئے بھی تھی اور بہت سے مفسرین نے تبوک ہی کو "ایکہ" کا علاقہ قرار دیا ہے۔ جس کے رہنے والوں کو قرآن حکیم میں "اصحاب الایکہ" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

مغایئر شعیب (یا مدین) ایک سرسبز و شاداب وسیع وادی ہے۔ اور اس کے پہاڑوں میں بھی مدائن صالح جیسے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہاں دو قدیم کنویں ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ جن کے متعلق وہاں کے عام لوگوں کا خیال ہے کہ شائد ان ہی میں سے ایک کنواں وہ ہو جس پر حضرت موسیٰ

ایک قبطی کو قتل کرنے کے بعد مصر سے پہنچے تھے۔

ہمارے پاس وقت نہیں تھا کہ مزید آگے سفر کرتے۔ لہٰذا سہ پہر میں ہوٹل کو خیر باد کہہ کر ہم ریاض کے لئے روانہ ہو گئے۔ تبوک سے ریاض ۱۵۲۷ کلو میٹر تھا۔ واپسی کے لئے ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ تبوک سے تیما تک تو وہی سابقہ راستہ تھا البتہ واپسی کے سفر میں یہ راستہ ہم دن کی روشنی میں طے کر رہے تھے لہٰذا دونوں طرف نئے مناظر تھے۔ تبوک سے تیما کے درمیانی راستہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دائیں بائیں وسیع وعریض چراہ گاہیں نظر آ رہی تھیں جن کو باڑ لگا کر محفوظ کیا گیا تھا تا کہ جانور ان سے باہر نہ نکل جائیں۔ صحراؤں کے درمیان جگہ جگہ نخلستانوں کا سلسلہ بھی تیماء تک چلا گیا تھا، ان صحراؤں اور نخلستانوں میں تین رنگوں کے اونٹ یعنی سفید کتھئی اور کالے اونٹ نظر آ رہے تھے۔

تیماء پہنچنے کے بعد اگلا اہم شہر جہازہ تھا یہاں کے دوراہے سے ہم حائل کی طرف مڑ گئے۔ کچھ دور تک تو حالات بہتر رہے یعنی کبھی اکا دکا گاڑیاں، ٹرک یا کنٹینرز قریب سے گذر جاتے مگر اس کے بعد تنہائی سی تنہائی تھی۔ ہم میلوں چلتے رہے، ہمارے دونوں اطراف میں صحرا کی سرخ، پیلی مٹی یا ریت پھیلی ہوئی تھی، زیادہ سے زیادہ چٹانوں کے سلسلے شروع ہو جاتے، اللہ اللہ خیر صلا

میں نے نقشہ دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم صحرائے نفود الکبیر کے جنوب سے گذر رہے ہیں، مارے خوف کے خون رگوں میں جمنے لگا صحرائے نفود، قدیم ترین اور بہت بڑا صحرا ہے جو اردن کو عراق سے جدا کرتا ہے اور سعودی عرب کی شمالی سرحد بناتا ہے۔ اس صحرا میں صحراؤں کی ساری خصوصیات تھیں۔ تاحد نظر تک پھیلی ہوئی ریت ہی ریت، تنہائی ہی تنہائی، گاڑیوں کے شیشے اتارنے پر ہوا کا مخصوص شور، وحشت، ویرانی خوف و پریشانی، اس خطرناک ترین صحرا نے قدیم زمانوں میں قافلے کے قافلے نگل لئے تھے۔ اب صحرا میں گذرتی ہوئی شاندار سڑک نے معاملہ کافی بہتر کر دیا تھا۔ اس کے باوجود کئی گھنٹوں کے اس مسلسل سفر میں ہم کہیں نہیں رکے۔ رکنے کی جاء ہی نہیں تھی اب حائل جا کر ہی رات گذارنے کا ارادہ تھا۔ کئی گھنٹوں اس سفر میں دو دفعہ ایسا ہوا کہ ہمیں صحرا میں چلتے کسی انسان کی شکل نظر آئی۔ ایک بار ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا، ایک لکڑی ہاتھ میں جھلاتا، قدرے بے پروائی سے دائیں جانب کی چٹانوں پر چلتا نظر آیا۔ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں جا رہا تھا؟ یہ دونوں معمے تھے کیونکہ میں نے قریب ہی کسی بستی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں سوائے تاحد نظر پھیلے صحرا کے کچھ نظر نہ آیا۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی

کہتے ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ایک مقام پرہمیں ایک ادھیڑ عمر کا عرب نظر آیا، ہم نے پھر جلدی جلدی دائیں بائیں نظریں دوڑائیں، شائد قریب کوئی بستی ہوگی، حسب سابق مایوسی ہوئی، خدا جانے کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں جارہا تھا؟؟؟ صحرائے نفود کی ریت کبھی کبھی بالکل سرخ ہو جاتی تھی۔ایک دفعہ ثناء کی ضد پر ہم نے گاڑی روکی، تو اس نے صحرا کی سرخ ریت کو ایک بوتل میں بھر لیا شائد اب تک یہ سرخ ریت اس نے سنبھال کر رکھی ہو۔

حائل آنے سے پہلے حالات قدرے بہتر ہوئے، سڑک پر ٹریفک ملنے لگی، دائیں بائیں، عمارتوں کے سلسلے شروع ہوئے، صحراے شہر میں آنے پر ہزار ہزار شکر کیا، میں نے بچوں کو صحرا کی ہولناکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا وہ راستوں کے خطرات سے بے پرواہ اپنی اپنی پسند کے گانے سنتے اور کھاتے پیتے، تفریح کرتے رہے تھے۔حائل کے مضافات میں ساسکو کے بنے ہوئے ایک ریسٹ ہاؤس میں ہم رات گذارنے کے لئے رک گئے۔کھانا ہم نے ریسٹورینٹ میں کھایا، وہی چکن تکہ، پیپسی چپس وغیرہ، رات کچھ سوتے، کچھ جاگتے گذری، صبح کے ناشتہ کے بعد جلد ہی ہم ریاض کے لئے نکل گئے۔

پھر وہی ہم، وہی مراحل شوق، کبھی شہری آبادی، کبھی نخلستان، کبھی صحرائی سلسلہ اور کبھی سنگلاخ پہاڑی سلسلے۔اسی دوران ایک حمد ہوئی۔

سنیئے:

حمد باری تعالیٰ

منھ ہے چھوٹا بات بہت بڑی، مرا خامہ ایسا جواں کہاں؟
تری حمد کیسے بیان ہو، مرے پاس ایسی زباں کہاں؟

مرے ساتھ ساتھ جو رہتا ہے، مرا مہرباں، مرا پاسباں
کیا حقہ، جو بیان کرے، مرے پاس ایسی زبان کہاں

تو ہے ہر جگہ، میں کہیں نہیں، تو نہیں ہے پھر بھی ہے ہر جگہ
تری شان کیسے بیان ہو، مرے پاس ایسی زبان کہاں

مری لغزشوں کو چھپالیا، مجھے اپنے در پہ بلالیا
یہ کرم کی تیرے ہے انتہا، مرے پاس ایسی زباں کہاں؟

تری حکمتوں ترے فیصلوں، تری عظمتوں کو میں جان لوں
میں کہاں سے لاؤں وہ ذہن و دل، میرے پاس ایسی زباں کہاں؟

ہے طلب سے بڑھ کر تیری عطا، ہے گماں سے بڑھ کر تیری وفا
میں کمالِ عشق رقم کروں، مرے پاس ایسی زبان کہاں

مجھے پھر عطا ہو مسافرت، وہی زخم دل، وہی جانکنی
جو مرا جنون بیاں کرے، مرے پاس ایسی زباں کہاں؟

۸ جولائی ۲۰۰۰ء

(عمرے سے واپسی پر)

	الدمام	الرياض	الطائف	مدينہ منورہ	بريده	تبوك	جده	حائل	طريف	ميزان	نجران	مکہ مکرمہ	ابہا
الدمام		۳۹۵	۱۱۲۷	۱۲۳۳	۷۲۵	۱۷۲۹	۱۳۳۳	۱۰۳۵	۱۳۰۲	۱۲۶۷	۱۳۳۵	۱۲۶۵	۱۳۵۹
الرياض	۳۹۵		۷۸۲	۸۳۸	۳۳۰	۱۵۳۷	۹۳۹	۶۳۰	۱۳۳۳	۱۲۷۲	۹۵۰	۸۷۰	۱۰۶۳
الطائف	۱۱۲۷	۷۸۲		۳۳۶	۹۳۶	۱۲۰۳	۱۶۷	۹۵۷	۱۶۷۰	۷۶۲	۸۶۳	۸۸	۵۶۱
مدينہ منورہ	۱۲۳۳	۸۳۸	۳۳۶		۵۱۸	۶۷۹	۳۳۳	۳۳۲	۱۲۲۳	۱۰۳۳	۱۲۷۰	۳۵۸	۹۸۵
بريده	۷۲۵	۳۳۰	۹۳۶	۵۱۸		۱۱۹۷	۸۶۳	۳۱۰	۱۷۳۲	۱۵۶۱	۱۲۸۰	۸۷۶	۱۳۸۸
تبوك	۱۷۲۹	۱۵۳۷	۱۲۰۳	۶۷۹	۱۱۹۷		۱۰۲۳	۱۱۱۱	۸۱۵	۱۷۲۳	۱۹۲۹	۱۰۳۷	۱۶۳۹
جده	۱۳۳۳	۹۳۹	۱۶۷	۳۳۳	۸۶۳	۱۰۲۳		۷۷۷	۱۵۶۹	۷۱۰	۹۰۵	۷۹	۶۲۵
حائل	۱۰۳۵	۶۳۰	۹۵۷	۳۳۲	۳۱۰	۱۱۱۱	۷۷۷		۱۲۵۶	۱۳۷۵	۱۵۹۰	۷۹۰	۱۳۰۲
طريف	۱۳۰۲	۱۳۳۳	۱۶۷۰	۱۲۲۳	۱۷۳۲	۸۱۵	۱۵۶۹	۱۲۵۶		۲۲۶۷	۲۳۹۳	۱۵۸۳	۲۲۰۹
ميزان	۱۲۶۷	۱۲۷۲	۷۶۲	۱۰۳۳	۱۵۶۱	۱۷۲۳	۷۱۰	۱۳۷۵	۲۲۶۷		۳۸۲	۶۸۵	۲۰۲
نجران	۱۳۳۵	۹۵۰	۸۶۳	۱۲۷۰	۱۲۸۰	۱۹۲۹	۹۰۵	۱۵۹۰	۲۳۹۳	۳۸۲		۹۱۲	۲۸۰
مکہ مکرمہ	۱۲۶۵	۸۷۰	۸۸	۳۵۸	۸۷۶	۱۰۳۷	۷۹	۷۹۰	۱۵۸۳	۶۸۵	۹۱۲		۶۲۷
ابہا	۱۳۵۹	۱۰۶۳	۵۶۱	۹۷۵	۱۳۸۸	۱۶۳۹	۶۲۵	۱۳۰۲	۲۲۰۹	۲۰۲	۲۸۰	۶۲۷	

چند منتخب تصاویر

میں دشت امکان کا دوسرا ایڈیشن ترتیب دے رہی تھی
جب مجھے عبدالوہاب خان سلیم صاحب کی طرف سے چند اہم
اور منتخب تصاویر موصول ہوئیں۔

یہ ان اہم تاریخی مقامات کی تصاویر ہیں جن تک ہم یا
تو پہنچ نہیں سکے اور یا اگر پہنچے تو تصاویر نہ لے سکے۔ یہ تصاویر
عبدالوہاب صاحب کے خصوصی شکریہ کے ساتھ یہاں طبع کی
جارہی ہیں۔
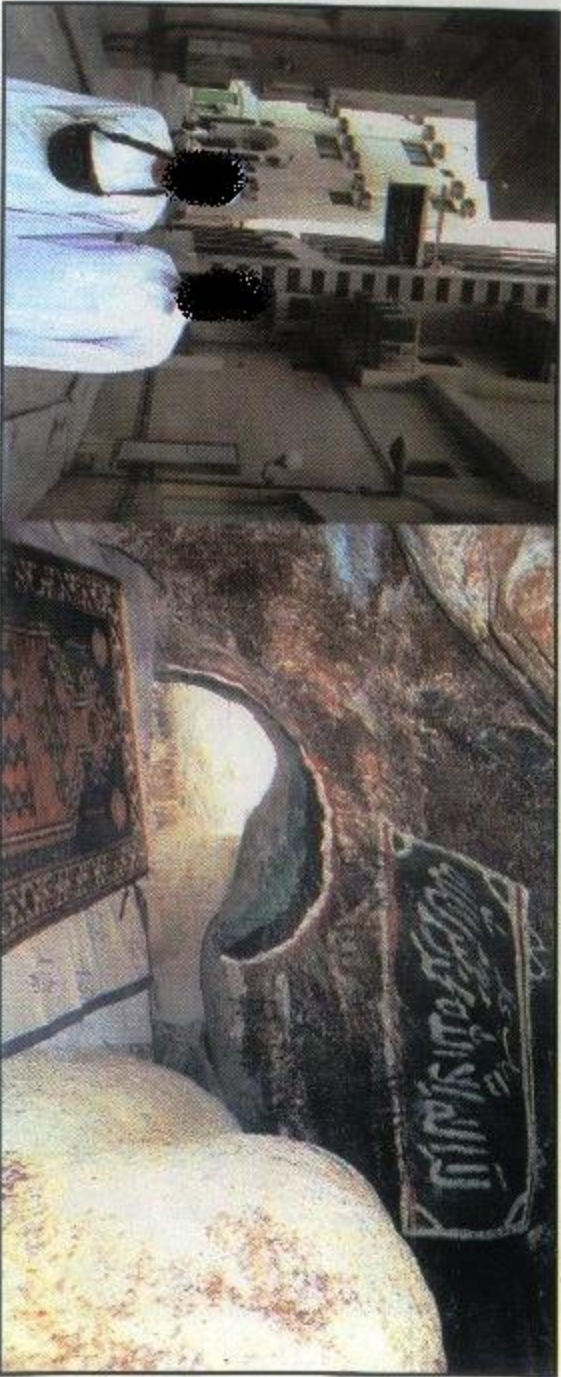
مدرسہ صولتیہ کا بیرونی منظر

غار ثور کے اندر کا منظر
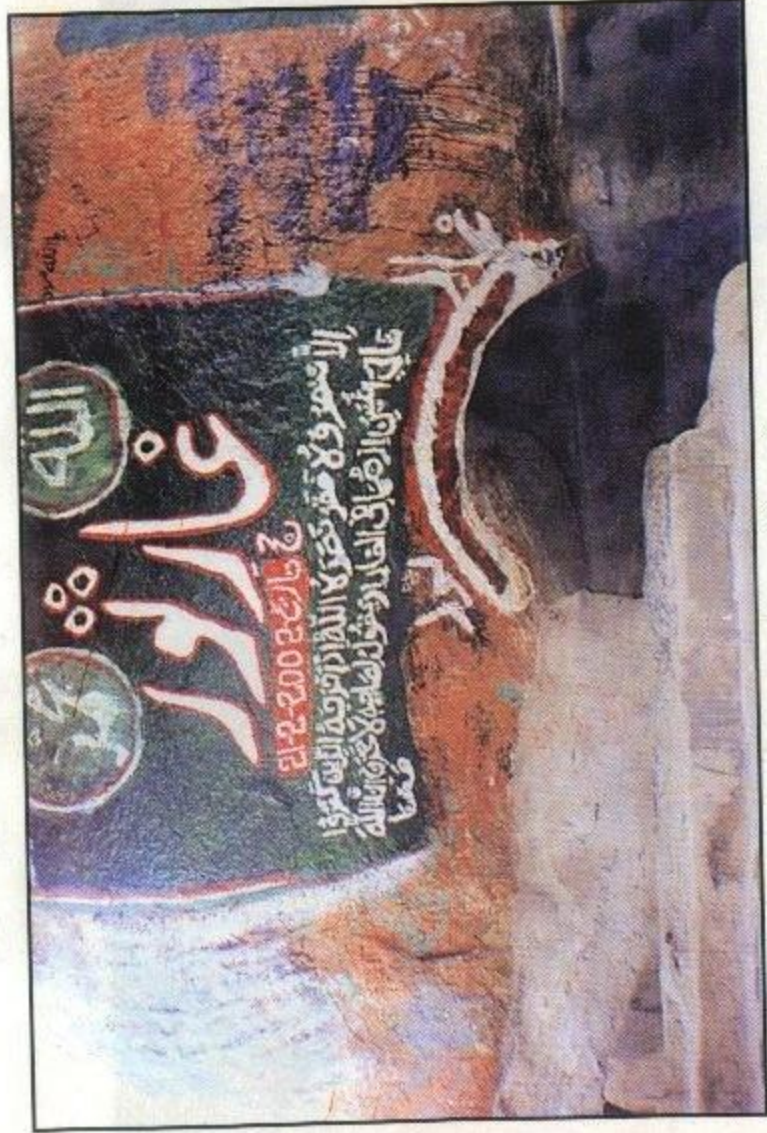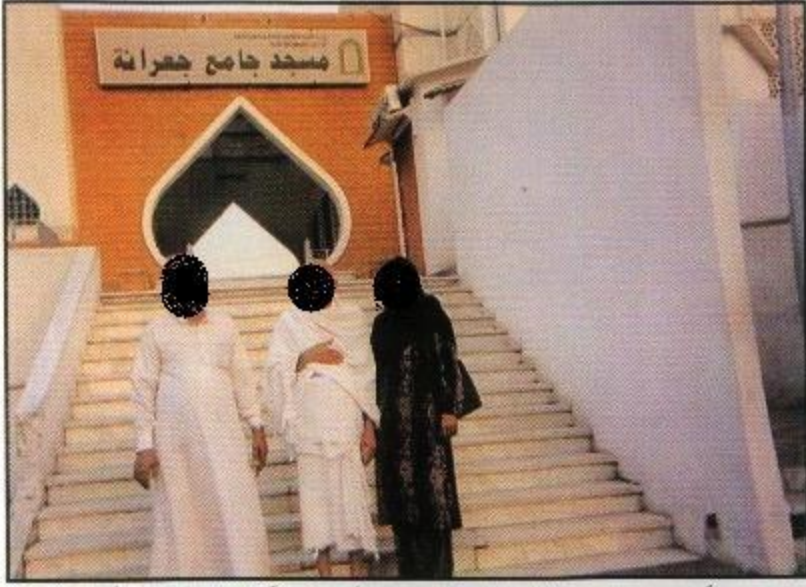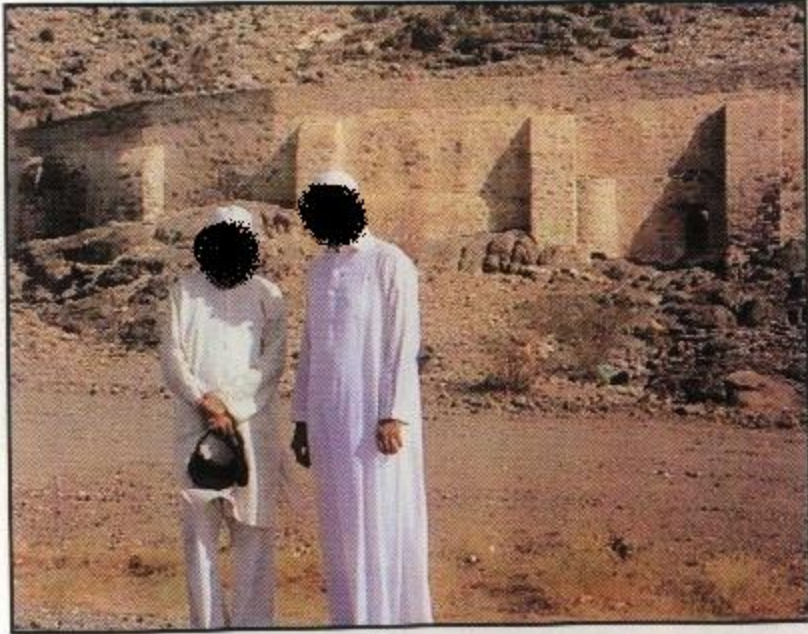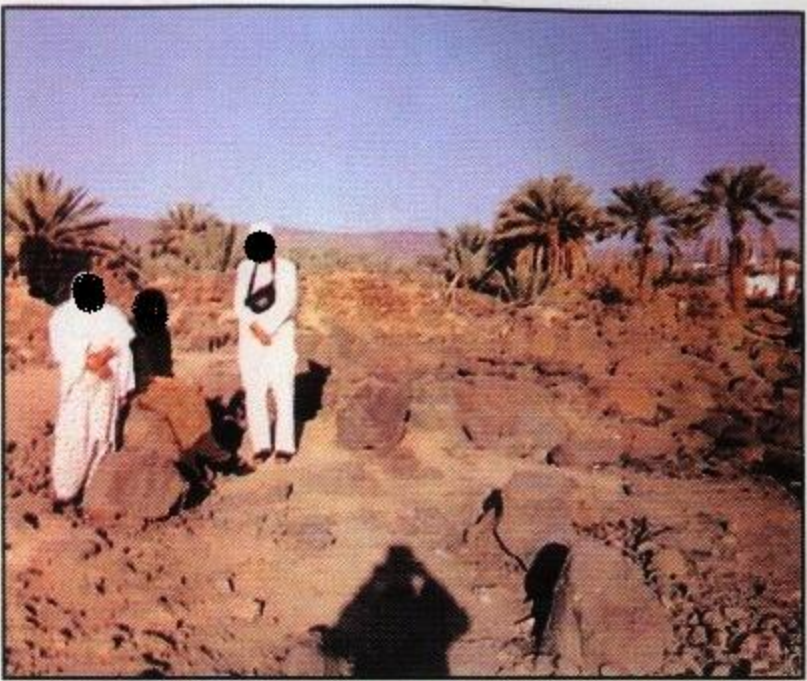
کعب بن اشرف یہودی کے قلعہ کے کھنڈرات پر عبدالوہاب خان سلیم، ڈاکٹر ثروت سلیم، خورشید سلیم
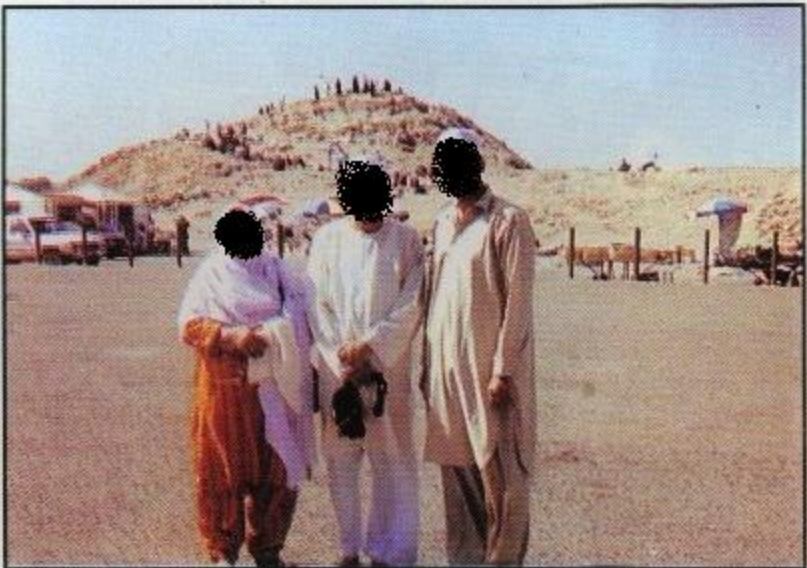
میدان احد میں تیر اندازوں والی پہاڑی
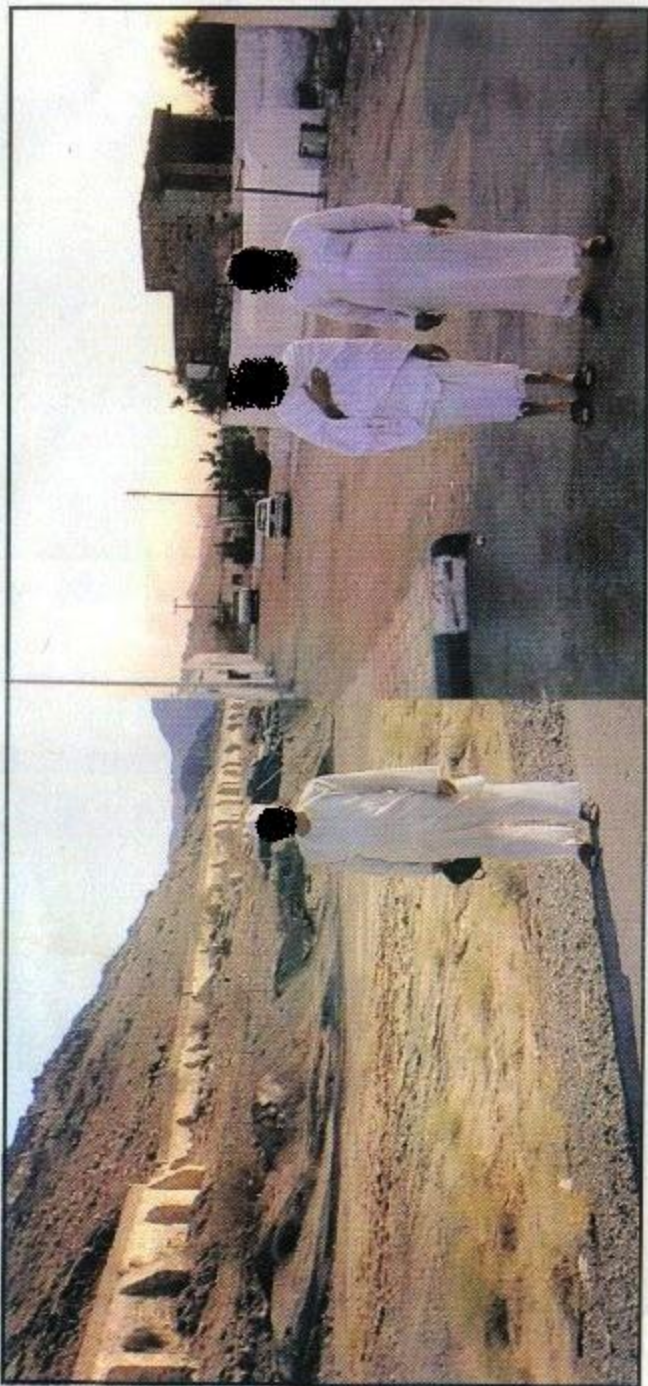
پشت پر وہ کنواں ہے جس کا پانی کھارا تھا، جناب ؐ نے اپنا لعاب دہن ڈالا پانی میٹھا ہو گیا۔
(جناب غنی اکرم سبزواری اور عبدالوہاب خان سلیم)

میدان عرفات میں نہر زبیدہ کے آثار
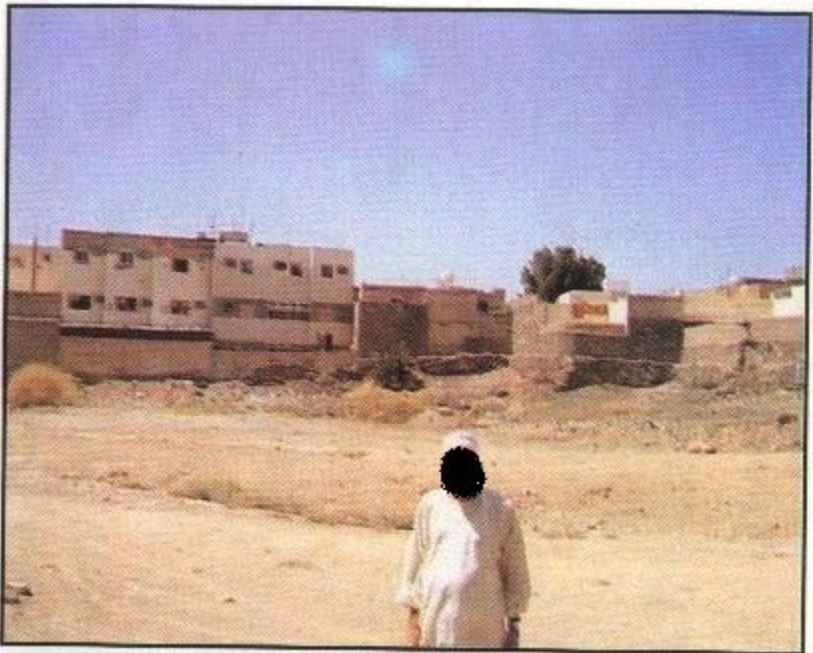
مسجد قبا کے پاس وہ جگہ جہاں مسجد ضرار بنائی تھی، کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں
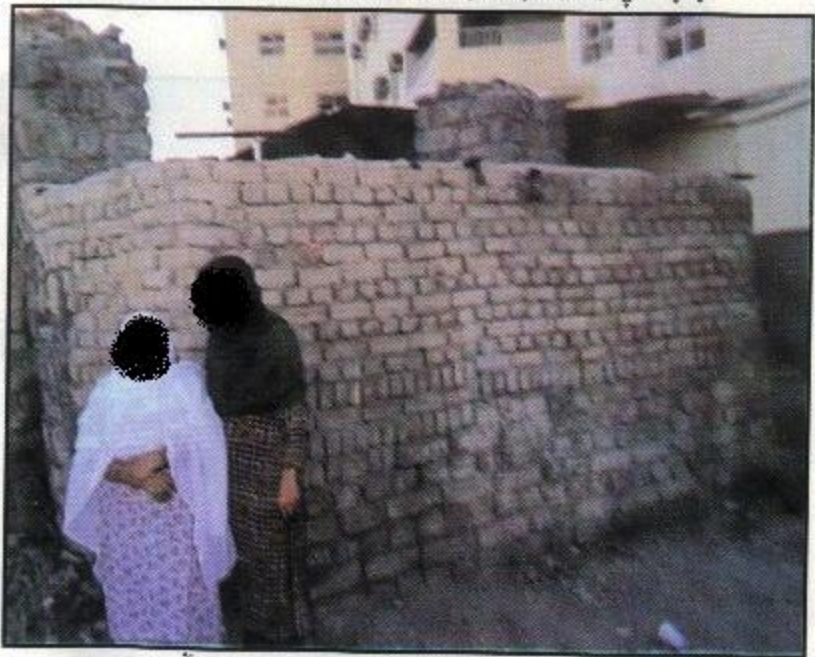
مدینہ کا وہ خاص کنواں، جس کے پانی سے رسول کریم ﷺ کے جسد مبارک کو غسل دیا گیا تھا
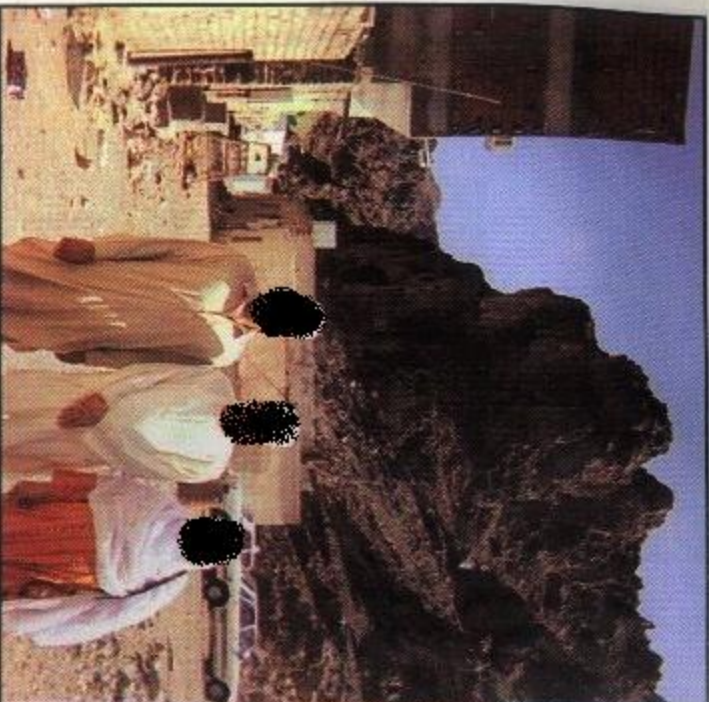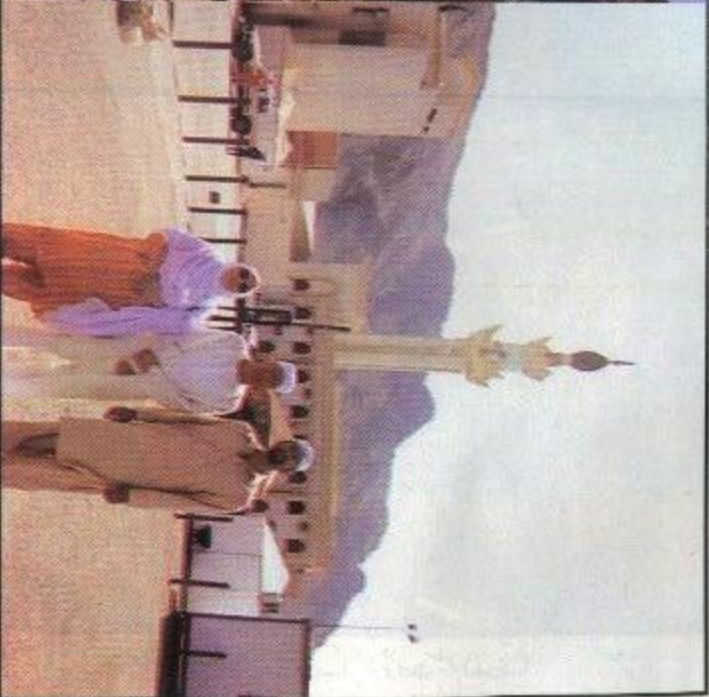
میدان احد میں واقع ایک تاریخی مسجد (مدینہ)

جنگ احد میں زخمی ہونے کے بعد رسول کریم ﷺ نے اس غار میں آرام فرمایا تھا۔ شکیل کی ٹوپی کے بالکل پیچھے یہ غار دیکھا جا سکتا ہے۔

باغ سلمان فارسی کے نزدیک حکومت کا ایک سائن بورڈ (مدینہ)
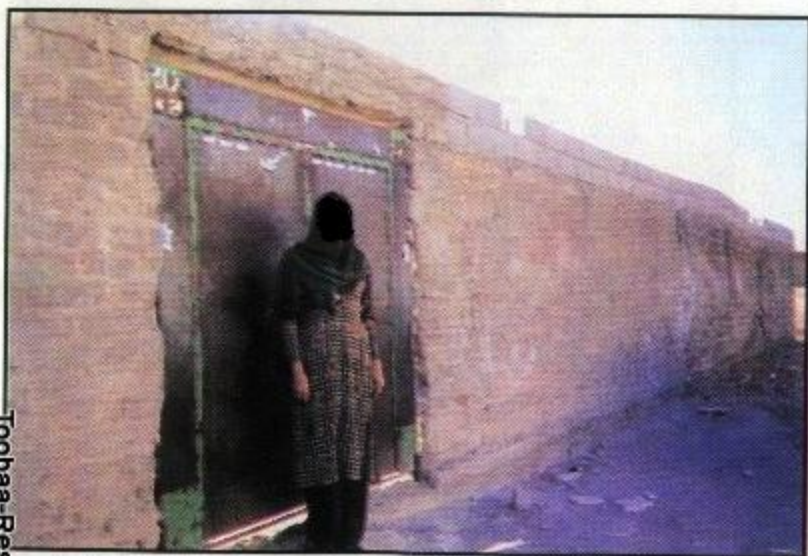
مقام مشربہ ام ابراہیم کے قریب ڈاکٹر ثروت سلیم (مدینہ)
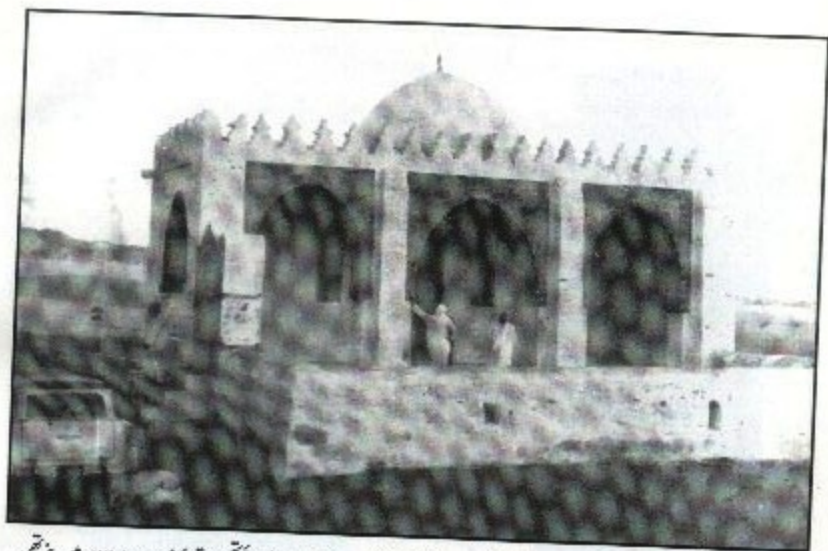
حدیبیہ (موجودہ شمیسی) میں وہ مقام جہاں ببول کے درخت کے نیچے "بیعت الرضوان" ہوئی تھی۔ قدیم مسجد جو ۱۳۵۵ء میں بنی تھی

موجودہ مسجد جو صلح حدیبیہ کی یادگار ہے ۱۹۹۲ء۔

ڈاکٹر نگار کے قلم سے:

۱۔	بارِ ہستی	(افسانے)	۱۸۰/
۲۔	دست قاتل	(افسانے)	۱۰۰/
۳۔	سوادِ شام سے پہلے	(شعری مجموعہ)	۱۰۰/
۴۔	مطالعہ تہذیب	(تاریخ)	۱۲۵/
۵۔	جدید ترکی	(تاریخ)	۲۵۰/
۶۔	مختار ثقفی	(تاریخ)	زیرِ طبع
۷۔	عرب اور موالی	(تاریخ)	زیرِ طبع

قرطاس

پوسٹ بکس 8453 کراچی یونیورسٹی کراچی

قرطاس